کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت

مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

فیاض نقی

رول نمبر:AD716958

رجسٹریشن نمبر:09KPH01126

راولاکوٹ، آزاد کشمیر

نگران مقالہ:

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر

اسسٹنٹ پروفیسر

گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج

راولاکوٹ آزاد کشمیر

شعبہ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۲ء

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت

رول نمبر:AD716958

یہ مقالہ رجسٹریشن نمبر 09KPH01126 کے تحت شعبہ اُردو فیکلٹی آف سوشل سائینسز و ادبیات علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں
ایم فل کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے جمع کرایا گیا

جون ۲۰۱۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے طالبات
راولاکوٹ آزاد کشمیر
فون نمبر:03015187686

''کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت'' کے موضوع پر ایم فل کے لیے فیاض نقی صاحب نے میری نگرانی میں کام کیا ہے۔موضوع کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنا کام مکمل کرلیا ہے۔میری طرف سے اس مقالہ کو شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں پیش کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے طالبات
راولاکوٹ آزاد کشمیر

انتساب

والد محترم سردار محمد نقی خان مرحوم

اور

برادر حافظ خالد نقی شہید کے نام

دیباچہ

دنیا کی ہر زبان میں آپ بیتی اہم صنف ادب کے طور پر موجود ہے۔ آسمان کے نیچے اور فرشِ خاکی کے اوپر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ زندگی محض آتی جاتی سانسوں کا نام نہیں، بلکہ یہ انسانی اعمال و افعال، اخلاق و کردار، عادات و اطوار، نشست و برخاست سے لے کر جسم و روح اور قلب و ذہن کی ساری کثافتوں اور لطافتوں کی داستان ہے۔ انسان اس کائنات میں ایک ہی بار آتا ہے اور اپنے حصے کا کام کر کے چلا جاتا ہے۔ اس ہجوم آبادی میں اپنی الگ شناخت ہر انسان کا خواب ہے۔ انسان جیسا بھی اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی بے نام نہ رہے۔ حیاتِ جاوداں کے حصول کی فطری خواہش انسان کو آپ بیتی لکھنے پر اُکساتی ہے۔ آپ بیتی لکھنا ہر ایک کا مقدر بھی نہیں ہے۔ اس میدان میں وہی شخص طبع آزمائی کر سکتا ہے، جس نے کارزارِ دہر میں کوئی نمایاں کام سرانجام دیا ہوگا۔ مقصد کی بلندی، کام کی نوعیت، محنت و ریاضت اور اسلوبِ فن کی یکجائی ہی کے نتیجے میں کسی فرد کی آپ بیتی صنفِ ادب میں اپنا اعتبار قائم رکھ سکتی ہے۔ فنی محاسن سے آراستہ آپ بیتی کسی ایک فرد کی داستانِ حیات ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک عہد کی تاریخ و تہذیب کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔

آپ بیتیوں کے جہاں میں داخل ہونے سے قبل علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد کی دہلیز پہ ۲۰۰۹ء کے موسم بہار میں پہلا قدم رکھا۔ نیشنل ٹسٹنگ سروس (N.T.S) اور شعبہ اُردو کے ٹسٹ پاس کرنے کے بعد جون ۲۰۰۹ء کو ایم فل اُردو میں داخلہ ہوا۔ سال بھر کے دورانیے پر محیط پہلے دو سمسٹر میں مشقوں کے پُر مشقت مراحل اور ورکشاپوں کی کٹھن منزلوں سے گزر کر موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آن پہنچا۔

جب ڈاکٹر ظفر حسین ظفر صاحب نے کشمیری مشاہیر کی آپ بیتیوں کے مطالعے کا موضوع تجویز کیا تو اس میں بظاہر کافی مشکلات نظر آئیں۔ ریاست جموں و کشمیر کی مخصوص سیاسی و جغرافیائی صورت حال سدِ راہ تھی۔ کشمیری مشاہیر کی آپ بیتیوں کا بیش قیمت خزانہ سرحد کے اُس پار ہے، جن میں سے سیاسی شخصیات کی چند آپ بیتیاں منظر عام پہ تھیں۔ مطالعے و تحقیق کے دوران معلوم ہوا، کہ آپ بیتیوں کا وسیع ذخیرہ قعرِ گم نامی میں ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ، بدلتا ہوا جغرافیہ، تہذیب و تمدّن کے کتنے ہی ابواب کا عکس ان آپ بیتیوں سے جلوہ گر ہوا ہے۔ اس اہم موضوع پر تحقیق و تنقید کیا، ابتدائی درجے کا کام بھی اب تک نہ ہو سکا تھا۔

اُردو آپ بیتی نگار کشمیری مشاہیر میں بنیادی طور پر دو قسم کی شخصیات شامل تھیں۔ اوّل ایسی شخصیات جو اصلاً کشمیری تھے مگر مختلف زمانوں میں ہجرت کر کے پاکستان و ہندوستان میں آباد ہو گئے، پھر وہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا نام پیدا کیا۔ ایسی شخصیات میں پنڈت نہرو، شورش کاشمیری، قدرت اللہ شہاب اور رشید امجد تک متعدد اصحاب تھے، جنھوں نے آپ بیتیاں لکھیں۔ دوسری اُن شخصیات کی آپ بیتیاں ہیں، جن کا میدان کار کشمیر ہی کے مختلف حصے تھے۔ ہر دو قسم کی آپ بیتیوں کا مطالعہ علمی، ادبی و تحقیقی حوالے سے اہم تھا۔ اس موضوع پر ایک ایسے مربوط کام کی ضرورت تھی، جو کشمیر کے دونوں حصوں اور بیرون ریاست پھیلے

ہوئے اس سرمائے کا مطالعہ اور جائزہ پیش کرتا ہو۔ یوں ''کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت'' کے نام سے موضوع کا انتخاب ہوا۔ جسے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے بورڈ آف ایڈوانس سٹڈی اینڈ ریسرچ (BASAR) نے مئی ۲۰۱۱ء کو منظور کیا۔

اس موضوع پر جب کام کا آغاز ہوا تو مشکل یہ درپیش تھی کہ منقسم ریاست کے ایک حصے (مقبوضہ کشمیر) میں ہونے والے کام اور کتب تک رسائی آسان نہ تھی۔ پھر اپنے پھیلاؤ کے اعتبار سے موضوع سے متعلق لوازمہ ریاست سے باہر بھی دور دور تک پھیلا ہوا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کچھ احباب کی شفقت و محبت سے یہ مشکلات دور ہوئیں۔ ان احباب میں محترم نذر بونیاری کا تذکرہ کرنا ضروری ہے، جو اس دوران آزاد کشمیر تشریف لائے تو میرے موضوع سے متعلق کتب اور آپ بیتیاں ہمراہ لائے۔ اُن کے ساتھ متعدد نشستیں ہوئیں اور یوں اُس پار کے حوالے سے موضوع سے متعلق آسانیاں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ محترم کے ڈی مینی صاحب اور پروفیسر نثار راہی صاحب سے بھی رابطہ رہا اور موضوع زیرِ بحث پر اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلہ کے بعد آر پار تجارت کا سلسلہ شروع ہوا تو ابتدائی رابطے کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ اگرچہ یہ رابطہ بھی ادھورا ہی ہے، جس میں علمی، ادبی اور تحقیقی حوالے سے ہنوز بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ کتب اور رسائل و جرائد کی آزادانہ منتقلی ممکن نہیں ہے۔ صرف منقسم خاندانوں کی آمد و رفت کی اجازت ہوئی ہے، ان خاندانوں میں اگر کوئی علمی و ادبی شخصیت ہو تو اُس کی آمد ہو سکتی ہے۔ آلو، پیاز اور ناریل کی تجارت تو خوب ہے، کتب، رسائل اور اخبارات کی منتقلی ممنوع ہے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح کنٹرول لائن کے اُس پار کی بہت سی شخصیات سے ملاقاتوں، کتب اور دیگر مآخذ تک رسائی حاصل ہوئی۔ جس کی وجہ سے خاکہ میں درج کتب کے علاوہ بھی بہت سی آپ بیتیوں اور کتب کا مطالعہ اور جائزہ مقالہ میں پیش ہو سکا۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کے پھیلے ہوئے سرمائے کو محدود وقت میں ایک مقالے میں سمیٹنا ایک مشکل کام تھا، مگر کوشش کی گئی ہے کہ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے جتنے رنگ ہیں وہ سبھی پیش ہو سکیں۔ تحقیق میں کوئی بھی بات حتمی اور آخری نہیں ہوتی، مگر معلوم اور دستیاب ذرائع اور مآخذ تک رسائی کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ آپ بیتی کی تصانیف کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کے نقوش کی حامل کتب تک بھی پہنچنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح یہ موضوع، کشمیر میں اُردو ادب کے مطالعے تک پھیل گیا۔ یوں ایک اجمالی جائزہ پورے اُردو ادب کا بھی شامل مقالہ ہو گیا ہے۔

آپ بیتی سوانحی ادب کی اہم شاخ ہے اور سوانح کا تاریخ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک آپ بیتی نگار اپنی زندگی کے حالات و کوائف کے ساتھ گردو پیش کے حالات و واقعات، علم و ادب، تہذیب و ثقافت کے رنگوں کو بھی اپنی افتادِ طبع کے مطابق پیش کرتا ہے۔ کسی آپ بیتی کے مطالعے و جائزے کے لیے اس عہد کی سیاسی، علمی و ادبی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس لیے ہر باب کے آغاز میں کشمیر کے سیاسی اور علمی و ادبی حالات کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سفر کے ساتھ ساتھ معاصر ادبی حالات اور علمی و فکری مزاج کو بھی جانا جا سکے۔

مقالہ میں مطالعے کی پیش کش کا طریق کار یہ رکھا گیا ہے کہ اُردو آپ بیتی کے سرمائے کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے پہلے اس دور کے حالات کا اجمالی مطالعہ پیش کیا، پھر اس عہد کی نمائندہ آپ بیتیوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا۔ آپ بیتی کے فنی وفکری پہلو، قدرومنزلت، مقام ومرتبے کے ساتھ اُردو آپ بیتی کے مجموعی مزاج سے موازنہ کر کے آپ بیتی زیرِ بحث کی اہمیت اور مقام کا تعین کیا گیا ہے۔ یوں پون صدی کا یہ سفر اپنے ارتقائی مراحل سے گزر کر تمام ہوتا ہے۔ مقالہ بذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:۔

باب اوّل : اُردو آپ بیتی، روایت وارتقا
فصل اوّل: آپ بیتی اور اُردو آپ بیتی
فصل دوم: کشمیر میں اُردو آپ بیتی۔ ماقبل ۱۹۴۷ء
باب دوم : کشمیر میں اُردو آپ بیتی
فصل اوّل: ابتدائی دور (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۰ء)
فصل دوم: تشکیلی دور (۱۹۷۱ء تا ۱۹۹۰ء)
باب سوم : کشمیر میں اُردو آپ بیتی
فصل اوّل: جدید دور (۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۰ء)
فصل دوم: اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ (۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۰ء)
باب چہارم : دیگر اصناف سخن میں آپ بیتی کے نقوش
باب پنجم : مجموعی جائزہ، محاکمہ، مستقبل

پہلا باب ''اُردو آپ بیتی کی روایت وارتقا'' دوحصوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں آپ بیتی کے بنیادی مباحث، جن میں آپ بیتی کے معنی ومفہوم، آپ بیتی اور سوانح، آپ بیتی اور دیگر اصناف ادب، آپ بیتی اسلوب وفن، آپ بیتی کا سفر اور اُردو آپ بیتی جیسے امور کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری فصل میں کشمیر کا مختصر تاریخی پس منظر، اُردو زبان وادب کا کشمیر میں آغاز وارتقا اور ۱۹۴۷ء سے قبل آپ بیتی کا مطالعہ پیش کیا گیا۔

دوسرے باب میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء تک کے دورانیے کو دو ادوار میں تقسیم کر کے، دونوں فصلوں کے آغاز میں کشمیر کے سیاسی، علمی وادبی حالات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان دونوں فصلوں میں آپ بیتی کی روایت کو ابتدائی اور تشکیلی دور کے نام سے موسوم کر کے ان ادوار کی آپ بیتیوں کا جائزہ اور نمائندہ آپ بیتیوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ کشمیر میں اُردو آپ بیتی ۱۹۴۷ء کے بعد ہی باضابطہ شروع ہوئی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک کے دورانیے میں تصنیف ہونے والی آپ بیتیاں اگرچہ لوازمے کے اعتبار سے اہم اور تاریخی نوعیت کی ہیں، مگر آپ بیتی کے فن کے لحاظ سے ابتدائی نوعیت کی ہیں۔ چناں چہ اسے ابتدائی دور سے تعبیر

کیا گیا۔۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۰ء تک کے دورانیے پر محیط آپ بیتیاں فکروفن کے اعتبار سے مختلف جہتوں میں آپ بیتی کی روایت کو بڑھاتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس دور کی کشمیری آپ بیتی، نئے امکانات کی تشکیل کے باعث اہم ہے۔چناں چہ یہ تشکیلی دور قرار پاتا ہے۔

مقالے کے تیسرے باب میں بھی دو فصلیں رکھی گئی ہیں۔پہلی فصل ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۰ء تک کے عرصے کو محیط ہے۔اس عہد میں علمی وادبی آپ بیتیاں بھی ہیں اور سیاسی اور تحریک آزادی کے حوالے سے لوازمے پر مشتمل مزاحمتی ادب کی حامل آپ بیتیاں بھی۔سیاست دانوں، علمی وادبی شخصیات، اساتذہ، ملازمین اور دیگر شعبوں کے افراد کی آپ بیتیاں بھی۔اس دور میں ذرائع ابلاغ کی وسعت اور ہمہ گیری نے کشمیر کے آپ بیتی نگاروں کی رسائی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آپ بیتیوں تک آسان کر دی تھی۔اس دور کی آپ بیتی اپنی نوعیت اور اقسام میں رنگا رنگی کا منظر پیش کرتی ہے۔چناں چہ یہ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا جدید دور ہے۔دوسری فصل میں اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں منظر عام پر آنے والی آپ بیتیوں کا مطالعہ و جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھا باب دوسری اصناف ادب میں آپ بیتی کے نقوش کی تلاش پر محیط ہے، جس میں شاعری کے علاوہ سفر نامہ، رپورتاژ، خاکہ، مکتوب، تاریخی تصانیف اور فکشن میں آپ بیتی کے عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں کشمیر کے ہر دو اطراف اور بیرون ریاست مقیم مصنفین کی کتب کا مطالعہ پیش کیا گیا۔اس طرح کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سبھی رنگ زیرِ مطالعہ لانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس باب میں اختصار سے کام لیا گیا، مگر کوشش کی گئی ہے کہ اس ضمن میں کوئی اہم پہلو رہ نہ جائے۔

پانچویں باب میں کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سارے سفر کا مجموعی جائزہ پیش کرتے ہوئے یہ خیال رکھا گیا ہے کہ پچھلے ابواب کے مباحث کو دہرایا نہ جائے اور کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے مجموعی مزاج اور افتاد کی اجتماعی صورت حال پیش کی جائے۔آپ بیتی کا ادوار کے حساب سے جائزہ اور محاکمہ پیش کرتے ہوئے اس سارے سفر کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس باب میں کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے مستقبل کے حوالے سے بھی سفارشات پیش کی گئی ہیں تاکہ مستقبل کے آپ بیتی نگاروں اور محققین کو اُردو آپ بیتی کو عہد جدید سے ہم آہنگ کرنے اور ساری صورت حال میں اپنے لیے الگ راستہ بنانے میں مدد مل سکے۔اس سفر میں آپ بیتی کو جن منفی رجحانات اور رویّوں کا سامنا رہا، انھیں سامنے لاتے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ واضح کیا جا سکے کہ اکیسویں صدی میں اُردو آپ بیتی کے مستقبل کو محفوظ اور فروغ پذیر ہونے کے لیے ایسے رجحانات سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، ان صورتوں کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔مقالے میں غیر ضروری حوالوں اور آرا سے اجتناب کی کوشش کی گئی ہے۔البتہ اہم اور ضروری مآخذ تک رسائی اور حوالوں سے گریز نہیں برتا گیا۔

۱۹۴۷ء میں جب برعظیم کی تقسیم عمل میں آئی، خطہ کشمیر کو سیز فائر لائن کے ذریعے مختلف حصوں میں منقسم کر دیا گیا۔اس تقسیم کے اثرات دوسرے شعبوں کی طرح ادب پر بھی منفی صورت میں پڑے۔ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے بعض اہم ادیب اور شاعر ریاست سے ہجرت کر کے پاک و ہند اور دوسرے ملکوں میں آباد ہو گئے۔ریاست کے دو حصوں کے ساتھ

کشمیری ادب کی روایت کا ایک تیسرا دھارا بھی پروان چڑھنے لگا۔ چناں چہ اس صورت حال میں آپ بیتی میں مختلف علاقائی پس منظر کے باعث مختلف رجحانات پیدا ہوئے۔ اگر چہ ان سب رجحانات کی روح ایک ہی تھی، ان سب میں کشمیر موجود تھا مگر زمانی فاصلوں اور رابطوں کے فقدان کے باعث انھیں باہم مربوط کرنے کی صورت نہ تھی۔ اس دوران ان مراکز میں ہونے والے تحقیقی کام عموماً اپنی اپنی اکائیوں کے حوالے سے ہی ہوتے رہے اور تخلیقات بھی اپنے اپنے محرکات اور علاقائی پس منظر کے دائروں میں مقید رہیں۔

اس مقالے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کم از کم آپ بیتی کی روایت کا جائزہ مجموعی صورت میں لیا جائے۔ اس طرح یہ پہلی کاوش ہے، جو کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سبھی دائروں، رنگوں اور مناظر کو باہم مربوط کرتی ہے۔ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا مجموعی مطالعہ ہونے، قومی یک جہتی اور آر پار کے ادب میں یکسانیت پیدا کرنے کے باعث یہ مقالہ مستقبل کے سکالرز، عام طلبہ اور ریاست کے عوام کے لیے رہنمائی کا باعث ہوگا۔ نیز دوریوں کے باعث کشمیری ادب کی مختلف اکائیوں کے درمیان پیدا ہونے والے خلا کو بھی پُر کرے گا۔ یہی اس کی بنیادی غایت ہے۔

آخر میں کچھ محترم ہستیوں کا شکریہ ادا کرنا فرض ہے، جن کی شفقتوں اور محبتوں کے باعث اس مقالے کی تکمیل کا سفر مکمل ہوا۔ محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، جنھوں نے کمال مہربانی سے خاکے کی ترتیب و پیش کش سے لے کر مقالے کی تکمیل تک رہنمائی کی۔ کچھ ابواب پڑھ کر غلطیوں کی نشاندہی کی اور ہدایات سے نوازتے رہے۔ محترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، صدر شعبہ اُردو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، جن کی محبتوں کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے خزانوں سے بھی نہ صرف دوران ورکشاپس مستفید ہوتے رہے بلکہ جب جب ان کے ہاں پہنچے خوش خوش لوٹے۔ میرے نگران محترم ڈاکٹر ظفر حسین ظفر، موضوع کے انتخاب سے اختتام مقالہ تک مدد و رہنمائی، مآخذ تک رسائی، کتب کی دستیابی کی صورت اُن کی شفقت ہمہ وقت میسر رہی۔

میری ماں، جب بھی مجھے اس عمر میں بچوں کی طرح پڑھتے اور لکھتے دیکھتیں تو دعاؤں کے پھول نچھاور کرتیں۔ میری شریک حیات اور بچوں، معصب، انسب، عدن اور حسن کا بھی شکریہ کہ اُن کے حصے کا وقت بھی اس مقالے کو ملا۔ میری پیاری بہن اور بھائیوں کی دعائیں بھی میرے شامل حال تھیں۔ ان سب کی نیک تمنائیں اور دعائیں ہی تھیں کہ دفتری مصروفیات، کالج کے معاملات، ارقم کی اشاعتوں اور گھریلو الجھنوں کے باوجود یہ مقالہ اپنے وقت پر تکمیل پذیر ہوا۔

فیاض نقی
مقالہ نگار
ایم فل اُردو علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد

۲۸ / مئی ۲۰۱۲ء

فہرست ابواب

فہرست مضامین

بابِ اوّل

اُردو آپ بیتی روایت وارتقا

فصل اوّل

آپ بیتی اور اُردو آپ بیتی

حضرت انسان کو، ہر دور میں، میں کون ہوں؟ میں کیوں ہوں؟ اس کارزارِ دھر میں مجھے کیا کرنا ہے؟ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات پریشان کرتے رہے ہیں۔ان کے جوابات کے لیے انسان کبھی فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھا تو کبھی نفسیات کے میدانوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا ہے۔کبھی وہ مذہب کی وادیوں میں، اپنی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں پایا گیا تو کبھی سائنس کے سپاٹ رستوں میں برسرِ پیکار رہا اور کبھی مابعدالطبیعاتی علوم میں غوطہ زن رہا۔ یہ الگ کہانی ہے کہ وہ ان سوالات کے جامع اور قابلِ اطمینان جواب حاصل کر پایا یا نہیں اور اگر کامیابی حاصل کی تو کہاں سے؟ مگر حقیقت تک پہنچنے کا یہ سفر جاری ہے اور ہر عہد میں کئی نئے امکانات اور انکشافات، پرانے جوابات کو دھندلا کر نئے سوال پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

انسان کے اس سفر میں دیگر علوم کے ساتھ ساتھ ادب بھی حیات اور کائنات کی معنویت دریافت کرنے کا ایک وسیلہ رہا ہے۔شاعری ہو یا نثر، ''میں کون؟'' کے جواب میں ادب اپنی اصناف کے ذریعے، جو مختلف کردار پیش کرتا ہے وہ دراصل ''میں یہ ہوں'' کی صورت ایک ٹھوس دلیل اور سچی تصویر پیش کرنے کی سعی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادب، بالخصوص افسانوی ادب میں کردار فرضی ہونے کے باوجود حقیقی لگتے ہیں اور وہی تخلیق معتبر بھی ٹھہرتی ہے، جس کے کردار حقیقت کے قریب تر ہوں۔اگر ادب حیات و کائنات کی معنویت دریافت کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے تو پھر اصنافِ ادب کی ایک معتبر صنف آپ بیتی ہے، جو کسی فرد کی زندگی کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرتی ہے۔کسی زندگی کی نہ صرف ظاہری صورت حال بلکہ دل کی کیفیت کا احوال بھی آپ بیتی ہی پیش کرسکتی ہے۔آپ بیتی کسی فرد کی زندگی کے جملہ پہلوؤں، تلخ و شیریں حقائق، خوش نما اور اکھڑے ہوئے سارے رنگ، دل و دماغ اور جسم و روح کے سارے منظر، سامنے لاتی ہے۔ذات سے بلند ہوکر آپ بیتی اپنے عہد کی تاریخ و تہذیب کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔یہی وہ خوبی ہے، جو آپ بیتی کو ادبِ عالیہ میں شامل کرتی ہے۔عہدِ جدید کے ادب میں کسی فرد کی زندگی کی داستان یعنی سوانحی ادب کی عموماً تین صورتیں رائج ہیں، خاکہ نگاری، سوانح عمری اور آپ بیتی۔

خاکہ کو انگریزی میں Sketch کہتے ہیں، جس کے معنی ڈھانچا، نقشہ یا ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔اصطلاحی معنوں میں خاکہ وہ مختصر تحریر ہوتی ہے، جس میں کسی شخصیت کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے مطابق خاکہ سے مراد:۔

> ''وہ تحریر ہے، جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں روانی اور جولانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔'' (۱)

خاکہ نگاری میں کسی شخص کے ظاہری واقعات اور کارکردگی کے بیان کے ساتھ ساتھ اس کی باطن شناسی بھی کی جاتی

ہے۔اس لیے خاکہ نگاری کے لیے نفسیات بینی اور مردم شناسی کے فن سے آگہی ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض اصحاب نے خاکہ نگاری کو شخصیت کی کھدائی کا کام قرار دیا ہے۔دوسروں کا خاکہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اُردو میں خودنوشت،خاکہ کی روایت بھی مستحکم ہے۔ محققین کے مطابق جہاں سے اُردو خاکے کی ابتدا ہوتی ہے وہیں اُردو خودنوشت خاکے کی ابتدا کا سرا تلاش کیا جاسکتا ہے۔

سوانح عمری میں خاکے کی نسبت ...... کسی فرد کی پوری زندگی، پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔شخصیت نگاری ایک فن ہی نہیں بلکہ ایک سائنس ہے۔ یہ ایک تخلیقی کارنامہ ہے، جس کے ذریعے سوانح نگار نہ صرف اپنے ہیرو کی حیات و خدمات بلکہ اس کی شخصیت کو پروان چڑھانے والے عناصر، دروں بینی اور نفسیات کے ذریعے اس کی شخصیت کے چھپے ہوئے کئی گوشے بھی وا کرتا ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سوانح نگار کے اوصاف بیان کرتے ہیں:۔

> ''کسی انسان کی صحیح مرقع کشی کے لیے سوانح نگار کو بیک وقت محقق، مؤرخ، مبصر، ماہر نفسیات اور ادیب ہونا چاہیے۔ چوں کہ ہر سوانح نگار میں ان اوصاف کا ہونا ضروری نہیں اس لیے دنیا کے ادب میں اعلیٰ درجے کی سوانح عمریاں بہت کم ملتی ہیں۔البتہ عظیم شخصیتوں کی نہایت ادنیٰ سوانح عمریاں بہت زیادہ ہیں۔ (۲)

آکسفورڈ ڈکشنری میں سوانح کو ادب کی شاخ قرار دیا گیا ہے۔(۳) ڈاکٹر جانسن سوانح کو تاریخ کا شعبہ قرار دیتے ہیں(۴) اکثر محققین سوانح کو تاریخ ہی کا حصہ گردانتے ہیں۔ یہ بات ان معنوں میں درست بھی ہے کہ تاریخ دراصل بڑے لوگوں کی سوانح ہی ہوتی ہے۔لیکن فنی وفکری اور علمی و ادبی اعتبار سے یہ دونوں مختلف اسلوب اور اصناف ہیں۔بعض محققین کا خیال ہے کہ ایک اچھی سوانح عمری کی ادبیت، حسن ترتیب اور اسلوب بیان کی خوبصورتی اسے بنیادی ادب میں شامل کرتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے اس باب میں متوازن بات لکھی ہے:۔

> ''سوانح نہ تو تاریخ ہے اور نہ افسانہ بلکہ وہ تاریخ کی بے وقعت سچائی اور افسانے کی غیر حقیقی زندگی، دونوں کے درمیان کی چیز ہے۔'' (۵)

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

> ''سوانح میں ہیرو کی ذہنی کیفیت تک پہنچ کر اسے ٹٹولنا اور اس کی شخصیت کے اتار چڑھاؤ کو گرفت میں لے لینا ایک اچھے سوانح نگار کا بنیادی فرض ہے اور پھر ان الجھنوں کو بڑی خوبصورتی، دیانت اور سب سے زیادہ بے باکی سے بیان کرنا لازمی ہے۔اس کی یہی فنی ترتیب اور تنظیم سوانح کی اساس ہے۔(۶)

سوانحی ادب کا اہم اور دلچسپ پیرایہ آپ بیتی ہے۔کسی دوسرے کی شخصیت اور کارناموں سے متاثر ہو کر سوانح عمری

لکھی جاتی ہے، جب کہ آپ بیتی میں تمام تر معلومات مصنف اپنے بارے میں پیش کرتا ہے۔ آپ بیتی میں مصنف کا زیادہ تر زور اس بات پر ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں۔ مشفق خواجہ کے مطابق ''خودنوشت کا اصل مقصد انکشافِ ذات ہے'' یوں آپ بیتی کے ذریعے آپ بیتی نگار اپنی ذات کا عکس دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

زندگی کی راہگزر میں انسان بے شمار تجربات اور کئی طرح کے واقعات سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ گونا گوں تجربات اور متنوع مشاہدات اس کی زندگی پر دیرپا نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ ان یادگار لمحوں کو امر کر دے، انھیں محفوظ رکھے اور دوسروں کو ان میں شریک کرے۔ یہی بنیادی خواہش انسان کو آپ بیتی کی جانب مائل کرتی ہے۔ انکشافِ ذات، اظہارِ ذات اور بقائے ذات کی خواہش دراصل اس کائنات کی ہر شے میں ازل سے موجود ہے۔ خود خالق کائنات نے قرآن عظیم الشان میں اپنی ذات، صفات اور حسب نسب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّ حِیۡمِ○

''قُلۡ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ○ اَللّٰہُ الصَّمَدُ○ لَمۡ یَلِدۡ○ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ○ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ○''

[کہو، وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے] (۷)

اس کائنات کی برگزیدہ ہستیاں انبیائے کرام ہیں۔ تمام انبیا نے اپنی ذات وصفات اور مقام اور مرتبے سے اپنے عہد کے لوگوں کو حکم خداوندی کے مطابق آگاہ کیا۔ بڑے بڑے حکمرانوں، فلاسفر، انقلابیوں اور مصلحین نے اپنے اپنے انداز میں، علوم وفنون، فتوحات، کارناموں اور کارگزاریوں کے ذریعے اظہارِ ذات کی صورت پیدا کی۔ یوں اظہارِ ذات ہر ذی روح میں جبلی طور پر موجود ہے۔ انکشافِ ذات اور اظہارِ ذات کی یہ جبلی ضرورت آپ بیتی کا بنیادی محرک ہے۔

آپ بیتی۔ بنیادی مباحث

Wiki Pedia انسائیکلوپیڈیا کے مطابق Autobiography کے معنی ہیں:۔

"An autobiography, from the Greek autos, 'self', bios, 'life' and graphein, 'write, is a biography witten by the subject or composed conjuntly with a collaborative writer (slyled "as told to" or with).

The term was first used by the poet Robert Southey in 1809 in the English periodical Quarterly Review, but the form goes back to antiquity." (۸)

Lexicon universalانسائیکلوپیڈیا کے مطابق:۔

"An autobiography, like a biography, is a record of a life, but it is written by the himself or herself. The many different kinds of autobiographical writtings include letters, memories, diaries and journals preserved with the autobiographical intent; formal; retrospective, self-studies; and autobiographical fiction." (۹)

فیروز اللغات میں آپ بیتی کے معنی کچھ اس طرح ہیں: ذاتی تجربہ، اپنے آپ پر گزرے ہوئے واقعات، اپنی کہانی، اپنا حال، خودنوشت، حالاتِ زندگی۔(۱۰)

فرہنگ آصفیہ کا بیان ہے: ''سرگزشت، کسی شخص کی زندگی کا حال، کسی عالم خواہ فاضل، خواہ بڑے بڑے کام کرنے والے یا بہادر یا حاکم کے واقعات، جو اس کی عمر میں گزرے ہوں۔''(۱۱)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''اصناف ادب'' میں ''آپ بیتی'' کی بابت رقمطراز ہیں:۔

''اپنی زندگی کے احوال و واقعات کا بیان ''آپ بیتی'' کہلاتا ہے۔ اسے خود نوشت(Autobiography) بھی کہہ سکتے ہیں۔'' (۱۲)

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی خودنوشت سوانح عمری کی تعریف کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

''خودنوشت سوانح عمری کی سادہ سی تعریف تو بس اتنی ہے کہ وہ سوانح عمری، جو خود لکھی گئی ہو۔ بالکل افسانہ کی سہل ممتنع تعریف کی طرح کہ مختصر افسانہ، وہ افسانہ ہے، جو مختصر ہو۔(۱۳)

مدیر ''نقوش''، محمد طفیل نے ''نقوش'' کے آپ بیتی نمبر میں آپ بیتی کی جامع تعریف بیان کی ہے:۔

''آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے، جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست راست قلمبند کی ہو، جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کی داخلی زندگی کے حجرے میں بھی جھانک سکیں۔'' (۱۴)

مولانا ابوالحسن علی ندوی ''آپ بیتی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''اگر یہ سوال کیا جائے کہ ادب و انشا اور تاریخ و تذکرہ کے اصناف میں سب سے زیادہ دلچسپ، دلآویز، خوشگوار اور شوق انگیز صنف کون سی ہے تو شاید اکثر اہل ذوق کا جواب یہی ہوگا کہ ایک اچھے صاحب قلم اور ادیب کے قلم سے نکلی ہوئی 'آپ بیتی'۔'' (۱۵)

آپ بیتی کی تعریف کے باب میں جس قدر آرا ملتی ہیں ان میں کسی فرد کی زندگی کی داستان، خود بیان کرنا یا لکھنا اور سچائی اور صداقت کے عناصر کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہاں آپ بیتی اور خودنوشت کی اصطلاحات کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں ایک ہی صنف کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ لفظی اعتبار سے آپ بیتی اپنے اوپر بیتے واقعات یا زندگی کی کہانی ہے۔ یہ اظہار تحریری بھی ہو سکتا ہے اور زبانی بھی۔ خودنوشت کے معنی میں اپنے ہاتھوں سے لکھا ہوا شمار ہوتا ہے۔ یہ تحریر بے شک اپنی ذات سے متعلق یا ذات سے جڑے واقعات اور تجربات کے حوالے سے ہوتی ہے۔ وسیع معنوں میں کسی فرد کی لکھی ہوئی کسی طرح کی تحریر خودنوشت کہلا سکتی ہے مگر اصطلاحی معنوں میں ذات کے حوالے سے تحریر ہی خودنوشت میں شمار ہوتی ہے۔ ورنہ ہر افسانہ، کہانی، نظم کسی نہ کسی نے تو لکھی ہی ہوتی ہے، اسے خودنوشت نہیں کہا جا سکتا۔ خودنوشت کے زمرے میں کسی فرد کے اپنی ذات کے لیے لکھا ہوا ایک صفحہ بھی شمار ہوتا ہے اور پوری کتاب بھی۔ انگریز لفظ Autobiography کا پورا مفہوم اُردو میں ''خودنوشت سوانح عمری'' سے ادا ہوگا۔ اُردو میں ''آپ بیتی'' ہی زیادہ جامع اور مختصر اصطلاح ہے۔ یہ خودنوشت سوانح عمری، اپنی ذات کے حوالے سے ہر طرح کی تحریر، تقریر یا بیان کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے اور اپنی سوانح عمری کے حوالے سے مستعمل ہے۔

سوانحی ادب میں آپ بیتی اس لحاظ سے ممتاز مقام رکھتی ہے کہ ایک شخص کی ذاتی زندگی کو اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ کسی فرد کے ظاہری حالات و واقعات تو ہر کوئی معلوم کر سکتا ہے مگر باطنی کیفیات، نفسیاتی ہیجانات اور قلبی و ذہنی واردات کو دوسرا کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ اس طرح آپ بیتی کے ذریعے کسی فرد کی بالکل حقیقی اور سچی تصویر سامنے آنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ بیتی نگار کسی مجبوری کے باعث اپنی خامیوں، کمزوریوں اور ساری سچائیوں کو بیان نہ کرے۔ اگر ایسا

کیا جائے تو ایسی آپ بیتی فنی اعتبار سے ناقص ہوگی، کیوں کہ سچائی اور راست بازی آپ بیتی کی بنیادی شرط ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"آپ بیتی لکھنے والا ایک طرح سے اپنی زندگی پر نگاہ بازگشت ڈال رہا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ بصورت تحریر وہ گزری ہوئی زندگی کو دوبارہ "بسر" کر رہا ہوتا ہے۔لہٰذا اس عمل میں نفسی آسودگی منہا نہیں کی جا سکتی۔ وہ نفسی آسودگی جس کی اساس نرگسیت پر استوار ہوتی ہے۔"(۱۶)

اس لیے ضروری ہے نرگسیت کے خول سے نکل کر اور ذات سے بلند ہو کر آپ بیتی لکھی جائے۔ پھر آپ بیتی اپنی خوبیوں، کامیابیوں اور کامرانیوں کا تذکرہ ہی نہ ہو بلکہ خامیوں، غلطیوں کا اعتراف بھی ہو۔مگر اپنی خامیوں اور برائیوں کا بیان کوئی آسان کام نہیں ہے۔اسی مشکل کے باعث اکثر نقادوں نے خودنوشت سوانح عمری کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا ہے۔(۱۷) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ آپ بیتی لکھنے کو امر محال کہتے ہیں۔" کوئی آدمی اگر مکمل آپ بیتی لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ بہت بڑی بات کا اعلان کرتا ہے، جو اس کی قدرت سے باہر ہے۔"(۱۸) وہ اپنے مضمون "اُردو میں آپ بیتی" میں لکھتے ہیں:۔

"آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔اس کے راستے میں دو رکاوٹیں ہوتی ہیں۔دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔"(۱۹)

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"اگر بے لاگ سچائی سوانح عمری اور آپ بیتی کی شرط اول ہے تو یہ مقصد آپ بیتی اچھی طرح پورا نہیں کر سکتی۔"(۲۰)

"Autobiography" کی مصنف مسز آرمارو بنسن بر، کا بھی یہی خیال ہے:۔

"آپ بیتی بڑی ناکام صنف ہے۔اس میں ملمّع زیادہ ہوتا ہے۔اظہار کے نام پر اخفا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے کہ میں پرلے درجے کا صاف گو اور راست باز ہوں۔"(۲۱)

ڈاکٹر سید عبداللہ اور مسز Burr کے شبہات بجا مگر اس کے باوجود آپ بیتیاں لکھی جا رہی ہیں اور دنیا کی ہر زبان میں آپ بیتیوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔اس بات کا امکان ہے کہ کوئی شخص آپ بیتی لکھتے ہوئے اپنی زندگی کے صرف وہی پہلو سامنے لائے، جو اس کے نزدیک اچھے ہوں اور اپنی برائیوں، غلطیوں اور خامیوں پر زور بیان سے ایسی رنگ آمیزی کرے کہ وہ

اچھی لگنے لگیں۔اگر آپ بیتی نگار ایسا کرتا ہے تو گویا اس کی ذات میں جھوٹ بولنے، غلط کو صحیح، جھوٹ کو سچ اور باطل کو حق ثابت کرنے کا مادہ موجود ہے۔اگر کسی فرد کے اندر یہ خامی ہے تو پھر ایسے مصنف کی ہر تحریر میں جھوٹ کا عنصر موجود ہوگا، صرف آپ بیتی ہی کو کیوں نا قابل اعتبار قرار دیا جائے۔اس لیے محض اس امکان کی بنا پر کہ کوئی شخص آپ بیتی میں حقائق کو چھپائے گا، آپ بیتی کو مسترد کر دینا درست نہ ہے۔پھر تحقیق میں کسی فرد کے خطوط یا ذاتی تحریروں کو اس کے ذاتی حالات کے لیے بہترین اور بنیادی مآخذ قرار دیا جاتا ہے، اس لیے کہ انسان اپنے بارے میں جو کچھ لکھتا ہے وہ زیادہ قابل اعتماد ہوتا ہے۔یہ سب چیزیں ایک طویل دورانیے پر محیط ہوتی ہیں۔اگر ان میں حقیقت کے خلاف کوئی چیز ہو تو وہ سامنے آجاتی ہے، تحقیق سے کام لے کر آپ بیتی میں موجود حقائق کے مغائر امور کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔آپ بیتی نگار کے دور سے متعلق کئی دیگر کتب، داخلی اور خارجی شواہد بھی موجود ہوتے ہیں، چھان بین کے ذریعے حقائق سامنے آجاتے ہیں۔اس لیے بیک جنبش قلم آپ بیتی کی صنف کو نارسا، ناقص اور ناکام قرار دینا درست نہ ہے۔اس ضمن میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

''آپ بیتی پر ہمہ گیر بے اعتمادی کا خطِ بطلان کھینچنا مناسب نہیں۔دنیا کے عام ذخیرہ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد ونظر سے باہر نہیں۔ہمارے لیے غور وفکر اور چھان بین کے ذریعے سے بہ ہمہ وجوہ صحیح واقعات اخذ کر لینا مشکل نہیں لیکن نفس معلومات صحیحہ کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دور کے ذخیرہ تاریخی اور انبار عبرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامّل کیوں کیا جائے۔''(۲۲)

اس ساری صورت حال میں توازن مختار مسعود کے طریقہ اور احتیاط کی صورت میں نظر آتا ہے:۔

''اتنے بڑے سرمائے (سوانحی ادب) کو پڑھنے کے لیے ایک عمر اور فرصت درکار ہے۔یہ دونوں میسر بھی ہوں تو ان کے استعمال اور کتاب کے انتخاب میں احتیاط لازم ہے۔یہ احتیاط خودنوشت کے سلسلے میں بے حد ضروری ہے اور یہ عادت بے حد مضر کہ ہر بڑے آدمی کی خودنوشت کو پڑھا جائے۔رزق ہی نہیں کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے۔'' (۲۳)

جس طرح عام انسانی زندگی میں بعض افراد اور شخصیات دوسروں کے لیے رہنما اور مثال ہوتے ہیں اسی طرح کسی آپ بیتی کی عظمت میں جہاں اس کے فن، اسلوب اور فکر کی اہمیت ہے وہاں شخصیت کو بھی بہت اہم مقام حاصل ہے۔آدمی سے انسان بننے اور اس سے اگلے مرحلے پر اشرف المخلوقات کے مقام تک پہنچنا ہر ایک کا نصیب نہیں ہے۔زندگی کے ہجوم اور آبادی کے اس جنگل میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ملک، قوم، وطن، دین وایماں یا کسی اعلیٰ قدر کے لیے جیتے ہیں۔یہ لوگ اپنے کارناموں

سے اس دنیا کو خوبصورت بنانے کے لیے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔انسانوں کو ان کے حقیقی مقصد سے آگاہ کرنے کے لیے جدو جہد کرتے ہیں۔دوسروں کے لیے اپنی زندگی وقف کر کے انھیں آسانیاں فراہم کرتے ہیں۔

فرشتوں سے بہتر ہے انساں ہونا

مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ (۲۴)

ایک ایسی آپ بیتی، جو کسی فرد کی زندگی کے ارتقائی مراحل، عام فرد سے منفرد اور قابل تقلید بننے کی داستان کو بیان کر سکے،جسم و روح کی ارتقائی منازل کا بیان فنی چابک دستی کے ساتھ ہو وہی آپ بیتی زندہ جاوید ہو سکتی ہے۔ایسی آپ بیتی نارسا کہلائے گی اور نہ ہی ناقص۔چناں چہ آپ بیتی کے اس مقصد کو پانے کے لیے اولاً ایک اعلیٰ انسانی اقدار کی مالک شخصیت کی ضرورت ہے۔ایک ایسا فرد جس کی زندگی میں امانت و دیانت، صداقت و سچائی، راست بازی و ایفائے عہد، دوسری اعلیٰ انسانی اقدار اور زندگی کا کوئی بلند نصب العین ہو، ثانیاً ایسے فرد کو عمدہ پیرایہ بیان اور آپ بیتی کے اسلوب و فن سے بھی آگہی ہو۔اگر چہ یہ ایک مشکل کام ہے مگر دوسری اصناف کے اعلیٰ نمونوں کی طرح آپ بیتی کی بھی ایک بہترین مثال کا منظر عام پر آنا ناممکن نہیں۔

ایک اچھی آپ بیتی ایک انسان کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عہد کا نقشہ بھی پیش کرتی ہے۔اس اعتبار سے آپ بیتی ، جگ بیتی بن کر اپنے عہد کے حالات و واقعات ، افکار و تصورات، علوم و فنون، اقدار و روایات، زمانے کے اجتماعی رویّوں اور کسی قوم کے تہذیبی سفر کا احوال بھی پیش کرتی ہے۔اگر چہ آپ بیتی تاریخ نہیں ہوتی مگر خود انسان کسی معاشرے کا اہم حصہ اور اصل ہیرو ہوتا ہے۔اس لیے آپ بیتی میں اس کی ذات سے جڑے عوامل کا ایک دلیل کے طور پر اختصار کے ساتھ شامل ہونا ناگزیر ہے۔یوں آپ بیتی تاریخ کا ریکارڈ بھی درست کرتی ہے۔اس طرح آپ بیتی بیک وقت کئی علوم اور ادب کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

آپ بیتی اور سوانح عمری

آپ بیتی سے قریب تر صنف سوانح عمری ہے۔مزید مطالعے سے قبل آپ بیتی اور سوانح عمری کا مقابلہ اور موازنہ ضروری ہے تا کہ دونوں کے درمیان فرق اور قربتیں واضح ہو سکیں۔سوانح عمری اور آپ بیتی میں پہلا فرق یہ ہے کہ سوانح عمری میں اس کا ہیرو مہد سے لحد تک نظر آتا ہے۔ایک سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ جس کی سوانح لکھ رہا ہے، اس کی پیدائش سے لے کر آخری سانس تک کے جملہ حالات بیان کرے۔آپ بیتی میں ایسا ممکن نہیں ہے، آپ بیتی نگار اپنی وفات تک کی داستان بیان کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔پھر آپ بیتی فنی اعتبار سے بھی کسی فرد کی زندگی کے کسی ایک حصے پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ سوانح عمری پہلے سے مکمل تیاری، ارادتاً اور طے شدہ طریقوں اور مقاصد کے تحت لکھی جاتی ہے۔

اس کے اصول مرتب صورت میں سامنے رکھے جاتے ہیں، مگر آپ بیتی کی خوبصورتی اس کے بے تکلف انداز اور اتفاقی طور پر لکھنے میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق: ''سب سے اچھی آپ بیتی وہ ہوتی ہے، جو کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلف اور سادہ احوال زندگی پر مشتمل ہو۔'' (۲۵)

سوانح عمری اور آپ بیتی میں تیسرا فرق یہ ہے کہ آپ بیتی لکھنے والا اپنی ذہنی کیفیات، جذبات واحساسات اور داخلی کیفیات سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے۔ یوں آپ بیتی نگار اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ہر طرح کے انکشافات کر سکتا ہے۔ مگر سوانح نگار اپنے ہیرو کی اندرونی کیفیات اور داخلی دنیا سے باخبر نہیں ہو سکتا۔ سوانح نگار کو ہر طرح کی معلومات کے حصول کے لیے خارج سے ہی تلاش اور جستجو کرنا پڑتی ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ بیتی لکھنے والا اپنی شخصیت کے جملہ رازوں سے خود آگاہ اور ہر طرح کا لوازمہ خود ہی اپنے ذہن اور ذات سے حاصل کرتا ہے۔

آپ بیتی اور سوانح عمری میں ان اختلافات کے ساتھ ساتھ بہت ہی مماثلتیں بھی ہیں۔ سب سے پہلی مشترک چیز سچائی اور صداقت ہے، جو دونوں کی روح ہے۔ سچائی اور صداقت ہی ایک انسانی زندگی کو متحرک اور جاندار بناتی ہے، یہ انسانی زندگی کسی دوسرے کی مرتب کردہ ہو یا خود اپنی زندگی کی تصویر۔ سوانح نگاری اور آپ بیتی دونوں میں دوسری مشترک چیز یہ ہے کہ وہ شخصیت کی تمام خوبیاں اور خامیاں سامنے لاتی ہیں، جو ایک فرد کی واضح صورت بنانے اور اس کی اصل زندگی سامنے لانے کے لیے ضروری ہیں۔ آپ بیتی اور سوانح میں زمانے، وقت اور حالات کی قدر بھی مشترک ہوتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کی کہانی ہو یا خود اپنی، یہ دکھانا بھی ضروری ہے کہ زندگی کا سفر جس ماحول اور حالات میں ہوا وہ کیا تھے، مگر یہ بھی ضروری ہے کہ ماحول کی تصویر اتنی گہری اور حالات کا بیان اس قدر تفصیلی نہ ہو کہ شخصیت کے نقوش دھندلا جائیں۔ آپ بیتی اور سوانح عمری دونوں ایک انسان ہی کی کہانی ہیں اس لیے دونوں کے مقاصد مجموعی طور پر ملتے جلتے ہی ہوتے ہیں۔

آپ بیتی اور دیگر اصناف ادب

آپ بیتی کے واضح نقوش دیگر اصناف ادب میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ شاعری، افسانہ، ناول اور غیر افسانوی ادب کی بیش تر اصناف کا سوانحی ادب سے گہرا ربط و تعلق ہے۔ ایک فرد کی زندگی میں جو ذاتی تجربات، مشاہدات اور جذبات کی گرمی ہوتی ہے، اس کا عکس اس کی ہر تخلیق و تصنیف میں اپنی ذات کے اظہار کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ کسی فرد کی زندگی جیسے گزری ہوتی ہے وہ اس کی رونمائی کسی نہ کسی صورت اپنے افسانے، ناول یا ڈرامے میں ضرور کرتا ہے۔ یہ اظہارِ ذات، جو بنیادی طور پر آپ بیتی کا وصف ہے، جب کسی دوسری صنف ادب میں آتا ہے تو اسے بھی آپ بیتی سے جوڑ دیتا ہے۔

عالمی ادب کی طرح اُردو ادب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ بیتی تقریباً ہر صنفِ ادب میں موجود ہے۔ اُردو ناول میں مرزا ہادی رسوا کے ناول ''شریف زادہ''، عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر''، قرۃ العین حیدر'' کے سوانحی ناول'' کارِ جہاں دراز

ہے'' سے لے کر ممتاز مفتی کے سوانحی ناول ''علی پور کا ایلی'' اور دیگر کئی ناولوں میں مصنفین کے حالات اُن کے مختلف کرداروں کے روپ میں صاف صاف نظر آتے ہیں۔اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:۔

> ''اگر ایک ناول کسی فرضی شخصیت کی سرگزشتِ دل ہے تو ایک حیات یا سوانح عمری بھی اس لحاظ سے ناول ہی ہے کہ اس کا ہیرو ایک تاریخی حقیقت یا ایک امر واقعہ ہے۔خیال یا مفروضہ نہیں۔اس لیے ناول اور سوانح (ماسوائے چند اتفاقات کے) ایک دوسرے کے متوازی ہی چلتے ہیں۔زندگی کے افکار وحوادث دونوں کا مواد اور موضوع ہے۔ دونوں میں شخصیت کی تصویر منتہا اور مقصود ہے۔''(۲۶)

ناول کے ارتقا میں بنیادی طور پر سرگزشت اور سوانح نگاری نے ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔اسی طرح افسانوں اور ڈراموں کے کرداروں کے ذریعے بعض اوقات لکھنے والا اپنی زندگی کے کسی پہلو کو ہی ناظرین اور قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوتا ہے۔

افسانوی ادب کے علاوہ شاعری میں مثنوی اور دوسری اصناف کے ذریعے شاعر اپنا حال بھی قاری تک پہنچاتا ہے۔پرانی شاعری کی مثنوی کو آپ بیتی سے کہیں بڑھ کر جگ بیتی قرار دیا جاسکتا ہے۔مثنوی میں بعض اوقات تاریخی شخصیات اور فرضی کرداروں کے قصے ہوتے ہیں لیکن آپ بیتی کا پہلو بھی اکثر وبیشتر مثنویات میں موجود ہوتا ہے۔مثنوی کو رزمیہ کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے اور عظیم ترین شاعری رزمیہ کو ہی تصور کیا جاتا ہے۔ہومر کی ''ایلیٹ''، فردوسی کی ''شاہنامہ''، ملٹن کی ''فردوس گم گشتہ''، ہندوستانی ادب میں ''رامائن'' اور ''مہابھارت'' سے لے کر نظامی کا ''سکندر نامہ''، جامی کی ''یوسف زلیخا''، وارث شاہ کی ''ہیر''، میر حسن کی ''بدرمنیر''، دیا شنکر نسیم کی ''گلزارِنسیم'' سے غالب و اقبال تک کے زمانے کی مثنویاں اس کی مثال ہیں۔یہ مثنویاں جہاں اپنے عہد کی تہذیب وثقافت اور حالات و واقعات کے بیان سے جگ بیتی کی کیفیت پیدا کرتی ہیں تو مثنوی کی روایت کے طور پر اصل واقعے سے قبل، شاعر خود اپنے بارے میں جو مختصراً بیان کرتا ہے، اسے آپ بیتی ہی کہا جاسکتا ہے۔شاعری بالخصوص مثنوی میں آپ بیتی کے عناصر پوری طرح موجود ہیں۔

غیر افسانوی ادب میں تو بعض اصناف کی آپ بیتی سے قربت اتنی شدید ہے کہ انھیں بہت بعد تک آپ بیتی ہی میں شمار کیا جاتا رہا ہے یا آپ بیتی کی قسم شمار ہوتی رہی ہیں۔ان اصناف میں انشائیہ، روزنامچہ، سفرنامہ، رپورتاژ، مکتوب اور تذکرے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

انشائیہ خالصتاً ایک داخلی طرزِ نگارش ہے۔اس میں لکھنے والا اپنے احساسات و جذبات، تجربات و مشاہدات اور خیالات کو قلمبند کرتا ہے۔یہ چھوٹے چھوٹے مضامین ایک طرح کی آپ بیتی ہی ہوتے ہیں۔اس کا اسلوب بیان، فنی وفکری اٹھان اور انداز واطوار آپ بیتی ہی کے مرہونِ منت ہیں۔نظیر صدیقی انشائیے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"یہ وہ صنفِ ادب ہے، جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے۔"(۲۷)

انشائیے کو ذاتی اور غیر رسمی باتوں ہی کے باعث انگریزی میں Personal Essay کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر بشیر سیفی تک سبھی انشائیے میں ذات کے اظہار کے پہلو کو لازمی قرار دیتے ہیں، جو آپ بیتی کی بنیادی خوبی ہے۔

ڈائری یا روز نامچہ بھی ادب کی معروف صنف ہے۔ روز نامچے سے نہ صرف لکھنے والے کی سوانح سامنے آتی ہے بلکہ ایک عہد کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر مسز Burr نے تو آپ بیتی کے مقابلے میں روز نامچہ کو زیادہ مستند تصور کیا ہے۔ ان کے خیال میں اس صنف میں مصنف اکثر سچ لکھتا ہے۔(۲۸) ایسا بہر حال اس روز نامچے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے، جو لکھنے والا اپنی یاداشت کے لیے لکھے نہ کہ اشاعت کی غرض سے۔ آپ بیتی میں روز نامچے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ روز نامچے میں مصنف کے روز و شب کا ذکر اس کے اپنے قلم سے ہوتا ہے، جو نہ صرف آپ بیتی بلکہ سوانح عمری اور دیگر اصناف کے لیے بنیادی لوازمے کا کام دیتا ہے اور تحقیق کے بنیادی مآخذ میں شمار ہوتا ہے۔

آپ بیتی کی ایک صورت مکتوب نگاری ہے۔ خط و کتابت ایک فطری اور بے تکلف پیرایہ اظہار ہے۔ اس میں لکھنے والا اپنے خیالات اور حالات سیدھے اور سچے طریقے سے ظاہر کرتا ہے۔ اُردو ادب میں غالب کے خطوط کو ایک منفرد اور اہم مقام حاصل ہے۔ ان خطوط کو ایک خاص ترتیب دے کر مرتب کیا جائے تو غالب کی بہترین آپ بیتی بن سکتی ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں غالب کو اُردو کا اوّلین خاکہ نگار قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "خودستائیاں" میں خطوط غالب کی مدد سے غالب کا خودنوشت خاکہ بھی مرتب کیا ہے، جس کا عنوان ہے "آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے"۔(۲۹)

تذکرہ نویسی بھی سوانح ہی کی ایک ابتدائی صورت کہی جا سکتی ہے۔ اُردو ادب میں تاریخ ادب کے حوالے سے پہلے پہل تذکرے مرتب ہوئے۔ میر تقی میرؔ، میر حسن اور مصحفی سے لے کر آبِ حیات تک کئی تذکرے ایسے ہیں، جو نہ صرف تاریخ ادب اُردو کا بنیادی مآخذ ہیں بلکہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی سوانح کا مآخذ بھی ہیں۔ اکثر لکھنے والوں نے اپنا تذکرہ خود لکھا ہے۔ چناں چہ اسے اُردو میں آپ بیتی کے ابتدائی نقوش میں شمار کیا جائے گا۔

اسی طرح سفر نامہ اور رپورتاژ میں بھی آپ بیتی کے عناصر اور جھلکیاں موجود ہیں۔ انسان بنیادی طور پر گھومنے پھرنے اور نئی نئی جگہوں اور مقامات کو دیکھنے کا شوقین ہے۔ اس لیے ہر زبان میں سفر ناموں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب "اُردو ادب میں سفر نامہ" میں سفر ناموں کے تحریر کرنے کی ایک وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مقصد یہ ہوتا تھا کہ مسافر نے سفر کے دوران، جو مشاہدات جمع کیے ہیں اور تجربات

سمیٹے ہیں ان میں دوسرے لوگ بھی شرکت کرسکیں۔'' (۳۰)

ایک سفر نامے میں لکھنے والے کے ذاتی تاثرات اور مشاہدات اسے آپ بیتی سے جوڑتے ہیں۔ سفر کے تاثرات کو ظاہر کرنے کا ایک جدید طریقہ رپورتاژ ہے۔ رپورتاژ میں اپنے سفر کے تاثرات کو افسانوی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اُردو ادب میں سجاد ظہیر کا ''یادیں''، کرشن چندر کا ''پودے''، عصمت چغتائی کا ''بمبئی سے بھوپال تک''، قرۃ العین حیدر کا ''ستمبر کا چاند''، قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا''، محمود ہاشمی کا ''کشمیر اداس ہے'' اور کئی دوسرے رپورتاژ پیش کیے جا سکتے ہیں، جن میں آپ بیتی کے واضح نقوش پائے جاتے ہیں۔

آپ بیتی کے درج بالا اصناف سے قریبی مماثلت اور فنی و فکری یکسانیت کے باعث تاریخی بیان میں اکثر و بیشتر انھیں ایک دوسرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُردو ادب کی ان اصناف میں بالخصوص سفر نامہ، رپورتاژ، ڈائری، روزنامچہ، مکتوب، انشائیہ اور آپ بیتی کے ارتقائی سفر میں یہ سب اصناف ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے درج بالا تمام اصناف کو آپ بیتیوں میں ہی شمار کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون ''اُردو میں آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:۔

''اُردو میں لکھی گئی آپ بیتیاں بھی کئی طرح کی ہیں:

۱۔ مکمل حالات زندگی۔

۲۔ زندگی کے کسی حصے کی روداد یا ایسی سوانح عمری، جس کی مدد سے اپنے اہم فن یا کارنامے کے ارتقا کی داستان مرتب کی گئی ہو۔

۳۔ روزنامچے اور سفر نامے۔

۴۔ شخصی جھلکیاں یا شخصی خاکے۔

۵۔ کسی کی کہانی، اس کی زبانی۔

۶۔ شخصی انشائیے۔'' (۳۱)

آپ بیتی، اسلوب و فن

آپ بیتی میں اسلوبِ بیان، سادہ، دلچسپ اور قاری کے ذوق سلیم کے مطابق ہونا فنی تقاضا ہے۔ اس میں حقیقت نگاری، صداقت، حق گوئی اور غیر جانب داری کا عنصر زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ مبالغہ آرائی، رنگ آمیزی، غلط بیانی، عبارت آرائی اور تکلف و تصنع اسے فنی اور علمی لحاظ سے کمزور کرنے کا باعث بنتا ہے۔ آپ بیتی کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والوں کا جدا جدا اسلوب ہی ہر ایک کی منفرد خصوصیت قرار پاتا ہے۔ اسلوب ہی انھیں ایک دوسرے سے ممتاز بھی کرتا ہے۔ پھر آپ بیتی میں وسعت اور تنوّع کی اہمیت ہے۔ آپ بیتی میں دیگر شخصیات کی شمولیت کے ساتھ ساتھ ان کے تعلقات، کام اور

ذمہ داریوں کی نوعیت آپ بیتی کو بامعنی اور بامقصد بناتی ہے۔ یہ بھی اہم ہے کہ مصنف نے حالات وواقعات کے بیان میں کہاں تک سچ سے کام لیا ہے اور کہاں کہاں رنگ آمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے افکاروخیالات کے بیان میں کس قدر توازن برقرار رکھا ہے اور سب سے اہم بات اسلوب بیان کی شگفتگی، تازگی اور سحر انگیزی ہے۔ یہ وہ اہم امور ہیں، جو ایک عمدہ آپ بیتی کے لیے ضروری ہیں۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے فنی اعتبار سے آپ بیتی کے اہم عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''خودنوشت کے فن میں کم از کم تین عناصر اہم ہیں۔ لکھنے والے کی یاداشت، لکھنے والے کا اسلوب اور لکھنے والے کے اردگرد کا حلقہ رجال واحباب۔ ایک اور اہم بات یادرکھنے کی ہے کہ کم گوئی اور اخفائے ذات کے نتیجہ میں حقائق کا اخفا بھی ہوسکتا ہے اور اکثر لوگ ایسی باتیں بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتے، جو ان کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔'' (۳۲)

آپ بیتی کے حوالے سے ناقدین کی بحث بھی بہت دلچسپ ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ آپ بیتی میں لکھنے والے کو جرأت وبے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ذات سے جڑے راز اور جرم طشت ازبام کرنے چاہئیں۔ انگریزی ادب میں ژاں ژاک روسو کی آپ بیتی Confession ''اعترافات''، اس اعلان کے ساتھ منظر عام پر آئی کہ ''نہ میں نے اپنا کوئی جرم چھپایا اور نہ ہی اپنے آپ میں کسی خوبی کا اضافہ کیا۔'' (۳۳) تو اس نے آپ بیتی میں ایک نئی اور انوکھی طرح ڈالی۔ اس کی تقلید میں نہ صرف انگریزی ادب بلکہ دنیا بھر کے ادب میں ''بے باک'' آپ بیتیوں کی روایت چل پڑی۔ اُردو ادب میں جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات''، ساقی فاروقی کی ''پاپ بیتی'' اور ممتاز مفتی کی ''علی پور کا ایلی'' میں اسی جرأت وبے باکی کی روایت کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا گروہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی قیادت میں آپ بیتی اور خودنوشت سوانح عمری میں اخفا کا قائل ہے۔ ان کا خیال ہے:۔

''سوانح کو ہر حال میں آئینہ کمال ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ میرے نزدیک اشتہار ہے اور سوانح کے دائرے سے باہر ہے۔'' (۳۴)

وہ آپ بیتی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے اسے معاشرے میں سچائی، اچھائی اور شرف انسانیت کے فروغ کا باعث قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''اصل سوال یہ ہے کہ بشریت کس طرح آدمیت میں، آدمیت کس طرح انسانیت میں اور انسانیت کس طرح عظمت میں ڈھلی۔ ہر سوانح عمری کے لیے ایسے ہی کسی معنی کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ بیتی کے اس کے علاوہ بھی صدہا تقاضے اور مطالبے

ہیں۔'' (۳۵)

ان کے خیال میں جن چیزوں کو انسانی تہذیب نے ہزاروں برس کے تجربات کے بعد مخفی رکھا فن کے نام پر اس طرح کی عریانی و فحاشی اور اظہار کے نام پر ہر طرح کا الم غلم بیان کرنا درست نہ ہے۔ ادب میں اخفا کی شائستگی اور رمز وایما کی خوبصورتی بھی ہے نہ کہ فقط برہنگی اور عریانی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''وجہی سے عبدالحق'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''سوال یہ ہے کہ عریانی میں کمال کی کیا بات ہے۔ یہ تو کوشش کے بغیر، ابتدائی انسان کو بھی (حیوان کو بھی) میسر ہے۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ انسان نے اپنی کوشش سے، اپنی قوت اختراع وایجاد سے، بد وضعی کو انتہائے زیبائی و کمال حسن میں کس طرح تبدیل کیا۔ بلاغت وشائستگی کی حد یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے نیچے تو بن مانس کو بھی میسر ہے مگر انسان اس سے ارفع ہے۔'' (۳۶)

حاصل بحث یہ ہے کہ آپ بیتی میں بھی ایک توازن کی ضرورت ہے۔ اخفا اور کم گوئی بھی اچھی نہیں مگر عریانی اور بدتہذیبی بھی وجہ کمال نہیں۔ ''پاس ناموسِ عشق'' اور ''رمز وایما'' اگرچہ شاعری کی جان ہے، مگر دیگر اصناف ادب میں بھی اس کا خیال انھیں معیار سے گرنے سے بچاتا ہے، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ آپ بیتی میں اس کا استعمال اسے شاعری یا فکشن میں شامل نہ کر دے اور اسے فنی اعتبار سے بیانیہ سے نکال کر افسانوی ادب نہ بنا دے۔ آپ بیتی کے مقاصد میں اپنی ذات کی افادیت دوسروں تک پہنچانا، کسی عظیم مقصد میں کامیابی کے بعد دوسروں کو اس کے لیے تیار کرنا، دوسروں کی اصلاح اور عبرت وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔ فرد کے نفسیاتی مطالعے، ارتقائی سفر کی کہانیاں دراصل ایک انسان کی دروں بینی اور شخصیت کی چھپی پرتوں کا مطالعہ کرنے کا باعث ہیں، جو دوسرے علوم فلسفہ، نفسیات وغیرہ کے لیے بھی اہم ہیں۔ ایک آپ بیتی میں ان مقاصد کا حصول اس طور ہو کہ اسے ''مدلل مداحی'' سے بچایا جائے۔ آپ بیتی میں سچ کے نام پر اخفا اور بے باکی کے نام پر عریانی اور نا قابلِ بیان حالتوں کا تذکرے کے بجائے راست راست، بلا کم وکاست زندگی کی اصل تصویر پیش کی جائے۔ زندگی کی خلوتوں اور جلوتوں، لطافتوں اور کثافتوں کا بیان اپنی حدود میں ہی رہے تو اچھا ہے ورنہ یا تو عیبوں کا چھپانا پڑتا ہے یا ان کی بے وجہ تاویلیں پیش کرنا پڑتی ہیں۔ خود کو حقیقت کے آئینے میں دکھانا بہت مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیتی کے فن کو تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اس عمل میں اگر کٹنے سے بچا جا سکے تو بھی اعتدال کے بغیر نہیں چلا جا سکتا۔ لہٰذا توازن سے لکھی ہوئی آپ بیتی کہ جس میں انسان فرشتہ لگے اور نہ حیوان بلکہ انسان ہی لگے، کسی آپ بیتی نگار کو آپ بیتی کے فن سے عہدہ برآ ہونے میں مدد دے سکتی ہے۔

آپ بیتی سفر

علم الدین سالک کے مطابق ''آپ بیتی اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان۔'' (۳۷) اپنے اوپر بیتے حالات وواقعات کا تذکرہ کرنا انسان کی سرشت میں ہے۔ جنت سے نکالے جانے کے بعد حضرت آدمؑ اور اماں حوّا کا ملن جب ہوا ہوگا تو انھوں نے ضرور، جدائی کے ایام میں اپنے اوپر بیتے صدموں کی کہانی ایک دوسرے کو سنائی ہوگی اور اس دنیا کو جنت نشاں بنانے کی منصوبہ بندی کی ہوگی۔ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا تو پہلے پہل یقیناً قابیل نے ہی اپنی غلطی کا بیان خود جاری کیا ہوگا۔

آپ بیتی کی ابتدا کا واضح ثبوت مہیا کرنا دشوار ہے کیوں کہ آغاز میں آپ بیتی اور تاریخ میں فرق نہ کیا جاتا تھا۔ ذونوفن اور ہیروڈوٹس کے کارناموں میں تاریخ اور آپ بیتی کا سراغ اور امتزاج ملتا ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی آپ بیتی کی روایات ملتی ہیں۔ ابنِ خلدون نے آپ بیتی لکھی۔ انگریزی ادب میں پہلے پہل نظم میں آپ بیتیاں لکھیں گئیں۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں سینٹ آگسٹین (۳۵۰۔۴۰۳ ق م) کی ''اعترافات'' (Confessions) کو پہلی خود نوشت سوانح عمری قرار دیا جاتا ہے۔ (۳۸) انگریزی میں Confessions کے نام سے بہت سی آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں، جن میں سینٹ آگسٹین، ژاں ژاگ روسو، راج ناتھ، ردر فورڈ وغیرہ شامل ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں اٹلی کے جیروم کارڈن فریش اور Beneventuto Celline کی آپ بیتیاں منظرِ عام پر آئیں۔ سترھویں صدی میں انگریزی زبان میں کافی تعداد میں آپ بیتیاں لکھیں گئیں لیکن اس دور میں شائع ہونے والی آپ بیتیوں کی تعداد بہت کم ہے۔

اگرچہ اس سے قبل بھی آپ بیتی دوسری اصناف جیسے تاریخ، سفرنامہ وغیرہ کے ساتھ ملی جلی صورت میں تھیں مگر اٹھارہویں صدی میں اسے ناول کے ساتھ ملایا گیا۔ دنیائے ادب میں انیسویں صدی کے آغاز میں آپ بیتی اپنی اصل اور منفرد پہچان کے ساتھ صحیح معنوں میں سامنے آئی جب ہربرٹ سپنسر، چارلس ڈارون، الفرڈ رسل اور کارلائل وغیرہ کی آپ بیتیاں سامنے آئیں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں (۱۸۰۹ء) لفظ Autobiography بھی پہلی بار اس کے لیے استعمال میں آیا۔ (۳۹) انیسویں صدی میں ایک بار پھر آپ بیتی کو دوسری اصناف جیسے، افسانہ، سوانح عمری وغیرہ کے امتزاج سے سامنے لایا گیا۔ ایسی آپ بیتیوں میں ایڈمنڈ گوس کی آپ بیتی ''فادر اینڈ سن'' (Father and Son) سوانح عمری اور آپ بیتی کے امتزاج کا نمونہ ہے۔ بیسویں صدی کی آپ بیتی میں جنگ عظیم اول اور دوم کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان جنگوں میں شریک سپاہیوں کی آپ بیتیوں میں نہ صرف ذات کا بیان ہے بلکہ حالات کی مرقع کشی بھی ملتی ہے۔ بیسویں صدی کی انگریزی زبان میں لکھی گئی آپ بیتیوں میں پہلے پہل مذہبی معاملات، پھر نفسیات کی روشنی میں ذات کو سمجھنے کی کوشش اور آخرکار زندگی کی حقیقی تصویر سامنے لانے کی سعی نظر آتی ہیں۔ لیڈی فین شا کی یاداشتیں، ایڈمنڈ کالے، راج نارتھ، ردرفورڈ اور روسو کی ''اعترافات'' جیسی آپ بیتیاں اس فن کا نقطۂ عروج ہیں، جن میں جرأت و بے باکی، زندگی کے حقائق اور باریکیوں کی نقاب کشائی اور اپنی ذات کی

حقیقی تصویر پیش کرنے کا، جو انداز پایا جاتا ہے، اس نے آپ بیتی کو نیا رنگ اور روپ بخشا۔

مشرقی ادب میں اگرچہ مغربی انداز کی آپ بیتیوں جیسی بہت کم مثالیں موجود ہیں لیکن فارسی زبان میں لکھی گئی بادشاہوں کے توزک، عربی اور ترکی میں لکھی ہوئی یادداشتیں اور چند دیگر زبانوں میں صوفیا اور علما کے ملفوظات میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔ تاریخ ادب کے ارتقائی سفر کے مطالعے میں آپ بیتیوں کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی نے اس مطالعے کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے خیال میں سینٹ آگسٹین کے ''اعترافات'' کو پرانی اور کلاسیکی دنیا کے زوال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انھی معروضی حالات نے سینٹ کی ''اعترافات'' کو منظر عام پر لایا۔ اس کے بعد طویل عرصے تک کوئی قابل ذکر آپ بیتی منظر عام پر نہ آئی۔

آپ بیتیوں کا دوسرا دور نشاتِ ثانیہ (Renaissance) کے بعد کا ہے کہ جب اصلاحات اور نشاتِ ثانیہ کی تحریکوں نے فرد کی ذات کو اہمیت دی اور اسے ابھارا۔ اس کے نتیجے میں خود شناسی کی لہر چلی، جس نے انسان کو اپنی ذات کے اظہار پر مجبور کیا:۔

> ''اس دور کے تین خود نوشت سوانح نگاروں کو نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔
> سیلینی (۱۵۰۱ء۔۱۵۷۱ء) جیروم کارڈان (۱۵۰۱ء۔۱۵۷۶ء) اور مائیین
> (۱۵۳۳ء۔۱۵۹۲ء) ان لوگوں نے خودنوشت کے فن کو آگے بڑھایا۔'' (۴۰)

تیسرا دور اٹھارہویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں انسان نے کئی حوالوں سے ترقی کر لی۔ اس کی ذہنی سطح وسیع ہوگئی تو آپ بیتیوں کا ایک نیا باب طلوع ہوا۔ اس دور کا نمایاں ترین آپ بیتی نگار روسو (۱۷۱۲ء۔۱۷۷۸ء) تھا، جس نے ''اعترافات'' کے ذریعے آپ بیتی کی تاریخ میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس نے جرأت اور بے باکی کے ذریعے آپ بیتی کو اس کے حقیقی معنوں کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ روسو ''اعترافات'' کی افتتاحی عبارت میں لکھتا ہے:۔

> ''میں نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا ہے، جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا اور اس کام کی تکمیل کے بعد اس کی تقلید کرنا ممکن نہ ہوگا۔ میں اس دنیائے فانی کے سامنے ایک ایسے انسان کو پیش کرنا چاہتا ہوں، جو فطرت خلقی کا مظہر ہو اور وہ انسان میں خود ہوں۔ میں نے انسان کو پرکھا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں دوسرے لوگوں سے قطعاً مختلف ہوں، اُن سے بہتر نہ سہی لیکن میں دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے اپنی اصلیت کو برقرار رکھا ہے۔ قدرت نے میرے ساتھ صحیح کیا۔ کیا غلط سانچے کو تلف کرنا صحیح تھا یا غلط؟ اس بات کا فیصلہ مجھے پڑھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔'' (۴۱)

روسو نے نہ صرف حقیقت اور سچ کے اظہار کا دعویٰ کیا بلکہ آپ بیتی میں اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کی بھرپور کوشش

کی۔اپنی اسی خوبی کے باعث روسو کی ''اعترافات'' آپ بیتی کے ارتقائی سفر کا ایک اہم اور فیصلہ کن موڑ تصور کی جاتی ہے۔

آپ بیتی کے ارتقائی سفر کا آخری دور بیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔اس صدی میں سائنس کے ساتھ نفسیات کی علمی ترقیوں نے انسانی ذات کی باریک سے باریک پرتوں کو دریافت کرنا شروع کیا تو آپ بیتی کے میدان میں نئے مناظر سامنے آئے۔اس صدی میں مختلف نظریات کی بنیاد پر نظام ہائے فکر وجود میں آئے، ذرائع ابلاغ اور مواصلات نے وسعت اختیار کی، عالمگیر جنگوں نے ہر چیز کو عالمی تناظر عطا کیا۔ چناں چہ اس عہد کے آپ بیتی نگاروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ اب ان کا لکھا ہوا بغیر تحقیق کے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ سائنسی اصولوں، تحقیق کے جدید طریقوں اور چھان بین کے ذرائع نے صحیح اور غلط کو واضح کر کے رکھ دیا۔ چناں چہ آپ بیتی کا فن حقیقت کی طرف بڑھا۔اس میں ہوائی باتوں، من گھڑت قصوں کے بجائے زندگی کی حقیقی اور سچی تصویر پیش کرنے کا عنصر غالب آنے لگا۔اکیسویں صدی میں انسان کے پاس آج سچ اور جھوٹ اور حق و باطل کی پہچان کے اس قدر زیادہ ذرائع موجود ہیں کہ کوئی غلط دعویٰ چند ہی دنوں میں ریت کے ٹیلے سے زیادہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔ اب آپ بیتی نگار کے پاس اسلوب بیان کی چاشنی، انفرادیت، زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرنے اور انسانی زندگی کے باطن کی نقاب کشائی جیسے حقیقی مقاصد سے فرار ممکن نہیں ہے۔

اُردو آپ بیتی کی روایت

اُردو زبان نے فارسی کی گود میں آنکھ کھولی۔ فارسی ادب میں تاریخی ادب کو اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ فارسی ادب میں تذکرے، یاداشتوں، خطوط اور سفرناموں کو تاریخ میں شمار کیا جاتا ہے۔ان اصناف کے مصنفین نے اپنے حالات زندگی بھی لکھے ہیں۔اگر ان حالات وکوائف کو، جو منتشر انداز میں بیان ہوئے ہیں یکجا کیا جائے تو آپ بیتیوں کا بڑا ذخیرہ تیار ہوسکتا ہے۔ پھر فارسی ادب میں مستقل آپ بیتیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ فارسی زبان وادب کی اس روایت کو برعظیم کے مغلیہ حکمرانوں نے برقرار رکھا۔ چناں چہ ''تزک بابری''، ''جہانگیر نامہ''، ''فتوحات فیروز شاہی'' اور اس نوع کی دوسری کئی کتب تصنیف ہوئیں۔ یہ تاریخی تصانیف دلکش واقعات، سادہ زبان، شگفتہ انداز بیان اور اپنے عہد کی جامع اور عمدہ تصویر کشی کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کی دلچسپیوں اور مشاغل کا عکس بھی پیش کرتی ہیں۔علم الدین سالک ان کتب کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے۔ اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی نشاندہی عام تاریخی کتب نہیں کرسکتیں۔ہمیں ان کے لیے آپ بیتیوں سے رجوع کرنا ہوگا۔'' (۴۲)

یہ تاریخی کتب نہ صرف تاریخ، ادب، سائنس، آرٹ، مذہبی علوم کا لوازمہ رکھتی ہیں، بلکہ برعظیم میں آپ بیتیوں کے بھی

بنیادی ماخذ اور ابتدائی نقوش بھی ہیں۔ فارسی زبان میں لکھی گئی ان آپ بیتیوں کے زیرِ اثر بعد ازاں اُردو میں بھی اسی طرز کے نیم تاریخی، نیم سوانحی تذکرے لکھے گئے۔

آپ بیتی کی دوسری صورت صوفیائے کرام کے ملفوظات ہیں۔ برِعظیم میں آنے والے صوفیائے کرام نے اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے، جو طریقہ اپنایا وہ مجلسی تھا، جس میں ہر مذہب اور ملّت کے افراد شریک ہوتے تھے۔ مجلس میں ہر موضوع پر گفتگو ہوتی تھی اور بعض اوقات صاحب سجادہ اپنے ذاتی حالات، تجربات اور واقعات کو بھی بیان کرتے۔ ان کوائف کو بعض مرید تحریر کر کے اپنے مرشد کے حضور حاضر ہو کر سناتے اور اجازت ملنے پر ان کوائف اور ملفوظات کو عوام تک پہنچایا جاتا تھا۔ علم الدین سالک کے مطابق:۔

> ''ملفوظات عام طور پر تاریخ وار مرتب کیے جاتے۔ ان کو مرتب کرنے کا زمانہ ہندو پاکستان میں شیخ نظام الدین اولیا سے شروع ہوتا ہے، جنھوں نے بڑی احتیاط برتی۔ اس سے پہلے جس قدر ملفوظات مرتب ہوئے ان کی حیثیت مشکوک ہے۔'' (۴۳)

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

> ''ملفوظات میں جہاں ایک صاحب سجادہ کے روزمرّہ کے مشاغل کا ذکر ملتا ہے وہاں اس وقت کی سیاست، معاشرت اور لوگوں کی اقتصادی حالت کا علم بھی ہوتا ہے۔ اس زمانے کی تعلیم و تربیت کے بارے میں سب سے بیش بہا معلومات ہمیں فقط ان ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔'' (۴۴)

چناں چہ یہ ملفوظات جہاں اُردو زبان و ادب کے ابتدائی سراغ کا پتا دیتے ہیں وہاں اُردو آپ بیتی کے ابتدائی نقوش بھی انھی میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اُردو نثر کے ان ابتدائی نقوش کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ''لاہور میں حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش علیہ الرحمۃ ہوں یا اجمیر کے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، دہلی کے حضرت نظام الدین اولیاؒ ہوں یا دکن کے حضرت سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ غرض یہ کہ کشمیر، صوبہ سرحد اور سندھ و پنجاب سے لے کر دکن اور بنگال کے دور دراز گوشوں تک اسلام کا پیغام انھی بزرگوں کے ذریعے پہنچا۔ ان بزرگوں نے اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں بھی بڑا حصہ لیا۔ چوں کہ ان کا خطاب عوام سے تھا۔ اس لیے عوام کی روزمرہ کی زندگی میں بولی جانے والی زبان، ان کے خیالات، افکار اور تعلیمات کے اظہار کا ذریعہ قرار پائی۔'' (۴۵)

کشمیر میں جن صوفیا نے اسلام کی دعوت پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں شاہ ہمدان، شیخ العالم اور دوسرے بزرگ شامل ہیں۔ صوفیائے کرام نے برصغیر میں اسلام کی تبلیغ کے لیے خطبات، اقوال، رسائل و کتب، شعر و گیت اور دوسرے جو ذرائع اپنائے، وہی اُردو ادب کے بھی ابتدائی نمونے کہلاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ''اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں درجنوں ایسی اصناف کا تذکرہ کیا ہے، جو اس عہد میں رائج تھیں اور انھیں صوفیائے کرام نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شعری اصناف سے قطع نظر نثری اصناف میں ملفوظ، قول، رسالہ، قصہ، خطبہ اور گفتار نامہ ایسی اصناف ہیں، جن میں آپ بیتی کے نقوش پائے جاتے ہیں:۔

> ''گفتار کے معنی بات یا ملفوظہ کے ہیں۔ صوفیا کی اصطلاح ادب میں اس کا اطلاق اس تحریر پر ہوتا ہے، جو نصیحت اور پند کی غرض سے لکھی جاتی ہے۔ ملفوظات کسی مجلس میں کہی باتیں ہوتی ہیں، جنھیں صاحب ملفوظات کی زندگی میں یا ان کی موت کے بعد اس کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس گفتار نامہ، صاحب گفتار کی اپنی تحریر ہوتی ہے۔ یہ اپنی ترتیب و تدوین میں کسی دوسرے کی محتاج نہیں ہوتی۔'' (۴۶)

یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے کہ اُردو آپ بیتی کے ابتدائی نمونے صوفیائے کرام کے ان ملفوظات، گفتار ناموں اور دیگر اصناف میں بھی ملتے ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ کے ساتھ ساتھ سوانحی ادب کی تاریخ کا ایک اور اہم مآخذ شعرائے اُردو کے تذکرے ہیں۔ ڈاکٹر محمد انصار اللہ اور ڈاکٹر محمد حنیف نقوی، خواجہ خان حمید اورنگ آبادی کے تذکرہ ''گلشن گفتار'' کو اُردو کا پہلا تذکرہ قرار دیتے ہیں، جب کہ فرمان فتح پوری میر کے ''نکات الشعرا'' کی اوّلیت کے قائل ہیں (۴۷)۔ اُردو شعرا کے تذکروں کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ بہر حال ''نکات الشعرا'' یا ''گلشن گفتار'' سے ''آب حیات'' تک جس قدر بھی تذکرے دستیاب ہو سکے ہیں، وہ نہ صرف تاریخ ادب اُردو بلکہ اُردو سوانح نگاری کی بھی ابتدائی صورتیں ہیں۔ ان تذکروں میں بعض لکھنے والوں نے اپنے حالات و کوائف بھی بیان کیے ہیں۔ اُردو آپ بیتی کی روایت کے ابتدائی نقوش ان تذکروں میں پوری طرح موجود ہیں۔

برعظیم کے فارسی ادب میں مکتوب نگاری کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قدیم درس و تدریس میں زبان اور انشا پردازی پر قدرت حاصل کرنے کے لیے انھیں نصاب کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ جب ان مکتوبات میں مصنف اپنے ذاتی حالات بیان کرتے ہیں تو یہ آپ بیتی کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ برعظیم کے علمائے کرام میں خواجہ باقی باللہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیز کے علاوہ عالمگیر، ابوالفضل، فیضی اور دوسرے بڑے بڑے انشا پردازوں کے مکتوبات میں سیاست، معاشرت، دین و ایمان کے ساتھ ساتھ آپ بیتی کے نقوش بھی موجود ہیں۔ مکتوبات کا یہ سلسلہ اُردو میں خطوط غالب کے ذریعے بام عروج کو پہنچا۔ غالب نے مکتوب نویسی کا سلسلہ ۱۸۴۷ء میں شروع کیا۔ خطوطِ غالب اپنی انفرادی شان، خوبصورت اور سہل نثر

کے باعث نہ صرف اُردو نثر کا اہم سنگ میل ہیں بلکہ اُردو میں مکتوب نویسی کا با قاعدہ آغاز بھی۔ بعدازاں احباب کے اصرار پر ان خطوط کی اشاعت ہوئی۔ غالب کی حیات میں ''عود ہندی'' کے نام سے پہلا اور وفات کے تقریباً ایک ماہ بعد ''اُردوئے معلیٰ'' کے نام سے دوسرا مجموعہ اشاعت پذیر ہوا۔ ان کے بعد کئی مجموعے شائع کیے گئے۔ اس سلسلے کا اہم ترین اور مکمل ترین مجموعہ ''غالب کے خطوط'' کے نام سے پانچ جلدوں میں پروفیسر خلیق انجم کا مرتّبہ ہے، جو نئی دہلی غالب انسٹیٹیوٹ سے چھپا ہے۔ خطوط غالب، مرزا اسداللہ غالب کی ذاتی زندگی کے احوال وکوائف کے علاوہ ان کی زندگی کے کئی ظاہری اور باطنی پہلوؤں کی نقاب کشائی کا باعث ہیں۔ یہ خطوط غالب کی ایک بہترین آپ بیتی کا مکمل لوازمہ رکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی برطانوی اقتدار اگر چہ برعظیم کے کچھ علاقوں میں قائم ہو چکا تھا۔ ویلزلی کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر بن کر ہندوستان آنے کی دیر تھی کہ یہ سلسلہ اور زیادہ شدت اور تیزی سے شروع ہو گیا۔ اس کے بعد انگریز سپاہیوں، عالموں، ادیبوں کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوا بھی برعظیم میں آنا شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اپنی کتاب ''اُردو سفر نامے کی مختصر تاریخ'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''پادری تھامس، پادری ولیم کیری اور پادری وارڈ نے جو وارد ہندوستان ہوئے تھے ایسی ڈائریاں اور خطوط لکھے جن سے عجیب وغریب سفرنامے مرتب ہو سکتے ہیں۔'' (۴۸)

اگر ان ڈائریوں اور خطوط سے سفرنامے مرتب ہو سکتے ہیں تو یقیناً آپ بیتیاں بھی مرتب ہو سکتی ہیں۔ چوں کہ ڈائری اور خطوط میں کسی شخص کے ذاتی احوال اور کوائف اور ذات سے جڑی بہت سی معلومات ہوتی ہیں اور یہ خودنوشت بھی ہوتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز میں (۱۸۰۰ء) فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریزوں نے جن مقاصد کے تحت کیا تھا وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں، لیکن اُردو نثر کے فروغ میں اس کالج نے اہم کردار ادا کیا۔ فورٹ ولیم کالج کے زیرِ انتظام اگر چہ سوانحی ادب کے حوالے سے کوئی اہم پیش رفت تو نہ ہوئی مگر اس کالج کے زیرِ انتظام ترجمہ ہونے والی داستانوں کے کرداروں اور دیباچوں وغیرہ میں لکھنے والوں کا اپنی ذات کے حوالے سے بیانات اور معلومات میں آپ بیتی کے نقوش چھوڑے ہیں۔

اُردو کی پہلی آپ بیتی

اُردو ادب میں آپ بیتی کا باقاعدہ آغاز دوسری بہت سی اصناف کی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔ اگر چہ اس عہد میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کی اکثریت اپنے نام اور عنوانات کے علاوہ اپنے لوازمے میں بھی، زندگی کے احوال وکوائف اور انکشاف ذات سے زیادہ ماحول اور حالات کی عکاس ہیں، مگر اُردو کی ابتدائی آپ بیتیوں میں یہی تصانیف شمار ہوتی ہیں۔

سہ ماہی ''الزبیر'' بہاولپور کے ''آپ بیتی نمبر'' میں عبدالحمید قریشی نے نواب صدیق حسن خان بھوپالی کی آپ بیتی ''القالمنن بالقالحن'' کو اُردو کی پہلی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ ''نقوش'' کے آپ بیتی نمبر میں علم الدین سالک نے مولانا جعفر تھانیسری

کی ''کالا پانی'' کواُردو پہلی آپ بیتی بیان کیا ہے۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ''اصناف ادب'' میں اور اُردو کے بیشتر محققین اپنی تحقیقات میں ''کالا پانی'' کو ہی اُردو کی پہلی آپ بیتی قرار دیتے ہیں۔جب کہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اپنے مضمون ''اُردو میں آپ بیتی'' میں لکھتے ہیں:۔

''میں مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب ''کالا پانی'' کو مکمل نہیں کہہ سکتا کیوں کہ یہ جزوی ہے۔'' (۴۹)

مولانا جعفر تھانیسری کی کالا پانی دراصل ان کی اسیری کی روداد ہے۔مولانا جعفر تھانیسری، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کے ایک مجاہد تھے۔وہ اس تحریک جہاد کے دوران گرفتار ہوئے اور ۱۸۶۴ء میں انھیں پہلے پھانسی کی سزا ہوئی ، جو بعد ازاں عمر قید میں تبدیل ہوگئی۔عمر قید کے دوران وہ مختلف جیلوں سے ہوتے ہوئے ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو جزائر انڈماں پہنچائے گئے۔آخر ۱۸ سال سزا کاٹنے کے بعد ۲۰ نومبر ۱۸۸۲ء کو واپس اپنے علاقے میں پہنچے۔(۵۰) ''کالا پانی'' اسی اسیری کے عہد کے حالات پر مبنی مولانا جعفر تھانیسری کی آپ بیتی ہے۔اگرچہ یہ کتاب مکمل آپ بیتی نہیں ہے۔مولانا جعفر تھانیسری کی زندگی کے ایک عہد کی داستان ہے اور اس کے تحریر کیے جانے کا بنیادی مقصد بھی آپ بیتی لکھنا نہیں تھا۔ان کے پیش نظر اسیری کی داستان اور تحریک جہاد کے حوالے سے بعض شبہات کو رفع کرنا تھا۔لیکن اس سب کے باوجود اپنی نوعیت، اہمیت اور اسلوب بیان کے باعث اُردو کے بیشتر محققین اسے اُردو کی اولین آپ بیتی قرار دیتے ہیں۔البتہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، سندھ یونی ورسٹی شعبہ اُردو کے تحقیقی مجلّہ ''تحقیق'' میں پتمبر سنگھ اور رجب علی کی تصانیف کے ساتھ شہر بانو کی آپ بیتی ''بیتی کہانی'' کو اُردو کی اولین خود نوشت قرار دیتے ہیں:۔

''اُردو میں خود نوشت سوانح عمری، اس موضوع پر تفصیلی وخصوصی مطالعہ کرنے والے مصنفین اور محققین کے مطابق آپ بیتی ۱۸۸۶ء سے قبل نہیں لکھی گئیں۔اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ عبدالغفور نساخ اور جعفر تھانیسری کی تصنیف کردہ اُردو کی اولین خود نوشت سوانح عمریاں بتائی جاتی ہیں، جو ۱۸۸۶ء میں لکھیں گئیں۔جب کہ پتمبر سنگھ اور رجب علی کی خود نوشت تا حال اس موضوع پر کام کرنے والوں کے پیش نظر نہ آسکیں۔اس اعتبار سے انھیں اُردو کی اولین خود نوشت کہا جانا چاہیے۔اسی طرح ایک اور خود نوشت سوانح عمری اب تک منظر عام پر نہ آنے کے باعث کسی کی توجہ نہ حاصل کرسکی۔اسے شہر بانو نے ''بیتی کہانی'' کے عنوان سے ۱۸۸۵ء میں تصنیف کیا اور قریباً ڈیڑھ سال بعد کتابی شکل دی۔اس لحاظ سے اسے نساخ اور جعفر تھانیسری کی مذکورہ تصانیف سے قبل

تخلیق میں آنے والی اولین نسوانی خودنوشت سوانح عمری کہا جانا چاہیے۔'' (۵۱)

قطع نظر اس کے کہ کس کو اوّلیت حاصل ہے، اس عہد کی تمام آپ بیتیاں اپنے اسلوب بیان، بنیادی مقاصد، زندگی کے ایک محدود عہد کی داستان ہونے اور حالات کی نقشہ کشی کے اعتبار سے مکمل آپ بیتی میں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ اس عہد کی دیگر تصانیف، جن میں ظہیر دہلوی کی ''داستان غدر''، افضل حق کی ''میرا افسانہ''، منشی عنایت حسین کی ''ایام غدر''، مولانا حسرت موہانی کی ''قید افرنگ''، حسن نظامی کی ''آپ بیتی''، محمد امین زبیری کی ''خودنوشت'' اور اس طرح کی دوسری تصانیف شامل ہیں، سبھی کی صورت حال ایسی ہی ہے۔ البتہ اس عہد اور اس متصل بعد میں لکھی جانے والی تصانیف میں ہمایوں مرزا کی ''میری کہانی میری زبانی''، رضا علی کی ''اعمال نامہ''، دیوان سنگھ مفتون کی ''نا قابل فراموش''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، نقی محمد خان کی ''عمر رفتہ''، مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقش حیات''، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، مولانا عبدالرزاق کانپوری کی ''یاد ایام''، شاہ عظیم آبادی کی ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی''، مرزا فرحت اللہ بیگ کی ''یاد ایام عشرت فانی''، حکیم شجاع کی ''خون بہا'' اور مولانا آزاد کی ''تذکرہ'' وہ کتب ہیں جو نہ صرف آپ بیتی کی بیشتر خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہیں بلکہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے بھی منفرد ہیں۔

اُردو آپ بیتی کے ارتقائی سفر میں یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا''، شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالہء دل دود چراغ محفل''، جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات''، خواجہ غلام السیدین کی ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں''، کلیم احمد کی ''اپنی تلاش میں''، احسان دانش کی ''جہان دانش''، مولانا عبدالماجد دریابادی کی ''آپ بیتی''، شوکت تھانوی کی ''مابدولت''، قرۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، ساقی فاروقی کی ''پاپ بیتی'' اہم تصانیف ہیں۔

ان آپ بیتیوں میں بعض اپنی شگفتہ بیانی، بعض مغربی طرز بیان کی تقلید میں خود کشائی کے منفی انداز اور رجحان کو لیے ہیں۔ کچھ آپ بیتیاں بے باکی اور تشہیر ذات، خامیوں کے بیان اور ذات کی نقاب کشائی کے مثبت رُخ کی حامل ہیں۔ ان میں چند ایک اپنے شوخ، تیکھے انداز اور طنز و مزاح کے باعث تو بعض اسلوب کی توانائی اور زبان کے کلاسیکی رچاؤ کے باعث نمایاں ہیں۔ اس پورے سفر میں رضا علی کی ''اعمال نامہ''، احسان دانش کی ''جہان دانش'' (حصہ اوّل)، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' اور مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' اپنی الگ الگ خوبیوں کے باعث منفرد ہیں۔ اُردو آپ بیتی کے اس ارتقائی سفر کو آسانی سے چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور ابتدائی دور کہلائے گا۔ یہ دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک کے دورانیے پر مشتمل ہے۔ اس عہد میں لکھی گئی آپ بیتیاں جنگ آزادی کے حالات کی نقشہ کشی کرتے ہوئے کسی دینی اور مذہبی تحریک، اصلاحی مقصد اور کسی اجتماعی فکر اور سوچ کی علمبردار نظر آتی ہیں۔ فنی اعتبار سے ابتدائی صورت میں اور اکثر و بیشتر نامکمل ہیں۔ آپ بیتی کی بنیادی خصوصیت انکشاف ذات

کے پہلو سے بھی یہ آپ بیتیاں تشنگی کا شکار ہیں۔ ''کالا پانی''، ''داستان غدر''، ''ایام غدر''، ''قید افرنگ'' وغیرہ اسی صورت حال کی عکاس ہیں۔

دوسرا دور بیسویں صدی کے آغاز سے تقسیم برعظیم تک کے عہد کو محیط ہے (۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء)۔ یہ آپ بیتیوں کی صنف کا قدرے ترقی کا دور ہے، جسے تشکیلی دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کی اکثر آپ بیتیاں انفرادی زندگی کا بیان قدرے تفصیل سے کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ برعظیم میں انگریزوں کے رخصت ہونے کا دور تھا، مگر حالات بگڑے ہوئے تھے اور سنورنے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ ایسی صورت حال میں اپنی ذات کے خول میں پناہ لینے کا رجحان پروان چڑھتا ہے۔ چناں چہ اس عہد کی اُردو آپ بیتی انکشاف ذات، اخفائے ذات کے ملے جلے اثرات کو سموئے ہوئے ہے۔ البتہ یہ رجحان آپ بیتی کے بنیادی مقاصد کی طرف پیش رفت کا باعث ہے۔ ''اعمال نامہ''، ''یادایام''، ''نقش حیات''، ''مشاہدات'' اور ''سرگزشت'' اس دور کی نمائندہ آپ بیتیاں ہیں۔

اُردو آپ بیتی کا زریں دور تقسیم برعظیم کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور بیسویں صدی کے آخری ربع تک چلا جاتا ہے (۱۹۴۸ء تا ۱۹۸۰ء)۔ اس دور کی آپ بیتیوں میں اولاً تقسیم برعظیم کے اثرات اور صورت حال کا بیان نمایاں ہے۔ بعدازاں ہجرت کے دکھ، مشکلات اور پریشانیوں کا بیان، خوابوں کے بکھر جانے کی کہانی اور تقسیم پر اپنے اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے ساتھ ساتھ ذات سے جڑے کرب اور نشاط انگیز لمحوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس دور میں سیاست دانوں، ادیبوں، شاعروں، فوجی وسول افسران اور دوسرے شعبوں سے متعلق افراد کی آپ بیتیاں کثیر تعداد میں منظر عام پر آئیں۔ ہندوستان، پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اُردو آپ بیتیاں تصنیف ہوئیں۔ آپ بیتی کی صنف میں تحقیق اور تنقید کے حوالے سے بھی پیش رفت ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں ''الزبیر'' اور ''نقوش'' نے آپ بیتی نمبر لائے، جن میں اس صنف کی فکر وفن پر مقالات کے ساتھ ساتھ آپ بیتیوں کے حوالے سے عمدہ تحقیقی مضامین بھی چھپے۔ اس عہد میں آپ بیتیوں کا بڑا ذخیرہ بھی معرض وجود میں آیا، جن میں بعض کئی حوالوں سے اہم ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''جہان دانش'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''جہان دانش کی دو خصوصیات ایسی ہیں کہ اگر اس کتاب میں اور کچھ بھی نہ ہوتا تب بھی ان دو خصائص کی بنا پر اسے اُردو کے بڑے ادب پاروں میں شمار کیا جاتا۔ ایک اس کی فضا سازی اور بلیغ اسلوب بیان ہے، جس میں رمز وایما کے گل وگلزار ہر صفحے پر سجے نظر آتے ہیں۔ اس کی دوسری صفت ہے اس میں جا بجا پھیلی ہوئی دانش و حکمت، جسے احسان کے علم وتجربہ کا نچوڑ سمجھنا چاہیے۔'' (۵۲)

آخری دور ۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۰ء کے عرصے کو محیط ہے۔ اس عہد میں اُردو آپ بیتی کا سفر تکمیل کی جانب بڑھتا نظر آتا ہے۔ اس عہد کی آپ بیتیوں میں مغرب کی تقلید کے رجحانات کے ساتھ دوسرے کئی عناصر اور رنگ مہکتے ہیں۔ ان میں جرأت

اظہار کے زمزمے، صداقتِ اظہار کے تقاضے، سچے واقعات کی تصویر کشی، سماجی زندگی اور ذہنی ارتقا کے عناصر کی تکمیل، اپنی ذات کے ساتھ عہد کی مکمل تصویر کشی، رفقا کے رویے، شخصی ارتقا کے مراحل اور عہد اور ذات دونوں کا بھر پور اظہار اور آپ بیتی کے مقاصد اور تقاضوں کی تکمیل جیسے عناصر شامل ہیں۔ اس دور میں متعدد آپ بیتیاں تصنیف ہوئیں، جن میں فنی و فکری حوالوں سے اہم اور نمایاں آپ بیتیاں بھی ہیں اور جرأت اظہار کے نمونے بھی، مگر ''یادوں کی بارات''، ''پاپ بیتی''، ''علی پور کا ایلی'' کے باوجود محققین یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:۔

''اگر ہم میں سے کسی کو یہ جستجو ہو کہ اُردو میں روسو کی ''اعترافات'' کی طرح کتنی چیزیں لکھی گئی ہیں تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ شاید ایک بھی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُردو کا آپ بیتی نگار مشرق میں بیٹھا ہے۔ جہاں اس کے لیے ممکن نہیں کہ سچائی یا سچی تصویر کشی کی آڑ لے کر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتا پھرے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بداعمالیوں کی تشہیر کی یہ حرکت خود مغرب کو بھی مہنگی پڑی۔ بالآخر یہ ہوا کہ لغزش کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے بجائے بشریت کا زیور بنالیا گیا۔'' (۵۳)

اُردو آپ بیتی کے اس سرمائے نے مغرب سے مقابلہ میں شاید ہمسری حاصل نہ کی ہو مگر اُردو ادب کو باثروت بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور دوسری کئی زبانوں کے مقابلے میں آپ بیتی کی صنف کو بھی ترقی دی۔

جدید عہد میں داخل ہوتے ہوئے اُردو ادب کے سرمائے میں ایسی بے شمار آپ بیتیاں موجود ہیں، جنھیں سوانحی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان میں خود کشائی کے مثبت پہلو کو لیے ہوئے احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' جسے سید عبداللہ اُردو کے بڑے ادب پاروں میں شمار کرتے ہیں۔ انکشاف ذات کے منفی رخ، بے باکی اور تشہیر ذات کے مغربی انداز کی تقلید کرنے والی جوش کی ''یادوں کی بارات'' اور ساقی فاروقی کی ''پاپ بیتی'' بھی ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' اُردو ادب کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی آپ بیتی ہے تو اپنے اسلوب کی توانائی، زبان کی کلاسیکی رچاؤ اور تیکھے طنز والی مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' بھی ہے۔

آغا بابر کی ''خدو خال''، مختار مسعود کی ''لوح ایام'' ڈاکٹر وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر پر'' قتیل شفائی کی ''گھنگرو ٹوٹ گئے''، مہر جیون خان کی ''جیون دھارا''، کشور ناہید کی ''شناسائیاں، رسوائیاں''، آغا اشرف کی ''ایک دل ہزار داستاں''، اخلاق احمد دہلوی کی ''یادوں کا سفر''، احمد ندیم قاسمی کی ''میرے ہم سفر''، الطاف گوہر کی ''گوہر گزشت''، خرم مراد کی ''لمحات''، نثار عزیز بٹ کی ''گئے دنوں کا سراغ''، ڈاکٹر سلیم اختر کی ''نشان جگر سوختہ''، رشید امجد کی ''تمنا بے تاب''، کلیم اللہ کی ''ریت پر قدموں کے نشان''، کبیر خان کی ''ہمہ یاراں دشت''، صدیق سالک کی ''سلیوٹ''، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ''یادِ عہدِ رفتہ'' اور کئی دوسری شامل ہیں۔

آپ بیتیوں کی اس صف میں پاک و ہند کے بہت سے بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کی اُردو، آپ بیتیاں بھی منظر عام پر آئی ہیں، جن میں شیخ عبداللہ کی ''آتش چنار''، غلام عباس کی ''کشمکش''، سردار محمد ابراہیم خان کی ''متاع زندگی''، جاوید اقبال کی ''اپنا گریبان چاک''، جاوید ہاشمی کی ''میں باغی ہوں''، ڈاکٹر کرن سنگھ کی ''ولی عہد'' (اُردو ترجمہ)، یوسف رضا گیلانی کی ''چاہ یوسف سے صدا''، معراج خالد کی ''معراج نامہ''، ڈاکٹر عبدالکلام (سابق بھارتی صدر) کی ''پرواز'' وغیرہ شامل ہیں۔

موجودہ دور میں جامعات میں آپ بیتی کے مختلف پہلوؤں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کا کام بھی ہوا ہے۔ مختلف جامعات میں بیس مقالے لکھے جا چکے ہیں، جن میں آپ بیتی کی تاریخ، آپ بیتیوں کے تحقیقی وتنقیدی وتوضیحی جائزے، آپ بیتیوں میں خرق عادت واقعات کا مطالعہ، سیاست دانوں کی آپ بیتیاں، خواتین کی آپ بیتیاں، فکشن نگاروں کی آپ بیتیاں اور دیگر موضوعات شامل ہیں۔

اس کائنات میں انسان کی ساری تگ ودو کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچان سکے۔ اسے اپنی ذات کا ادراک اور اپنے نفس کی معرفت حاصل ہو۔ علامہ اقبال نے اسے خودی سے تعبیر کیا ہے۔ یہی وہ فکر ہے جو انسان کو اس دنیا میں آنے کے مقصد سے آشنا کرتی ہے۔ کائنات سے اس کے تعلق، اس کے وجود کے جواز اور اس کے مستقبل کے حوالے سے طرزِ عمل سے آشنا کرتی ہے۔ اُردو ادب میں موجود آپ بیتیوں کا مطالعہ اس پہلو سے بھی رنگا رنگ مناظر اپنے اندر رکھتا ہے اور انسانی زندگی کے ارتقا، اس کے وجود میں موجود بلندیوں اور پستیوں کا بھی احاطہ کرتا ہے۔

راقم کی رائے میں اُردو آپ بیتی کا ارتقائی سفر اپنی مشرقی روایات اور منفرد مزاج کے باعث اہم اور دلچسپ ہے۔ اس سفر میں اگرچہ آپ بیتیوں میں من گھڑت واقعات اور تاریخی اعتبار سے غیر مصدقہ بیانات بھی موجود ہیں۔ بعض آپ بیتی نگاروں نے فرضی معاشقوں کے ذریعے اسے قارئین کے لیے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے، دوسروں کی کردار کشی، اپنے ہم عصروں کا مضحکہ اڑانا اور اپنی ذات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا رجحان بھی موجود ہے۔ کچھ آپ بیتیوں میں بھرتی کے مضامین اور واقعات اور پھر ان میں بھی تضاد اور تصنع کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اگلے ابواب میں ایسی بہت سی آپ بیتیوں کا جائزہ پیش کیا جائے گا اور اُردو آپ بیتی کے اس عمومی مزاج پر سیر حاصل بحث ہوگی۔ تاہم ''جہان دانش''، ''شہاب نامہ''، ''زرگزشت''، ''شام کے منڈیر پر''، ''آوازِ دوست'' اور ''لوحِ ایام'' جیسی آپ بیتیاں بھی اُردو ادب میں موجود ہیں۔ البتہ اُردو کی دیگر اصناف، جیسے شاعری میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ، افسانوی ادب میں منٹو، کرشن چندر، غلام عباس کی تخلیقات کے مقابلے کی کسی آپ بیتی کا ابھی انتظار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر: خاکہ اور خودنوشت خاکہ۔ مضمون، مشمولہ ''خودستائیاں'' لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۵ء، ص ۹

۲۔ رفیع الدین، ہاشمی، ڈاکٹر: اصناف ادب، سوانح نگاری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۶۱

۳۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: مضمون مشمولہ، اُردو نثر کا فنی ارتقا از ڈاکٹر فتح پوری۔ لاہور: الوقار، ۲۰۰۷ء، ص ۳۱۷

۴۔ ایضاً، ص ۳۱۸

۵۔ ایضاً، ص ۳۱۸

۶۔ ایضاً۔ ص ۳۲۰

۷۔ ابوالاعلیٰ مودودی، سید: تفہیم القرآن، جلد ششم۔ لاہور: ترجمان القرآن، ۱۹۸۲ء، طبع سیزدہم، ص ۵۳۶

۸۔ Wiki Pedia Encyclopedia

۹۔ Lixicon universal Encyclopedia Lexicon publications, T.C. New York, P.355

۱۰۔ فیروز اللغات، لاہور، اُردو بازار، ص ۶

۱۱۔ سید احمد دہلوی: فرہنگ آصفیہ، طبع سوم۔ لاہور: مکتبہ حسن، س ن، ص ۱۱۷

۱۲۔ رفیع الدین ہاشمی: اصناف ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۱۴۰

۱۳۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر: پس نوشت اور پس پس نوشت۔ لاہور: نیاز مانہ پبلیکیشنز، ۲۰۰۳، ص ۲۶

۱۴۔ محمد طفیل: نقوش، آپ بیتی نمبر۔ لاہور: ادارہ فروغ اُردو، جون ۱۹۶۴ء تصریحات

۱۵۔ ابوالحسن علی ندوی، مولانا: پیش لفظ، آپ بیتی از مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۹۶ا، ص ۶

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ادب اور لاشعور۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۹

۱۷۔ ریحانہ خانم: فن آپ بیتی اور آپ بیتیاں۔ مشمولہ ''الذبیر'' آپ بیتی نمبر، ۱۹۶۴ا، ص ۱۲

۱۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: اُردو میں آپ بیتی۔ مشمولہ ''اُردو نثر کا فنی ارتقا''، مرتب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۳۵۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۵۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵۲

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۴۲

۲۲۔ غلام رسول مہر: آپ بیتیوں کی اہمیت۔ مشمولہ ''نقوش''، آپ بیتی نمبر، لاہور، ص ۳۸

۲۳۔ مختار مسعود: آوازِ دوست۔ لاہور: نقوش پریس، ۱۹۹۷ء اٹھارہواں ایڈیشن، ص ۶۸

۲۴۔ الطاف حسین حالی:

۲۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: وجہی سے عبدالحق تک۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۲۷۔ نظیر صدیقی: شہرت کی خاطر۔ کراچی: اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۷۹ء، اشاعت دوم، ص ۱۴

۲۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: وجہی سے عبدالحق تک۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۳

۲۹۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر: خودستائیاں۔ ص ۱۹

۳۰۔ انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب میں سفرنامہ۔ لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، سنہ ندارد، ص ۲۷

۳۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: اُردو میں آپ بیتی۔ مشمولہ ''اُردو نثر کا فنی ارتقا''، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۸

۳۲۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر: پس نوشت اور پس پس نوشت۔ ص ۳۱۔۳۲

۳۳۔ ژان ژاک روسو: اعترافات، اُردو ترجمہ امجد علی بھٹی۔ لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء، ص ۸

۳۴۔ وجہی سے عبدالحق تک، ص ۳۰۳

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۰۲

۳۶۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۳۷۔ علم الدین سالک: آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو۔ لاہور: مشمولہ ''نقوش'' آپ بیتی نمبر، ص ۴۰

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر: پس نوشت اور پس پس نوشت۔ ص ۳۵

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۴

۴۱۔ اعترافات، اُردو ترجمہ امجد علی بھٹی۔ لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۶ء، ص ۸

۴۲۔ نقوش، آپ بیتی نمبر۔ ص ۴۲

۴۳۔ نقوش، آپ بیتی نمبر۔ ص ۵۱

۴۴۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۵۔ ابواللیث صدیقی: اُردو نثر، مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، جلد دوم، طبع دوم۔ لاہور: پنجاب یونی

ورسٹی،۲۰۰۹ء،ص۳۲۸
۴۶۔ الف۔نسیم،ڈاکٹر: اُردو نثر کے ابتدائی نمونے،مشمولہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند،جلداوّل،طبع دوم۔لاہور: پنجاب یونی ورسٹی،۲۰۰۹ء،ص۱۰۵
۴۷۔ محمد زکریا،خواجہ:شعرائے اُردو کے تذکرے،مشمولہ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند''،جلداوّل طبع دوم۲۰۱۰ء،ص۲۴۸
۴۸۔ مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر: اُردو سفرنامے کی مختصر تاریخ۔اسلام آباد:۱۹۷۸ء،ص۱۷
۴۹۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر: اُردو میں آپ بیتی،مشمولہ اُردو نثر کا فنی ارتقا۔ص۳۵۸
۵۰۔ جعفر تھانیسری،مولانا: کالا پانی۔فیصل آباد: طارق اکیڈمی،نقش پنجم ۱۹۹۹ء،آٹھواں،نواں مشترکہ شمارہ،ص۲۵
۵۱۔ معین الدین عقیل،ڈاکٹر: اُردو کی اولین نسوانی خودنوشت،مشمولہ''تحقیق''شعبہ اُردو سندھ یونی ورسٹی،فروری۱۹۹۰ء،ص۲۸۶
۵۲۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر: وجہی سے عبدالحق تک،ص۳۰۸
۵۳۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر: اُردو نثر کا فنی ارتقا،مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ص۳۵۹

فصل دوم

کشمیر میں اُردو آپ بیتی...... ماقبل ۱۹۴۷ء

کشمیر کا تاریخی پس منظر:

خطہ کشمیر کو اپنے سرسبز و شاداب پہاڑوں، خوبصورت گل رنگ وادیوں، چاندی جیسے جھرنوں، گنگناتی ندیوں، مترنم آبشاروں، صاف شفاف چشموں، منفرد جھیلوں، سبزہ زاروں اور مرغزاروں ہی کے باعث منفرد مقام حاصل نہیں ہے بلکہ شاندار تہذیبی اور ثقافتی روایات کی بدولت بھی تاریخ کے اوراق میں نمایاں مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ یہ خوبصورت خطہ ہزاروں سال سے دنیا کے نقشے پر موجود، ارضی و سماوی انقلابات کی زد میں رہا۔ سیاسی تبدیلیاں کشمیر کے جغرافیے اور انسانی زندگی کو بری طرح متاثر کرتی رہیں لیکن ہر دور میں دنیا بھر کے سیاحوں، تاریخ دانوں، جغرافیہ دانوں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے لیے دلچسپی اور تحقیقات کا مرکز بھی بنا رہا ہے۔ شاعروں نے اسے دنیا کا ہیرا (Jewel of the world) اور فردوس گم گشتہ (The Paradise Lost) کہا۔ مغل بادشاہ جہانگیر اس وادی گل رنگ کے حسن کا اس درجہ اسیر ہوا کہ اسے دیکھتے ہی پکار اٹھا ؎

گر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کشمیر کی سرحدیں دنیا کے پانچ بڑے ممالک سے ملتی ہیں۔ اس کے مشرق میں چین، مغرب میں افغانستان، جنوب میں پاکستان اور بھارت اور شمال میں تاجکستان واقع ہیں۔ پامیر کی بلند ترین سطح مرتفع جسے دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ کشمیر کے شمال میں ہے۔ ریاست جموں و کشمیر براعظم ایشیا کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ اس حوالے سے اسے ''برعظیم کا تاج'' اور ''دنیا کی جنت'' کہا جاتا ہے۔ اقبال نے اسی پس منظر میں اس خطے کو تہذیب و ثقافت کے عظیم مراکز سے جا ملایا۔

ع کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر (۱)

دنیا کا یہ عظیم اور خوبصورت خطہ کیسے معرض وجود میں آیا؟ اس سرزمین پر انسانی تہذیب کب چہرہ کشا ہوئی؟ ان سوالوں کے حتمی جواب دینا مشکل ہے۔ کیوں کہ معلوم تاریخ کسی معین عرصے کے تذکرہ سے خالی ہے، لیکن قرائن شاہد ہیں کہ کئی ہزار سال پہلے اس کا وجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے تالیف کیے گئے صحیفوں، مخطوطات اور تذکروں میں اس خطے کا ذکر موجود ہے۔ برعظیم کی قدیم تالیفات ''ویدوں''، ''مہابھارت'' اور ''پرانوں'' میں کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں اور دریاؤں کا ذکر اس بات کا غماز ہے کہ یہ علاقہ ہزاروں سال سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ چلا آ رہا ہے۔ انھی کتب میں اس سرزمین کے قدیم چین اور یونان سے گہرے روابط، تہذیبی و ثقافتی اثرات اور باہم میل جول کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کشمیر کی سرزمین میں دریافت ہونے والی تاریخی بستی ''برزہ ہوم'' کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہڑپہ تہذیب سے قدیم ہے۔

''برزہ ہامہ کی قدیم بستی، ڈی ٹیرا سن اور پیٹرسن نے ۱۸۸۲ء میں دریافت کی۔ تحقیقات

سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس وادی میں ۸۰۰۰ قبل مسیح میں آبادی موجود تھی''۔ (۲)

سرزمین کشمیر کے ظہور کے حوالے سے بھی دلچسپ روایات، پرانی تالیفات میں موجود ہیں۔ ماہرین ارضیات کے مطابق سرزمین کشمیر اور اس سے ملحقہ علاقے ہزاروں سال پہلے سمندر کے نیچے ڈوبے ہوئے تھے۔ جغرافیائی اور طبعی تبدیلیوں کے باعث آہستہ آہستہ پانی اترنا شروع ہوا اور پہاڑوں کی چوٹیاں نمودار ہوئیں۔ پہاڑ اونچائی حاصل کرتے گئے اور وادی کشمیر جھیل کی صورت اختیار کرتی گئی، جسے چاروں طرف سے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ ''نیلہ مت پران'' کے مطابق اس جھیل کو ''ستی سر'' کے نام سے پکارا جاتا تھا (۳)۔ جھیل کے اندر جلودبھو (JALOD BHAVA) نامی ایک دیو رہتا تھا، جو آدم خور تھا اور جھیل سے نکل کر کناروں پر آباد بستیوں کے لوگوں کو تنگ کرتا تھا۔ ''راج ترنگنی'' کے مطابق لوگوں نے کشپ رشی سے فریاد کی تو کشپ رشی نے دیو کے خلاف کارروائی کا ارادہ کیا مگر وہ جھیل کے پانی میں چھپ گیا۔ کشپ رشی نے بارہ مولہ کے قریب پہاڑ کاٹ کر جھیل کا پانی نکالا، جس سے موجودہ وادی کشمیر ظہور پذیر ہوئی۔ (۴) مشہور سیاح برنیئر کا خیال ہے کہ یہ علاقہ زلزلوں کی زد میں رہا ہے، جس کی وجہ سے پہاڑوں میں شگاف پڑ گئے اور ستی سر کا پانی نشیب کی طرف بہہ نکلا، جس کی نشانی دریائے جہلم کی صورت موجود ہے۔ خیال کیا جاتا ہے اسی عظیم الشان سیلاب کی وجہ سے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی تہذیبیں دنیا کے نقشے سے مٹ گئیں۔ چوں کہ کشپ رشی کی کوششوں سے وادی وجود میں آئی تھی اس لیے اس کا نام بھی کشپ بریعنی کشپ کی جگہ پڑ گیا، جو بعد میں کشمیر ہو گیا۔

> ''دوسری روایت کے مطابق کشپ رشی کی محبوبہ کا نام میر تھا۔ دونوں کے نام ملا کر یہ جگہ کشپ میر کہلائی، جو بعد میں کشمیر ہو گیا''۔ (۵)

ایک اور روایت کے مطابق ۵۵۸ ق م میں بنی اسرائیل کے کچھ قبائل ہجرت کر کے افغانستان اور کشمیر میں آئے۔ ان میں سے جو قبیلہ وادی کشمیر میں وارد ہوا اسے اس سرزمین کی خوبصورتی نے مسحور کیا اور انھوں نے اس کا نام ''کشیر'' رکھا، جو ''ک'' اور ''اشیر'' کا مرکب ہے۔ یعنی ''اشیر'' جیسا، اشیر عبرانی میں شام کو کہتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کو یہ سرزمین شام جیسی سرسبز و شاداب اور خوبصورت نظر آئی اور انھوں نے اس کا نام ''کشیر'' یعنی شام جیسا رکھا۔ (۶) مسلمانوں کی روایت کے مطابق جھیل ستی سر کو خشک کرنے کا کام حضرت سلیمانؑ کے حکم پر ''کاشف'' نامی جن نے سرانجام دیا، جس کی وجہ سے اس علاقے کا نام کاشف میر پڑ گیا، جو بعد میں کشمیر ہو گیا۔ (۷)

تاریخ کی گرد میں الجھی ہوئی ان روایات میں سے حقیقت کو سامنے لانا امر محال ہے لیکن یہ طے ہے کہ ہزاروں سال سے یہ سرزمین اپنی خوبصورتی، جغرافیائی حیثیت اور رنگارنگ تہذیبی و ثقافتی عناصر کی جلوہ سامانیوں میں مصروف کار رہے۔ تاریخ کے ابتدائی دور سے اپنی منفرد پہچان، تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کے ساتھ اس پورے خطے میں نمایاں مقام کی حامل رہی ہے۔

کشمیر کی سرزمین میں آباد ابتدائی انسان مختلف خانہ بدوش تھے۔ جیمز فرگوسن کے مطابق یہ خانہ بدوش تورانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اقبال ناتھ لکھتے ہیں:

''کشمیر کے قدیم باشندے ناگ قبیلوں پر مشتمل تھے، جو چشموں کے کنارے آباد تھے اور پھن دار ناگوں کی پرستش کرتے تھے'' (۸)۔

ان ابتدائی قبیلوں کے بعد کشمیر میں آریا آئے۔ وسط ایشیا کے ان باشندوں نے ۲۰۰۰ قبل مسیح میں اپنے علاقوں سے نکل کر یورپ اور جنوبی ایشیا کا رُخ کیا۔ کشمیر پہنچ کر آریاؤں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے تہذیب و تمدن، مذہب و فلسفہ اور زبان و بیان میں یہاں بسنے والے قبائل کے عقائد اور اعمال کو بھی شامل کر لیا۔ چناں چہ آریاؤں کے عقائد میں سانپوں کی پرستش، ذات پات کی تقسیم اور دوسرے عقائد مقامی قبائل کے ملن سے ہی پیدا ہوئے اور مختلف دیوی دیوتاؤں کے تصورات پروان چڑھے۔ براہمن ازم جب اپنے عروج پر پہنچ کر زیادتیوں کی انتہاؤں کو چھونے لگا تو ردِعمل کے طور پر یہاں بدھ مت کا ظہور ہوا۔ بدھ مت کے بعد کشمیر میں سیاسی تاریخ کا آغاز ہوا۔ محمد دین فوق نے اپنی کتاب ''مکمل تاریخ کشمیر'' میں کلہن اور دوسرے قدیم تاریخ نویسوں کے حوالے سے کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ مرتب کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''کشمیر میں متمدّن انسان کی تاریخ ۲۴۵۰ قبل مسیح سے شروع ہوئی ہے، جب گونندہ اوّل تخت نشین ہوا''۔ (۹)

یوں کشمیر کی سرزمین میں ہندو راجے، مسلمان حکمران، سکھ اور ڈوگرہ حکمرانوں کی صورت میں ظلم و ستم، تشدد اور زیادتیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ البتہ اس دورانیے میں مسلمانوں کے بعض حکمرانوں کا دور بالخصوص للتہ دتہ اور بڈشاہ کا زمانہ کشمیر کی خوشحالی اور تعمیر و ترقی کے عہد سے تعبیر ہوتا ہے۔ ساری تاریخ میں کشمیر کے عوام کے اوپر حکمران قہر و غضب کی صورت میں منڈلاتے رہے اور کشمیر کے مظلوم عوام زبان کھولے بغیر پستے رہے۔ محمود ہاشمی نے کشمیر کے ان حکمرانوں کی سوچ اور طرز حکمرانی کو مختصر یوں بیان کیا ہے:۔

''کشمیر میں ہمیشہ ایسے راجوں نے حکمرانی کی جنھیں یہاں کے عوام سے زیادہ یہاں کی مٹی عزیز تھی۔ یہاں کا پانی عزیز تھا، پہاڑ عزیز تھے، جھیلیں اور چشمے عزیز تھے۔ ان سب نے یہاں کے مناظر کا طلسم پہچانا پر کشمیر کی روح میں جھانکنے کی کسی نے کوشش نہ کی۔ کسی نے لحہ بہ لحہ گہری ہوتی ہوئی اس تہہ کو کریدنے کی کبھی کوشش نہ کی، جو کشمیر کی وادی کا ناسور تھا''۔ (۱۰)

انیسویں صدی تک کشمیر کی سرزمین پر ظلم و ستم کا یہ کھیل نئے نئے رنگ سے جاری رہا۔ اس دوران کشمیریوں کی عزت و

غیرت اور شرف انسانیت کو ختم کرنے کے مختلف ہتھکنڈے آزمائے گئے۔ خطہ کشمیر کے افق پر انیسویں صدی کے پانچویں عشرے میں طلوع ہونے والے جس المناک منظر نے اسے بری طرح متاثر کیا وہ معاہدہ امرتسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ رسوائے زمانہ معاہدہ ۱۶/مارچ ۱۸۴۶ء میں انگریزوں اور ڈوگرہ راجا گلاب سنگھ کے درمیان ہوا جس کے مطابق کشمیر کی اس خوبصورت وادی کو اس کے مکینوں سمیت پچھتر لاکھ سکہ نانک شاہی کے عوض بیچ دیا گیا۔ بیچنے والے انگریز اور خریدنے والے ڈوگرہ تھے۔ اس خرید وفروخت پر اقبال نے کہا تھا۔

اے بادِ صبا گر بہ جنیوا گزر کنی
حرفِ زمانہ مجلسِ اقوام بار گوئے
دہقاں وکشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند (۱۱)

کشمیر پر سکھوں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے گلاب سنگھ کا ظلم معاہدہ امرتسر سے پہلے ہی سے جاری تھا، جس کے خلاف اس دھرتی کے سپوت سردار ملی خان، سردار سبز علی خان اور سردار شمس خان اپنے جسموں کی زندہ کھالیں اتروا چکے تھے۔ جی ایم میر ۱۸۳۲ء کے ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''گلاب سنگھ نے اپنے سامنے منگ کے مقام پر ان کی کھالیں کھنچوائیں لیکن ان بہادروں نے اس اذیت کے دوران کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا''۔ (۱۲)

معاہدہ امرتسر کے بعد یہ جدوجہد دبا دی گئی مگر بیسویں صدی میں جب پوری دنیا میں آزادی کی تحریکیں نئے جوش اور ولولے کے ساتھ شروع ہوئیں تو کشمیری بھی اپنی آزادی کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ کشمیر کے مظلوم عوام کی جدوجہد آزادی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ ہزاروں جانوں کے نذرانے اور لاکھوں شہیدوں کے خون نے اسے سیراب کیا ہے، مگر یہ جدوجہد ان کے مقدر کی سیاہ رات کے خاتمے کا باعث نہیں بن سکی۔ بیسویں صدی کے وسط میں جب برعظیم کے عوام کو انگریزوں کی سوسالہ غلامی سے آزادی نصیب ہوئی، اس وقت بھی کشمیریوں کے مقدر کی تاریکی ختم نہ ہوئی، بلکہ تقسیم برعظیم انھیں پہلے سے زیادہ کرب میں مبتلا کرنے کا باعث ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں کشمیر کی وحدت کے ساتھ ساتھ ان کے رشتوں، ماضی وحال اور تہذیب وتمدّن کے سوتے بھی منقسم ہو کر رہ گئے۔

کشمیر میں اُردو زبان:

برعظیم میں اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے جس قدر بھی نظریات موجود ہیں ان میں سے سب سے مستند اور معتبر نظریہ یہ ہے کہ محمود غزنوی کی قیادت میں جب مسلمان برعظیم میں داخل ہوئے تو پشاور کے بعد انھوں نے پنجاب کو اپنی

سلطنت میں شامل کیا۔ لاہور کو مرکز بنا کر یہ لوگ تقریباً ڈیڑھ سو سال یہاں رہے۔ ماہرین لسانیات کے مطابق اس قافلے کے ساتھ آنے والوں میں ترکی، عربی اور فارسی بولنے والے شامل تھے۔ ان غیر ملکیوں کا واسطہ یہاں پر پنجابی بولنے والوں سے پڑا۔ چناں چہ روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے، اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور دوسری ضرورتوں کے پیش نظر انھوں نے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ استعمال کرنا شروع کیے۔ ایک طویل عرصہ کے باہمی روابط کے نتیجہ میں آہستہ آہستہ ایک رابطہ کی زبان بنتی گئی، جسے اُس وقت لاہوری زبان کہا گیا۔ یہی وہ زبان ہے، جس کے اندر دہلی میں جا کر مزید نکھار پیدا ہوا اور ملتانی، دہلوی اور دکنی اور دیگر ناموں سے منسوب ہوتے ہوئے بالآخر اُردو کہلائی۔ حافظ محمود شیرانی کے اس نظریہ جسے ''پنجاب میں اُردو'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس وقت تک دیگر نظریات کے موازنے کے بعد سب سے زیادہ وقیع اور درست تسلیم کیا جاتا ہے۔

جس دور میں برعظیم میں مسلمانوں کی آمد اور ایک نئی زبان کی بنیاد پڑ رہی تھی اس دور میں ریاست جموں وکشمیر بالخصوص جموں اور پونچھ کے پنجاب کے ساتھ نہ صرف علاقائی، سماجی، معاشی اور معاشرتی تعلقات انتہائی قریبی تھے بلکہ ادبی اور لسانی روابط بھی گہرے اور مضبوط تھے۔ پروفیسر ظہورالدین اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:۔

> ''گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران مسلمانوں کی پنجاب آمد اور قیام کے بعد جو کچھ ہوا اس کے اثرات ریاست خصوصاً جموں پر بھی اسی طرح مرتسم ہوئے، جس طرح پورے پنجاب پر مرتب ہو رہے تھے۔ کیوں کہ اس زمانے میں ریاست کا یہ علاقہ یعنی خطہ جموں پنجاب ہی کا ایک حصہ تھا۔ ان شواہد کی بنا پر یہ کہہ دینا بے جانہ ہوگا کہ جموں اُردو کی ان ابتدائی بستیوں میں سے ایک ہے جہاں اُردو کا بیج سب سے پہلے بویا گیا''۔ (۱۳)

لاہوری زبان کو ہمراہ لے کر جب مسلمانوں کا قافلہ دہلی پہنچا تو وہاں کھڑی بولی اور قرب وجوار کی دوسری بولیوں کے اشتراک سے دہلوی اُردو منظر عام پر آئی۔ مغلیہ عہد تک اگر چہ دربار اور سرکار کی زبان تو فارسی ہی تھی مگر گلیوں اور بازاروں اور حاکم ومحکوم کے درمیان رابطے کی زبان کے طور پر یہ نئی زبان اپنی حیثیت اور قابل توجہ اثرات پیدا کر چکی تھی۔ کشمیر میں اُردو زبان کی ابتدا کا عہد بھی مغلوں کا زمانہ ہی ہے۔ اکبر اور اس کے بعد سبھی مغل شہنشاہ ہر سال گرمیوں میں کشمیر آیا کرتے تھے۔ اس قافلے میں ہر طرح کے افراد شامل ہوتے تھے، جن کی اپنی اپنی بولیاں تھیں۔ چناں چہ جب وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تو اس نئی مشترک رابطے کی زبان میں ہی گفتگو کرتے۔ کشمیر میں ان کا قیام مہینوں پر محیط ہوتا۔ اس دور کے ان باہمی روابط کے باعث مقامی لوگوں کو بھی ان لسانی تبدیلیوں سے روشناس ہونے کا موقع ملتا۔ یہ گویا اس خطے میں اُردو زبان وادب کی پہلی صورت تھی۔ ڈاکٹر ظہورالدین کے مطابق تزک جہانگیری (۱۶۲۰ء) اور اقبال نامہ کی شہادتوں کے مطابق اُردو کا اس وقت جو بھی روپ تھا وہ

اس خطے میں عام تھا۔اُن کے مطابق کشتواڑ، پونچھ اور مظفر آباد ایسے مراکز تھے،جن میں عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ اُردو کا سلجھا ہوا مذاق تھا۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:۔

''ان علاقوں میں آج بھی متعدد ایسی لائبریریاں موجود ہیں، جن میں ادب اور مذہبیات سے متعلق عربی اور فارسی میں لکھی گئی متعدد کتابوں کی قلمی نقلیں محفوظ ہیں۔ یہ نقول سترھویں یا اٹھارہویں صدی میں تیار کرائی گئی ہیں''۔(۱۴)

ڈوگرہ حکمران اس خطے میں رسوائے زمانہ معاہدہ امرتسر کے ذریعے آئے تھے اور اس خطے کے حکمران بن بیٹھے تھے،مگر اُردو کی ترقی کے لیے انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔گلاب سنگھ(۱۸۴۶ءتا۱۸۵۷)اور رنبیر سنگھ(۱۸۵۷ءتا۱۸۸۵ء) کے زمانے میں سرکاری اور ادبی زبان فارسی ہی رہی مگر عوام کے لیے، دفاتر، گلی کوچوں اور صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان اُردو ہی تھی۔ حبیب کیفوی لکھتے ہیں:۔

''(ڈوگروں کے) کشمیر پر قبضے کے بہت بعد تک دفتری زبان فارسی رہی۔جموں میں عام بول چال کی زبان ڈوگری تھی اور کشمیر میں کشمیری زبان تھی۔اگرچہ کشمیری زبان میں اس کا سرمایہء ادب موجود اور محفوظ تھا۔تاہم ڈوگری کی طرح یہ علاقائی زبان تھی۔ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسی زبان ہو، جو دونوں صوبوں میں رابطے کا ذریعہ بنے''۔(۱۵)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے جہاں کئی طرح کے تغیرات اور انقلابات برِعظیم کی سرزمین میں لائے وہاں اُردو زبان و ادب کے فروغ کا بھی باعث بنی۔سرسید احمد خان اور اُن کے رفقا کی کاوشوں نے اُردو زبان و ادب کو جس قدر ترقی دی وہ اُردو زبان و ادب کا سنہری باب ہے۔ڈوگرہ حکمرانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کا حق نمک ادا کرنے کے لیے اور آزادی پسندوں کو کچلنے کی غرض سے ڈوگرہ افواج کو دہلی بھیجا۔ یہ فوج کچھ عرصہ دہلی میں رہنے کے بعد جب واپس آئی تو اپنے ساتھ اُردو کے بے شمار الفاظ لے کر آئی۔رنبیر سنگھ کا دور اُردو کے فروغ کے حوالے سے اس لیے زیادہ اہم ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کی متعدد کتابیں اُردو اور ہندی میں منتقل کروائیں۔

''مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۶۶ء میں سرکاری انجمن 'بدیا بلاس سبھا'' کی بنیاد ڈال کر ریاست کی مختلف زبانوں ڈوگری، سنسکرت، پنجابی کے علاوہ اُردو زبان و ادب بھی شامل ہے،سخن کی بے پناہ خدمات انجام دیں''۔(۱۶)

اسی سبھا کے تحت ریاست کا پہلا اخبار''بدیا بلاس''(۱۸۶۷ء) میں جاری ہوا۔ پرتاب سنگھ نے جب عنان حکومت

سنبھالی تو اُردو زبان اس قدر ترقی کر چکی تھی کہ ۱۸۸۸ء میں پرتاب سنگھ نے اسے جموں کی عدالتی اور سرکاری زبان بنایا اور تعلیمی اداروں میں ذریعہ اظہار بھی اُردو ہی کو کر دیا گیا۔ جب جموں کے اس ماحول کے پروردہ افراد ریاست کے دوسرے حصوں وادی، گلگت اور بلتستان میں مختلف ملازمتوں اور دیگر حوالوں سے گئے تو پوری ریاست میں اُردو زبان فروغ پذیر ہوئی۔

اس کے علاوہ ناٹک کمپنیوں کے ریاست میں ڈراموں، مذہبی تحریکوں کی کاوشوں اور محرم کی مجلسوں نے انیسویں صدی کے اختتام تک اُردو کو ریاست جموں کی سب سے بڑی رابطے کی زبان بنا دیا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ہی اُردو زبان اس خطہ کی نہ صرف سب سے بڑی زبان بن چکی تھی بلکہ علمی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اور دفتری زبان، تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم، رسائل و جرائد، ڈراموں، ادبی انجمنوں اور کتب کے ذریعے ادب کے فروغ کی ایک ہمہ گیر تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

۱۹۲۴ء میں پہلا اُردو اخبار ''رنبیر'' اور ۱۹۳۴ء میں ''رتن'' لالہ ملک راج نے جاری کیے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں ''چاند'' اور ''پریم'' کا اجرا ہوا (۱۷)۔ یوں ان اخبارات اور رسائل نے اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ پروفیسر ظہور الدین کے مطابق ''آزادی سے قبل اس خطے میں سو کے قریب اُردو اخبار نکلتے تھے''۔ (۱۸)

۱۹۴۸ء میں ریڈیو جموں، مختلف علاقوں میں بننے والی ادبی انجمنوں اور تقسیم کے بعد جموں اور سرینگر یونی ورسٹیوں کے قیام اور اُن کے شعبہ ہائے اُردو، کلچرل اکیڈمی کے ساتھ ساتھ دونوں حصوں میں ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد کا مختلف مراکز میں جمع ہو جانے کے باعث اُردو کشمیر کے دونوں حصوں کی واحد اور سب سے بڑی علمی ادبی زبان بن گئی۔

کشمیر میں اُردو ادب:

برعظیم میں مسلمانوں کی آمد کے بعد قائم ہونے والی دیرپا مسلم حکومتوں کے مراکز دہلی، دکن اور دوسرے وسطی علاقے رہے ہیں، مگر اُردو زبان و ادب کے آغاز اور ارتقا میں پنجاب اور دوسرے نسبتاً غیر معروف علاقوں کی فوقیت جدید تحقیقات سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح ریاست جموں و کشمیر میں ہزاروں سال سے تہذیب و ثقافت، زبان و بیان اور علم و ادب میں بنیادی کردار وادی کشمیر کا رہا ہے، مگر اُردو زبان کے آغاز و ارتقا میں وادی کشمیر کے بجائے جموں اور پونچھ کے علاقوں کا کردار اوّلیت اور فوقیت کے ساتھ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دہلی کی طرح کشمیر کے اہم مرکز سری نگر (وادی کشمیر) میں مختلف ادوار میں مختلف زبانیں سنسکرت، کشمیری، فارسی وغیرہ حکمران رہیں۔ چناں چہ ہزاروں سال سے انھی زبانوں میں علم و ادب اپنی مستحکم روایات کے ساتھ موجود تھا۔ اس طرح ترقی یافتہ اور مستحکم روایات کی امین زبانوں کی موجودگی میں کسی نئی زبان کا داخلہ آسان نہیں ہوتا جب تک کہ تغیرات زمانہ، حادثات و حوادث اور تاریخی تبدیلیاں کسی نئی زبان کے آغاز اور فروغ کے امکانات نہ پیدا کر دیں۔

کشمیر میں اُردو زبان اور ادب کا آغاز اور ارتقا کا سہرا جموں اور پونچھ کے علاقوں کے سر جاتا ہے۔ یہ علاقے زمانہ قدیم

سے پنجاب سے ملحقہ ہونے کی وجہ سے پنجاب میں ہونے والے اثرات کی زد میں رہے ہیں۔ چناں چہ مسلمانوں کے برعظیم میں آمد اور اس کے نتیجہ میں اس خطے پر زبان، ادب، تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں کا براہِ راست اثر ان علاقوں میں بھی پڑا اور یہاں اُردو کے آغاز اور ارتقا کا باعث بنا۔ مقامی بولیوں، گوجری، پہاڑی وغیرہ کے باوجود جب اُردو نے یہاں قدم رکھا تو حالات سازگار پائے اور ترقی کرتی چلی گئی۔ اُردو زبان کی طرح اُردو ادب کی ابتدائی کاوشوں کا سراغ پنجاب سے ملحقہ ریاست جموں و کشمیر کے ان علاقوں یعنی پونچھ اور جموں میں ملتا ہے۔ اس حوالے سے اہم حوالہ مثنوی گلزارِ فقر کا ہے، جو میرپور آزاد کشمیر کے رہنے والے شیخ غلام محی الدین کی ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' کے حوالے سے اپنے توسیع مقالات میں اس قدیم مثنوی کا ذکر کیا ہے، جو بارہویں صدی ہجری کی تصنیف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''دہلی میں ابھی اُردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکتا ہے کہ پنجاب میں لوگ اُردو زبان میں مثنویاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میرپور [کشمیر] کے شیخ غلام محی الدین ''گلزارِ فقر'' ۱۱۳۱ھ میں ختم کرتے ہیں''۔ (۱۹)

اسی طرح اس مثنوی کا شمار اُردو کی قدیم مثنویوں میں ہوتا ہے، جو اس خطے میں اب تک کی تحقیق میں پہلی مثنوی ہے۔ غلام محی الدین میرپور آزاد کشمیر کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ''گلزارِ فقر'' کے نام سے ۱۱۳۱ھ میں مثنوی لکھی۔ چالیس صفحات پر مشتمل اس مثنوی میں ۵۹۰ اشعار ہیں۔ اسی علاقے کے ایک اور صوفی بزرگ میاں محمد بخش ہیں، جن کی پنجابی زبان میں شہرہ آفاق مثنوی ''سیف الملوک'' کے نام سے لکھی ہے۔ سیف الملوک اگرچہ پنجابی میں ہے مگر اُردو اور مقامی پہاڑی کے الفاظ سے مزین یہ تصنیف زبان زدِ عام و خواص ہے۔ حکمت سے پُر اور تصوف کے رموز سے بھرا یہ کلام نہ صرف اس خطے بلکہ پنجاب بھر میں معروف ہے۔

ڈاکٹر سید یوسف بخاری اپنے ایک مضمون مشمولہ ''پاکستان میں اُردو'' پانچویں جلد، کشمیر میں بعنوان ''اُردو اور کشمیری'' میں اُردو کے اوّلین شاعر پنڈت شیونرائن بھان بہ تخلص عاجزؔ کو قرار دیتے ہیں۔ وہ پنڈت جگ موہن کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''پنڈت شیونرائن بھان خلف اکبر پنڈت سروب نرائن بھان صاحب پہلے اُردو شاعر ہیں۔ آپ جموں میں ہیڈ ماسٹر اور اس کے بعد کشمیر میں انسپکٹر مدارس رہے.................. اس کے بعد دینا ناتھ چکن مست کشمیری اُردو کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ آپ ۱۹۵۹ء بکرمی میں یعنی انیسوی صدی کے آخری ایام میں اننت ناگ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام انندرام تھا''۔ (۲۰)

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں ۱۸۵۰ء سے قبل کشمیر میں اُردو شاعری نہیں ملتی۔ حالاں کہ یہ بات درست نہ ہے۔ ''گلزارِ فقر'' کی تصنیف ۱۱۳۱ھ (۱۱-۱۷۱۰ء) میں ہوئی ہے، جو زمانی اعتبار سے مذکورہ بالا شعرا سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل کی ہے۔ یوں اب تک کی تحقیقات میں میاں غلام محی الدین میر پوری کو کشمیر کا پہلا اُردو شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر کی دھرتی سے تعلق رکھنے والے کئی شاعر اور ادیب ہندوستان اور پاکستان میں ہجرت کر کے مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔ یوں کشمیری النسل، جن میں رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، برجموہن دتا تریہ، کیفی دھلوی، تربھوجن ناتھ ہجر، آغا حشر کاشمیری، علامہ محمد اقبال، پنڈت نرائن چکبست، چراغ حسن حسرت، میں سے کئی اُردو کے ابتدائی دور سے شعر وادب میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مگر یہاں اُن شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ ہے، جو ریاست میں ہی پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور یہاں پر رہ کر ہی اُردو زبان وادب کی ترقی اور ترویج کرتے رہے۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں جموں کے پنڈت شیونرائن اور دینا ناتھ چکن مست کے ساتھ کشمیر کے دوسرے حصوں پونچھ، وادی کشمیر، مظفرآباد وغیرہ میں بھی اُردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔

اُردو کی پہلی نثری کاوش ''سفرنامہ بخارا'' کو قرار دیا جاتا ہے۔ ''سفرنامہ بخارا''، راجوری کے چودھری شیر سنگھ کی تحریر ہے۔ شیر سنگھ کو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بخارا میں سیاسی اور تجارتی تعلقات کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا تھا۔ واپسی پر شیر سنگھ نے اپنے سفر کے کوائف اور نتائج اُردو میں مرتب کر کے ڈوگرہ حکمران رنبیر سنگھ کو پیش کیے۔ ایک صد پچاس صفحات پر مشتمل یہ سفرنامہ ریاست کے سرکاری ریکارڈ میں اُردو کی پہلی نثری کاوش ہے۔ حبیب کیفوی لکھتے ہیں:۔

> ''یہ رپورٹ اُردو کی پہلی تحریر ہے، جو مسودہ کی شکل میں ڈوگرہ حکمرانوں کے توشہ خانے میں پوری ایک صدی مدفون رہی اور اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب مہاراجہ ہری سنگھ حکومت سے دست بردار ہو کر ریاست سے چلا گیا''۔(۲۱)

چودھری غلام عباس ''کشمکش'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''شیر سنگھ ۲۸ جولائی ۱۸۶۶ء کو براستہ مظفرآباد پشاور، کابل، بلخ و بخارا روانہ ہوا تھا۔ وہ کاشغر یارقند کے راستے ۲۴/اکتوبر ۱۸۶۷ء کو سری نگر واپس پہنچا۔ اس کی مکمل رپورٹ ''سفرنامہ مہتہ شیر سنگھ'' کے نام سے شائع ہوئی، جو ریسرچ لائبریری سرینگر میں موجود ہے''۔(۲۲)

بیسویں صدی کے آغاز میں برعظیم کے دوسرے علمی وادبی مراکز اور بڑے شہروں سے سیاسی، علمی وادبی شخصیات کی کشمیر آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی زیادہ تیزی آئی۔ برعظیم کے جو نامور شاعر اور ادیب اس عرصے

میں کشمیر آئے اور مختلف حوالوں سے یہاں قیام کیا،ان میں پنڈت دتا تریہ کیفی،جعفر علی،اثرلکھنوی،خوشی محمد ناظر حکیم،فیروز الدین طغرائی، پروفیسر علم الدین سالک،محمد عبداللہ قریشی،جسٹس بدین ہمایوں، میر ولی اللہ، مولانا ظفر علی خان، چکبست، حفیظ جالندھری شامل ہیں۔ان میں سے کچھ لوگ کشمیرالاصل ہونے کے باعث محض اپنے اجداد کے دیس میں تعلق کی بناپر، کچھ اصحاب ملازمتوں کے سلسلہ میں اور بعض محض سیر وتفریح کی غرض سے آتے اور یہاں لمبے عرصہ تک قیام پذیر رہتے۔ چناں چہ اس آمد و رفت کے باعث برعظیم کے علمی وادبی اور سیاسی حالات کے اثرات کشمیر تک پہنچے۔ پہلے ۱۹۰۸ء میں ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن، بعدازاں ۱۹۰۹ء میں بزم سخن جموں، جو بعد میں بزم سخن جموں وکشمیر ہوگئی ، کا قیام عمل میں آیا،جن کے زیرِ اہتمام،کل ہند مشاعرے،شعری مجالس، دارالمطالعہ اور دیگر ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔جموں اور کشمیر میں بزم مشاعرہ اور دیگر ادبی تنظیموں کا آغاز ہوااور ان کے زیرِ اثر پونچھ اور دوسرے شہروں میں ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ان ادبی تنظیموں کے باعث شاعری کے ساتھ نثری ادب کا بھی دوردورہ ہوا۔

کشمیر کی اُردو ادبی تاریخ کا معتبر، اہم اور اوّلین حوالہ محمد دین فوق کی صورت میں ملتا ہے۔محمد دین فوق نے تاریخ، سوانح، سیاحت، ادب اور ہر صنف ادب میں سو کے قریب کتب یادگار چھوڑی ہیں۔حبیب کیفوی محمد دین فوق کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''ان کی تمام زندگی کشمیر کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھنے میں بسر ہوئی، ایک فردِ واحد نے اتنا کام کیا ہے، جو ایک ادارہ ہی انجام دے سکتا تھا''۔(۲۳)

اسی عہد کا ایک اور اہم حوالہ چراغ حسن حسرتؔ کی صورت میں ہے۔ چراغ حسن حسرت نے بھی تاریخِ دینیات، صحافت،شاعری،افسانہ اور دیگر میدانوں میں ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

۱۹۴۷ء سے قبل سے ہی کشمیر کے ادبی افق پر فوق اور حسرت کے علاوہ سالگرام سالک، ہرگوپال خستہ، پریم ناتھ آزاد، پریم ناتھ بزاز،عبدالاحد آزاد، دیانند کپور،سراج الحسن ضیا، دینا ناتھ رفیق،نرسنگداس،شیخ غلام محمد،حشمت اللہ خان،غلام احمد کشفی، چودھری فضل الدین،غلام حسین شاہ کاظمی،کشمیری لعل ذاکر وغیرہ اُردو ادب کی مختلف اصناف کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔کشمیر میں اُردو ادب کے فروغ کا باعث بننے والے اہم مراکز جموں، کشمیر اور پونچھ کے ساتھ ساتھ بعض چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی بعض گمنام ادیب اور شاعر اپنے اپنے طور پر ادب کے فروغ اور ادب کے ذریعے اصلاح اور تربیت کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ایسی ہی ایک مثال مولوی میر عالم کی ہے۔مولوی میر عالم راولاکوٹ کے قریبی گاؤں ہورنہ میرہ کے رہنے والے تھے۔انھوں نے نظم ونثر میں تخلیقی اور تحقیقی کام کیا ہے۔شاعری میں ان کی چار تصانیف جب کہ نثر میں ''تاریخ تحریکِ آزاد کشمیر'' کی صورت اہم تصنیف موجود ہے۔ان کی شاعری کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوتا ہے۔ان کی شعری تصنیف ''رسالہ دافع

الرسوم'' ۱۹۲۰ء کی تصنیف ہے۔مولوی میر عالم کے حوالے سے ڈاکٹر ظفر حسین ظفر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

''مولوی صاحب کے تخلیقی اور تحقیقی کام کی اہمیت اس اعتبار سے بڑھ جاتی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے عہد میں آنکھ کھولی جب ریاست جموں وکشمیر کے لوگ بدترین غلامی سے دوچار تھے''۔ (۲۴)

یوں ۱۹۴۷ء سے قبل اُردو شعر وادب پوری ریاست جموں وکشمیر میں برعظیم کے کسی دوسرے خطے کی نسبت زیادہ بہتر طریقے سے پروان چڑھ رہا تھا۔مولوی عبدالحق ۱۹۳۹ء میں کل ہند اُردو کانفرنس دہلی میں، کشمیر کے دورہ کے بعد اُردو زبان وادب کی ترقی پر رپورٹ پیش کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:۔

''کشمیر کا حال دیکھ کر مجھے خاص مسرت ہوئی۔شاید ہندوستان میں کسی صوبے میں اُردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔مدارس میں اُردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم اُردو ہے۔دفاتر کی زبان بھی اُردو ہے اور بہت اچھے شاعر اور ادیب موجود ہیں''۔(۲۵)

کشمیر میں اُردو آپ بیتی ماقبل ۱۹۴۷ء

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے ابتدائی نقوش مختلف اصناف سخن میں منتشر صورت میں موجود ہیں۔اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق کشمیر میں اُردو کی پہلی شعری تخلیق ''گلزارِ فقر'' ہے۔''گلزارِ فقر'' کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔کشمیر میں اُردو کی اس پہلی کاوش میں آپ بیتی کے عناصر موجود ہیں۔

''گلزارِ فقر'' کے بعد انیسویں صدی کے وسط تک کوئی اور شعری یا نثری تخلیق ایسی سامنے نہیں آئی جس میں آپ بیتی کے نقوش پائے جاتے ہوں۔تقریباً ڈیڑھ صدی بعد کشمیر میں اُردو کی پہلی نثری تحریر ایک ''سفر نامہ'' کی صورت میں لکھی گئی۔''سفر نامہ بخارا'' شیر سنگھ کا سفر نامہ ہے، جو مہاراجا رنبیر سنگھ کے عہد میں ۶۸۔۱۸۶۷ء میں لکھا گیا۔اس سفر نامے میں شیر سنگھ نے اپنے حالات کے ساتھ ساتھ اپنے سفر کے کوائف، حالات اور مقصد سفر کی تفصیلات ایک سو پچاس صفحات پر مشتمل رپورٹ کی صورت میں مرتب کیے۔سفر نامہ خود ایک خود نوشت تحریر اور اپنے احساسات، خیالات اور حالات پر مشتمل تحریر ہونے کے باعث آپ بیتی کا حصہ ہے۔لہٰذا آپ بیتی کے ابتدائی عناصر کی تلاش میں اسے بھی کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی تاریخ کا ایک اہم اوّلین ثبوت قرار دیا جا سکتا ہے۔اسی طرح چراغ حسن حسرت، ہرگوپال خستہ، پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولوی میر عالم کی تصانیف اور اس عہد کے دیگر شعرا اور ادیبوں کی تخلیقات میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔ان کا تفصیلی مطالعہ اگلے ابواب میں اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔

اُردو آپ بیتی کی با قاعدہ ابتدا سے قبل ایک آپ بیتی کا تذکرہ ضروری ہے، جو اگرچہ انگریزی میں لکھی گئی اور صاحب تصنیف نے پچیس سال کی عمر میں لکھی، جس کے باعث جزوی ہے لیکن اپنے اسلوب بیان اور جدید رجحانات کے باعث اُردو آپ بیتی کے لیے راہ ہموار کرنے والی ہے۔ یہ آپ بیتی رسول گلوان کی "Servant of the Sahibs" ہے۔ رسول گلوان ریاست کا پہلا باشندہ تھا، جس نے اپنی زندگی کی سرگزشت انگریزی زبان میں لکھی۔ اس کا پورا نام غلام رسول گلوان تھا۔ اس کی پیدائش لیہہ میں ہوئی۔ وہ ایک معمولی قلی تھا۔ اُس نے یورپی سیاحوں کے ہمراہ کشمیر کے مختلف حصوں اور سنٹرل ایشیا تک متعدد سفر کیے۔ اپنی محنت سے انگریزی زبان سیکھی اور ترقی کرتا ہوا بڑے عہدے تک پہنچا:۔

''رسول گلوان نے اپنی کتاب امریکی سیاح اور محقق رابرٹ براٹ کی تحریک پر لکھی۔ رابرٹ کی ہدایت پر رسول گلوان اپنی خودنوشت کے مسودے صاحب کو مختلف پتوں پر بھیجتا۔ پہلی کوشش میں رابرٹ نے کئی مرتبہ دوبارہ لکھنے کے لیے واپس کیے۔ آخر کار بقول رابرٹ براٹ رسول گلوان نے لکھنے کا ایک طرز پا لیا اور اسی کو اپنایا''۔(۲۶)

رسول گلوان کی آپ بیتی اس حوالے سے اہم ہے کہ اس میں طرزِ نگارش آپ بیتی کے اسلوب اور دیگر امور کا کسی حد تک اس زمانے میں خیال رکھا ہے جب اُردو میں آپ بیتی کے فنی امور ابھی طے بھی نہ پا سکے تھے۔ اس کی وجہ رابرٹ براٹ کی رہنمائی تھی۔ رسول گلوان نے آپ بیتی میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام، بچپن، جوانی اور سفر کی روداد کو تفصیلاً تحریر کیا ہے، جس سے اس کی ذاتی زندگی کی مہم جویانہ صورت حال کے ساتھ ساتھ انیسوی صدی کے آخری ربع اور بیسوی صدی کے پہلے ربع کے لداخ کی سماجی زندگی، تعلیمی کیفیات، معاشی حالات، تمدنی سرگرمیوں، سیاسی کوائف اور ریاست بھر کے حالات کا علم ہوتا ہے۔

کشمیر میں اُردو کی پہلی آپ بیتی

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی تاریخ میں پہلی تصنیف منشی محمد دین فوق کی ''سرگزشت فوق'' ہے۔ یہ آپ بیتی اگرچہ زیورطبع سے آراستہ نہ ہوئی مگر اس کا مسودہ بحوالہ علم الدین سالک، مولوی محمد عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے(۲۷)۔ سرگزشت فوق کے سن تصنیف کے حوالے سے مستند حوالہ موجود نہیں ہے البتہ منشی محمد دین فوق کی وفات ۱۹۴۵ء میں ہوئی۔ یوں یہ آپ بیتی ۱۹۴۵ء سے قبل کی تصنیف ہے۔ اس سے قبل کسی دوسری اُردو آپ بیتی کا سراغ نہیں ملتا۔

محمد دین فوق ۱۸۷۷ء میں موضع کوٹلی برزاین میں پیدا ہوئے، جو سیالکوٹ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ فوق اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

''ابتدائی تعلیم گھرتل، جاکے اور لاہور میں حاصل کی، اسی کو انتہائی تعلیم سمجھنا چاہیے، کیوں کہ میں مڈل سے آگے نہ جا سکا، لیکن اس زمانے میں مڈل امتحان بھی یونی ورسٹی

کا امتحان تھا اور ہر طالب علم یہی سمجھتا تھا''۔

مڈل مایہ ءشادمانی بود　　　　مڈل حاصل زندگانی بود　　　　(۲۸)

فوق نے نہ صرف شاعری کی بلکہ تاریخ، تذکرہ نویسی، سوانح نگاری، صحافت، ادب اور دوسری اصناف میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ متعدد اخبارات اور رسائل نکالے۔ تمام عمر اپنی تصانیف اور تالیفات سے کشمیری قوم کی بیداری اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ مشعل سلطانپوری ''مشاہیر کشمیر'' میں محمد دین فوق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''فوق زود نویس بھی تھے اور بسیار نویس بھی۔ ان کی جملہ تصنیفات کی تعداد ۹۰ کے قریب ہے۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں ایسی کوتاہیاں نظر آتی ہیں، جو بسیار نویسی کا خاصہ ہیں لیکن اس کے باوصف ان کی اہمیت کو کم کرنے کا باعث نہیں بنتیں''۔(۲۹)

فوق الکشمیر کے مصنف ڈاکٹر اجمل نیازی تحقیق کے مطابق:۔

''فوق نے سو سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں''(۳۰)

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

''فوق اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اقبال نے ان کی کئی کتابوں کے دیباچے تحریر کیے۔ فوق کے نام اقبال کے بائیس خطوط ''روح مکاتیب اقبال'' میں شائع ہو چکے ہیں، جن سے فوق کے ساتھ اقبال کے گہرے روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس روشنی میں حیات اقبال کی کئی گم شدہ کڑیاں سامنے آتی ہیں''۔(۳۱)

ڈاکٹر اجمل نیازی کے مطابق:۔

''اقبال نے انھیں ''مجدد کشارہ'' کا خطاب دیا۔ فوق نے اپنے مرتب کردہ شعرہ انتخاب ''گلشن نو بہار'' میں کلام اقبال کے ساتھ ایک مختصر تعارف تحریر کیا۔ یہ کتاب ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ فوق نے اپنے رسالوں اور کتابوں میں اقبال کے بارے میں متعدد گراں قدر مضامین تحریر کیے، جس پر اقبال نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں فوق کے ان مضامین سے استفادہ کرنے کا ذکر کیا ہے''۔(۳۲)

یوں محمد دین فوق اقبالیات کے سلسلہ میں ابتدائی حوالہ نگاروں میں سے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کی تحریروں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ محمد دین فوق کی آپ بیتی ''سرگزشت فوق'' نہ صرف اس حوالے سے اہم ہے کہ وہ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا اوّلین

حوالہ ہے بلکہ منشی محمد دین فوق بہت بڑے سیاح تھے، وسط ہند، پنجاب، راجپوتانہ کی ریاستوں، بنگال اور کشمیر سمیت دور دور تک پہنچے۔انیسویں صدی میں مہاراجوں کی ریاستوں کی صورت حال کا نقشہ ان کی آپ بیتی میں موجود ہے۔''سرگزشت فوق'' فوق کی تاریخی، سیاحتی اور دیگر کتب کے حوالے سے بعض واقعات کی تصدیق کے ساتھ اس عہد کی سیاسی اور معاشی، معاشری حالات پر روشنی ڈالنے کے باعث ہے۔ڈاکٹر علم الدین سالک ''سرگزشت فوق'' کے حوالے سے رقم طراز ہیں:۔

''اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فوق صاحب خود اس کا مرکزی کردار ہیں۔وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ اپنی سرگزشت لکھ رہے ہیں۔لیکن اس کے باوجود جو شخص ان سے ملا اس کا تذکرہ انھوں نے اس انداز سے کیا کہ اس کی خوبیاں نمایاں ہوجاتی ہیں اور وہ زندہ جاوید ہوجاتا ہے۔ان کے بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے۔وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے مگر حقیقت کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ اس میں افسانے کا مزہ آتا ہے۔ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلابات ہندوستان میں آئے۔کئی تحریکیں اُبھریں، جماعتیں بنیں اور بگڑیں، پرانی قدریں مٹیں اور نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ان سب کا ذکر اور اثر آپ کی زندگی کی ہر منزل میں نظر آتا ہے''۔(۴۳)

ڈاکٹر اجمل نیازی ''سرگزشت فوق'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''سرگزشت فوق'' آپ بیتی اور جگ بیتی کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔اس میں علامہ اقبال کے علاوہ مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا حالی، داغ دہلوی، محمد حسین آزاد، اکبرالہ آبادی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خان، خواجہ حسن نظامی، آغا حشر کاشمیری اور کئی دوسرے اہل علم اور اہل قلم حضرات کے ساتھ فوق کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔اس طرح ان کے زمانے کے فکری رجحانات اور ذاتی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔(۴۴)

کشمیر میں لکھی جانے والی اُردو آپ بیتیوں میں سے ''غلام عباس'' کی ''کشمکش''، شیخ عبداللہ کی ''آتش چنار''، سردار محمد ابراہیم خان کی ''متاعِ زندگی''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، ڈاکٹر کرن سنگھ کی ''ولی عہد''، سید میر قاسم کی ''داستانِ حیات'' اور دوسری متعدد تصانیف میں ۱۹۴۷ء سے قبل کے حالات بیان ہوئے ہیں۔چوں کہ ان شخصیات کی پیدائش بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں ہوئی۔لیکن یہ آپ بیتیاں تقسیم برعظیم کے بعد منظر عام پر آئیں۔چناں چہ ان کا جائزہ اپنے مقام پر

لیا جائے گا۔

المختصر ۱۹۴۷ء سے قبل اُردو آپ بیتی کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا لیکن یہ اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی۔ منشی محمد دین فوق کی ''سرگزشت فوق'' کے علاوہ کسی دوسری آپ بیتی کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے ہم اسے کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا ابتدائی زمانہ کہہ سکتے ہیں، جس میں اُردو آپ بیتی کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: کلیاتِ اقبال (اُردو) طبع نہم، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹۷

۲۔ موتی لال ساقی: ''برزہ ہوم'' مشمولہ ''شیرازہ'' جلد ۴۵، شمارہ ۸ تا ۱۱۔ سری نگر: جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، ص ۴۱۱

۳۔ ارجن دیو مجبور: ترجمہ نیل مت پران۔ سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لینگویجز ۲۰۰۷ء، ص ۹۹

۴۔ پنڈت کلہن: راج ترنگنی، اُردو ترجمہ ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ۔ میر پور: ویری ناگ پبلشرز، س ن، ص ۸

۵۔ جی ایم میر: جموں و کشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں۔ میر پور: مکتبہ رضوان، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳

۶۔ ایضاً، ص ۲۵

۷۔ ایضاً، ص ۲۶

۸۔ شیرازہ، جلد ۴۵، شمارہ ۸ تا ۱۱، ص ۴۴۸

۹۔ محمد دین فوق: مکمل تاریخ کشمیر۔ میر پور: ویری ناگ پبلی کیشنز، بار دوم ۱۹۹۱ء، ص ۲۸

۱۰۔ محمود ہاشمی: کشمیر اداس ہے۔ لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، بار اوّل ۱۹۵۰ء، ص ۳۵، بار دوم، ص ۳۴

۱۱۔ محمد اقبال، ڈاکٹر، علامہ: بحوالہ ''آتش چنار'' از شیخ عبداللہ، رائل پبلشنگ کمپنی ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۹

۱۲۔ جی ایم میر: کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ۔ میر پور آزاد کشمیر: رضوان پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۴

۱۳۔ ظہور الدین، پروفیسر: جموں میں اُردو زبان و ادب، مشمولہ پاکستان میں اُردو، پانچویں جلد، کشمیر، مرتبین فتح محمد ملک و دیگر۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۲

۱۴۔ ظہور الدین، ڈاکٹر: پاکستان میں اُردو (کشمیر)۔ ص ۱۴۳

۱۵۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو۔ لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، بار اوّل، ۱۹۷۹ء، ص ۱۶

۱۶۔ شہاب عنایت ملک، پروفیسر: بزمِ سخن جموں، مشمولہ ''بازیافت'' ۲۰۰۷ء، ترتیب و تہذیب شعبہ اُردو کشمیر یونی ورسٹی حضرت بل سرینگر، ص ۱۳۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۸۔ ظہور الدین، پروفیسر: پاکستان میں اُردو، پانچویں جلد، کشمیر۔ ص ۱۴۷

۱۹۔ محمود احمد شیرانی، حافظ: مقالات حافظ محمود احمد شیرانی، بحوالہ حبیب، کشمیر میں اُردو، ص

۲۰۔ سید یوسف بخاری: پاکستان میں اُردو، جلد پانچویں، کشمیر۔ص ۹۵

۲۱۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو۔ص ۱۸

۲۲۔ غلام عباس، چودھری: کشمکش۔ص ۱۰۷

۲۳۔ کشمیر میں اُردو۔راولپنڈی: فیروز سنز ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۲

۲۴۔ ظفر حسین ظفر، ڈاکٹر: مولوی میر عالم، ادبی و سماجی خدمات، مشمولہ ''ارقم'' شمارہ ۲، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۲۳۰

۲۵۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو۔ص ۱۲۰

۲۶۔ عبدالغنی شیخ: رسول گلوان کی خودنوشت سوانح، مشمولہ شیرازہ، جلد ۴۴، شمارہ ۴ تا ۸۔سرینگر: جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ص ۹۳

۲۷۔ علیم الدین سالک: آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو، مشمولہ ''نقوش'' آپ بیتی نمبر۔لاہور: ۱۹۶۴ء، ص ۵۸

۲۸۔ محمد دین فوق: تواریخ اقوامِ کشمیر، جلد ۲، اشاعت سوم، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸

۲۹۔ مشعل سلطانپوری: منشی محمد دین فوق، مشمولہ ''مشاہیر کشمیر'' مرتب محمد احمد اندرابی۔لاہور: شرکت پریس، ص ۲۲۳

۳۰۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر: فوق الکشمیر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۳۳۔ علیم الدین سالک: مشمولہ نقوش، آپ بیتی نمبر۔ص ۵۹

۳۴۔ فوق الکشمیر، ص ۱۹

باب دوم

کشمیر میں اُردو آپ بیتی

(۱۹۴۷ءتا۱۹۹۰ء)

فصل اوّل

تشکیلی دور

۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۰ء

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا آغاز تقسیم برعظیم سے قبل ہی ہو چکا تھا، مگر اس کی روایت ابھی مستحکم نہ ہوئی تھی۔ ابتدائی دور کی آپ بیتیاں جزوی اور دوسری اصناف کے ساتھ گھلی ملی تھیں۔ منشی محمد دین فوقؔ کی آپ بیتی ''سرگزشت فوق'' میں بھی ایک فرد کی داستان حیات کے مرکزی نقطے کے بجائے تاریخ اور دیگر شخصیات اور مقامات کے تذکرے کا عنصر نمایاں ہے۔ فوق کی آپ بیتی زیور طبع سے بھی آراستہ نہ ہوسکی۔ اس طرح تقسیم سے قبل کشمیر میں اُردو آپ بیتی نے گویا ابھی محض آنکھ کھولی تھی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا باقاعدہ آغاز تقسیم برعظیم کے بعد ہوا۔ یہی کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا تشکیلی دور ہے۔ صنف آپ بیتی کے سامنے کوئی واضح مثال موجود نہ تھی۔ چناں چہ فنی اعتبار سے یہ آپ بیتیاں کئی حوالوں سے تشنگی کا شکار نظر آتی ہیں۔ اُردو آپ بیتی کے مجموعی سفر کے برعکس اس دور کی کشمیر میں لکھی جانے والی زیادہ تر آپ بیتیاں ادبی شخصیات کے بجائے سیاست دانوں، سرکاری افسران اور ملازمین کی تصنیف کردہ ہیں۔ سیاست اور تحریکِ آزادی کے اہم کرداروں کی ان آپ بیتیوں میں تقسیم برعظیم کے اثرات، تحریکِ آزادی کشمیر اور سیاست کے عناصر کی شمولیت زیادہ ہے۔ ان اثرات اور موضوعات کی حامل آپ بیتیوں کا سلسلہ تقسیم برعظیم سے شروع ہو کر ۱۹۷۰ء تک کے دورانیے کو محیط ہے۔ چناں چہ اس دور کی اہم آپ بیتیوں کے تفصیلی اور انفرادی مطالعے سے قبل سیاسی صورت حال اور تاریخی احوال کا مختصر جائزہ ضروری ہے تاکہ زیرِ مطالعہ آپ بیتیوں کے مزاج اور رنگ ڈھنگ کو پوری طرح سمجھا جا سکے۔

ہزاروں سال پہلے کی تاریخ، پیر پنجال کے فلک بوس پہاڑوں کے درمیان واقع ایک مخصوص علاقے کو کشمیر کے نام سے موسوم کیے ہوئے تھی، مگر رفتہ رفتہ جموں، لداخ، پونچھ اور گلگت بلتستان کے علاقوں پر مشتمل یہ خطہ ایک باقاعدہ ریاست کی صورت اختیار کر گیا۔ معاہدہ امرتسر (۱۸۴۶ء) کے بعد اس ریاست کی واضح جغرافیائی حدود متعین ہوئی تھیں، جو ۱۹۴۷ء تک برقرار تھیں۔ ۱۹۴۷ء کا سال برعظیم کی تاریخ میں اس حوالے سے اہم ہے کہ اس خطے کے لوگوں کو انگریز کی سو سالہ غلامی سے نجات ملی۔ انھیں اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ملا۔ پاکستان اور ہندوستان کی صورت میں دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کا قیام عمل میں آیا، لیکن جموں و کشمیر کے اُفق پر مسرتوں اور آزادیوں کی روشن صبح طلوع نہ ہوسکی۔ یہاں تقسیم کے اصولوں پر عمل ہوا اور نہ ہی یہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق انھیں اپنے مستقبل کے فیصلے کا اختیار حاصل ہوا۔ تقسیم کے مرحلے پر کشمیر کا حکمران مہاراجا ہری سنگھ تھا۔ مہاراجا کشمیری عوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تعلقات اور جغرافیائی صورت حال کی وجہ سے پاکستان کے ساتھ کشمیر کے مستقبل کو وابستہ کرنے کی طرف مائل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۲/اگست کو ہری سنگھ نے پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائمہ طے کیا، جس کے تحت رسل و سائل، ڈاک، تار اور تجارتی و کاروباری راستوں کو برقرار رکھنے کے لیے پاکستان کے حوالے کر دیے گئے۔ یوں کشمیر کے ڈاک خانوں اور دیگر اداروں پر پاکستان کا پرچم لہرانے لگا۔ لیکن بدلتے ہوئے حالات کے باعث اور

ہندی دوستوں کے دباؤ کے نتیجہ میں ہری سنگھ بھارت کی طرف جھکنے لگا۔قبائلی یلغار کا بہانہ آخری کیل ثابت ہوا اور کشمکش میں مبتلا مہاراجا نے بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ الحاق کی دستاویز کے متعلق ایک دوسری رائے بھی موجود ہے کہ یہ الحاق جعلی تھا۔اس معاہدہ کا متن بھارتی حکام کا تیار کردہ تھا، جس پر مہاراجا کے دستخط بھی اصل نہیں ہیں۔ بہر کیف اس الحاق کی بنیاد پر اور تحفظ کا بہانہ بنا کر ۲۷؍اکتوبر کو بھارتی فوج سری نگر میں داخل ہوگئی۔اس صورت حال میں پونچھ کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈوگرہ فوج کے خلاف بے سروسامانی کے عالم میں نبرد آزما ہوگئے۔اس جدوجہد کے نتیجہ میں کشمیر کے ایک بڑے حصے سے ڈوگرہ حکومت کا راج ختم ہوگیا۔ بھارت نے اپنی سیاسی چالوں اور عسکری دباؤ کے باعث وادی میں نئی چالیں چل کر وہاں نیشنل کانفرنس کے صدر اور وادی کے عوام پر گہرا اثر رکھنے والے رہنما شیخ عبداللہ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ جموں میں ہندو اکثریت کے باعث مسلم کانفرنس کے قائد چودھری غلام عباس، جو جیل میں تھے، غیر مؤثر ہو گئے۔ بھارت نے اپنی ساری کوششوں کے باوجود جب کشمیر کو ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو ایک مؤثر منصوبے کے ذریعے مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں لے گیا۔ یوں میدانِ جنگ سے یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی فائلوں میں چلا گیا۔ جہاں پہلے سیز فائر اور بعد ازاں مسئلہ کو کشمیریوں کی مرضی کے مطابق حل کرنے کی قرار دادیں منظور ہوئیں۔اس طرح اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ سرخ فیتے کی نذر ہو کر کشمیریوں کے لیے ایک مستقل دردِ سر بن گیا۔

سیز فائر لائن کے نتیجہ میں یہ ریاست تین حصوں میں منقسم ہو کر رہ گئی۔ پاکستان کے زیرِ انتظام آزاد کشمیر، بھارت کے کنٹرول میں مقبوضہ کشمیر اور چین کے ماتحت کشمیر اقصائے چین۔اس تقسیم نے زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح کشمیر میں تیزی سے پروان چڑھنے والی اُردو زبان اور ادب پر بھی بڑے تباہ کن اثرات ڈالے۔ ڈاکٹر ظہور الدین اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''آزادی کے بعد ملک کی تقسیم اور فسادات کی آگ نے خطہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ نہ صرف جموں کا ایک بڑا حصہ کٹ گیا بلکہ اس کی ادبی محفلوں کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ بہت سے ادیب پاکستان چلے گئے۔ کچھ نے ملک کے دوسرے ادبی مراکز کی طرف ہجرت کی یا پھر اُردو چھوڑ کر کسی دوسری زبان کے سائے میں جا بیٹھے''۔(۱)

ڈاکٹر خوش دیو مینی ان حالات کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

> ''۱۹۴۷ء کے واقعات نے پونچھ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم نے یہاں کی سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ دوسری بہت ساری چیزوں کے ساتھ ساتھ یہاں کا ادبی ماحول بھی قتل ہوا۔ شہر کے مقامی باشندے، اہل ادب اور اہل ذوق اس ماحول سے اکتا کر ہجرت کر گئے۔ ٹھاکر پونچھی، چراغ حسن حسرت، تحسین جعفری، سراج الحسن سراج اور کرشن چندر، چوٹی کے ادیب اور شاعر

پونچھ کو خیر باد کہہ کر چلے گئے''۔(۲)

جموں اور پونچھ کے ساتھ ساتھ وادی کشمیر، لدّاخ اور ریاست کے دوسرے حصوں میں بھی یہی صورت حال نسبتاً کم پیمانے پر سامنے آئی۔اس کے نتیجہ میں تہذیبی وثقافتی، علمی وادبی، فنی اور فکری سلسلے رُک گئے۔ پرانے مراکز ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ نئے مراکز پروان چڑھنے میں وقت درکار تھا۔ یوں کئی سال تک کشمیر میں اُردو ادب کے اُفق پر سناٹے کی کیفیت طاری رہی۔

کشمیر میں اُردو ادب کی دوبارہ صورت گری میں وادی، جموں اور مظفر آباد کے ادیبوں اور شاعروں نے کی کاوشیں اہم ہیں۔مقبوضہ کشمیر میں پہلے ریڈیو جموں اور بعدازاں کلچرل اکیڈمی نے اُردو کے شعرا اور ادبا کو جمع کیا اور انھیں ایک پلیٹ فارم فراہم کیا۔پھر جموں اور سری نگر کی یونی ورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو نے اُردو ادب، تحقیق اور تنقید کی نئی راہیں وا کیں۔ڈاکٹر ظہور الدین کے مطابق ۱۹۵۲ء تک درجنوں ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں آ گیا، جن کے باعث اُردو ادب کی آبیاری ہوئی۔

ان ادبی انجمنوں اور یونی ورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو کے زیرِ اہتمام جن ادیبوں نے مقبوضہ کشمیر میں اُردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا یا اُن میں پروفیسر صاحب زادہ حسن شاہ، پریم ناتھ پردیسی، غلام رسول نازکی، تنہا انصاری، پروفیسر ایم اے فاضلی، غلام حسین نجوی، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، پروفیسر عبدالقادر سروری، شیخ عبداللہ، کے ڈی مینی، ملک راج آنند، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر برج پریمی، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر مشعل سلطان پوری، ڈاکٹر یوسف ٹینگ، غلام نبی خیال، موتی لال ساقی، عبداللہ شیخ، بشیر احمد نحوی، نشاط انصاری، پریم ناتھ در، دینا ناتھ رفیق، ٹھاکر پونچھی، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر عابد پشاوری، ضیا الدین ضیا، سرون ناتھ آفتاب، سید علی گیلانی، اکبر لداخی وغیرہ شامل ہیں۔

آزاد کشمیر اور پاکستان میں وادی کشمیر، جموں اور پونچھ سے ہجرت کر کے آنے والے ادیبوں اور شاعروں میں میر غلام محمد کشفی، شمیم احمد شمیم، میر عبدالعزیز، محی الدین قمر قمرازی، چراغ حسن حسرت، خواجہ عبدالصمد وانی، طاؤس بانہالی، شمس کاشمیری، حبیب کیفوی، عبدالمجید نظامی، چودھری غلام عباس، خورشید الحسن خورشید، ثریا خورشید، پروفیسر جیلانی کامران، پروفیسر مقصود جعفری، ڈاکٹر یوسف بخاری، ڈاکٹر رشید امجد وغیرہ نے اُردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔اسی طرح پاکستان سے (کشمیری الاصل) اعلیٰ ملازمتوں اور دیگر حوالوں سے آزاد کشمیر آنے والے اصحاب میں فضل احمد کریم فضلی، قدرت اللہ شہاب، غلام حسن میر کاشمیری، عطا حسین کلیم، یوسف ظفر، مسعود قریشی، اختر امام، عزیز احمد مدنی، محمود نظامی، سلیم گیلانی نے یہاں اُردو کی علمی ادبی فضا کو پروان چڑھایا۔ان کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر کے مقامی ادیبوں اور شاعروں میں ڈاکٹر صابر آفاقی، ڈاکٹر غلام حسین اظہر، محمود ہاشمی، مولوی میر عالم، سردار محمد ابراہیم خان، سردار عبدالقیوم خان، اکرم طاہر، امین قاسم، جاوید الحسن، رفیق بھٹی، غلام احمد پنڈت، سید غلام حسین کاظمی، پروفیسر عبدالعلیم صدیقی، سید بشیر حسین جعفری، سردار مختار خان، کبیر خان، یعقوب شاہق وغیرہ نے اپنی تصانیف سے فروغِ ادب اُردو میں اہم کردار ادا کیا۔

اس علمی اورادبی فضا میں ۱۹۵۰ء میں تقسیم کے بعد کشمیر کی پہلی اُردو آپ بیتی چودھری غلام عباس کی ''کشمکش'' منظر عام پر آئی، ۱۹۶۶ء میں سردار محمد ابراہیم خان کی ''متاعِ زندگی'' کے بعد مقبوضہ کشمیر سے شیخ عبداللہ اور کرن سنگھ کی آپ بیتیاں بھی تصنیف ہوئیں۔ سیاسی شخصیات کے ساتھ ساتھ شورش کاشمیری اور دیگر علمی وادبی اصحاب نے پاکستان اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنی آپ بیتیاں تحریر کیں۔ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا یہ دورانیہ موضوعی اور آپ بیتی کے فنی اور فکری ارتقا کے حوالے سے اُردو آپ بیتی کے لیے نہایت اہم ہے۔ اس دور کی چند منتخب آپ بیتیوں کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے تا کہ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے اس دور کے نمایاں خدوخال واضح ہو سکیں۔

کشمکش (چودھری غلام عباس)

چودھری غلام عباس بیسویں صدی کے تیسرے عشرے سے چھٹے عشرے کی کشمیری سیاست کے اہم کرداروں میں سے ایک تھے۔ چودھری غلام عباس ۴رفروری ۱۹۰۴ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم جموں شہر میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۵ء میں انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا، پھر ۱۹۳۱ء میں لا کالج لاہور سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ کشمیر کی تاریخ کا اہم ترین دور تھا۔ برعظیم میں انگریزی سامراج کے خلاف ایک فیصلہ کن معرکہ جاری تھا۔ بیداری کی ایک لہر چاروں طرف شروع ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں بندش خطبہ عید اور بعد ازاں سنٹرل جیل میں فائرنگ کے باعث نہتے مسلمانوں کی شہادت کے واقعہ نے کشمیری عوام کے جذبات پر جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ ڈوگرہ مہاراجا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ چودھری غلام عباس نے ۱۹۳۱ء میں ینگ مین ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۲ء میں آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے قیام کے بعد اُس کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ مسلم کانفرنس کے قیام اور سیاسی جدوجہد نے کشمیر کی سیاست پر دیرپا اثرات چھوڑے۔ اس کے روح رواں چودھری غلام عباس تھے۔

تقسیم برعظیم کے موقع پر جب کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ مختلف سازشوں کی نذر ہو رہا تھا، چودھری غلام عباس کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ان تھک محنت اور جدوجہد کی، مشکلات سہیں، جیل کی اذیتیں برداشت کیں اور ہجرت تک کے مراحل سے گزرے، مگر آخری سانس تک اسی مؤقف پر ڈٹے رہے۔ بشیر احمد قریشی ''قائدِ کشمیر'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''قائدِ ملّت (چودھری غلام عباس) اوّل و آخر پاکستانی تھے۔ اس پاکستان کے جس کا تصور سب سے پہلے کشمیر کے عظیم سپوت، شاعر مشرق حکیم الامت حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہٰ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا تھا۔ (۳)

چودھری غلام عباس کی آپ بیتی ''کشمکش'' ۱۹۵۰ء میں تصنیف ہوئی۔ چھبیس ابواب پر مشتمل یہ آپ بیتی اپنے اسلوب، اندازِ فکر اور فن کے اعتبار سے ایک اچھی آپ بیتی اور تاریخی دستاویز ہے۔ یہ نہ صرف ایک عہد کی تاریخ کا صاف اور کھرا بیان ہے بلکہ چودھری غلام عباس کی ذاتی زندگی کا احوال، ان کی سوچ و فکر کے ارتقائی منازل میں کارفرما عناصر کی نشاندہی کرنے والی اہم تصنیف ہے۔ چودھری غلام عباس ایک سیاست دان اور پیشے کے اعتبار سے قانون دان تھے۔ چناں چہ سیاسی جدوجہد کا بیان اور اپنی سیاسی زندگی کے واقعات کا اظہار اُن کی آپ بیتی میں آنا لازمی امر ہے۔ اگر کسی فرد کے اظہار میں بلاغت نہ ہو تو یہ اظہار محض واقعہ نگاری یا روداد نگاری بن جاتا ہے، مگر چودھری غلام عباس یہ اظہار اپنے وسیع مطالعہ سے خوبصورت بناتے ہیں:۔

> ''انسان مقرر کردہ نظامِ قدرت اور عطا کردہ فطرت کے تابع ہے۔ فطرت انسانی ایک

تو وہ ہے، جو قدرت کی جانب سے انسان کے حصہ میں آتی ہے، یہ فطرت صحیحہ ہے۔
ایک اور فطرت ہے، جو پیدائش کے بعد انسان کے ماحول، امتدادِ زمانہ، گردوپیش کے
حالات اور خاص تاثرات ومحرکات کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ فطرت ثانیہ ہے''۔(۴)

کشمکش کے اسلوب بیان میں دل کشی اور دلچسپی کے کئی عناصر موجود ہیں۔ غلام عباس خوبصورت الفاظ کو موزوں مقام پر لانے اور اس سے اپنے بیان میں زور اور دل کشی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ واقعات کے روکھے پھیکے بیان اور سیاسی جدوجہد کے خشک اظہار کو کہیں کہیں اپنے خیالات کے فلسفیانہ انداز اور انگریز شعرا اور ادیبوں کے حوالوں سے دلچسپ بناتے ہیں:۔

''آلڈوس ہکسلے ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والا مصنف ہے۔ وہ کچھ عرصہ ہوا کشمیر
آیا۔ اس نے اپنی سیاحت کے جو تاثرات زیبِ قرطاس کیے اُن میں کشمیر کے متعلق
دو اہم باتیں مذکور ہیں۔ وہ کہتا ہے''میں دورانِ سیاحتِ کشمیر موٹر کار سے جس جگہ گیا
وہاں راستہ میں قدم قدم پر گائیں بیٹھی ہوئی پائیں۔ کار کے شور، ہارن پر ہارن کے
باوجود اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرتی تھیں۔ شاید ان کو اپنے مذہبی تقدس اور مامونیت کا
احساس تھا۔ ایک اور افسوس ناک بات دیکھی وہ یہ تھی کہ وہاں بار برداری کے لیے
حیوانوں کے بجائے انسانوں سے کام لیا جاتا ہے''۔(۵)

''کشمکش'' کا مصنف ایک معروف آدمی ہے۔ لہٰذا اسے مطالعے اور تحریر وتصنیف کے لیے جیل یاترا کی سہولت قدرت کی طرف سے میسر آتی رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''آزاد اور مصروف زندگی میں اتنی فرصت کہاں کہ میں اپنے متعلق لکھ سکوں۔ پس اس
بار جیل کی تنہائی کو غنیمت سمجھتا ہوں، جس نے عمر رفتہ کو میرے سامنے لا کھڑا کیا''۔(۶)

''کشمکش'' کے مطالعے سے چودھری غلام عباس کی زندگی کا یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ وہ ہمہ وقت خود احتسابی کے ذریعے اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو سمجھنے اور دور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ دوسروں کی تنقید برداشت کرنا، اپنے دوستوں اور دشمنوں سے سیکھنا اور خود اپنی ذات کا جائزہ لینا اُن کی ارتقا پذیر شخصیت کا پتا دیتے ہیں۔

''میں نے ٹھنڈے دل سے اپنے آپ کو اپنا ہی ثالث اور محاسب جان کر غیر جانب داری
سے ایک ایک کر کے اپنے محاسن اور معائب کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت میری عمر
۳۰ سال ہوگی۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے میری عمر میں بیس
سال کی کمی ہے اور تجزیہ اور تزکیہ نفس کے اعتبار سے ۲۰ سال کا اضافہ ہو گیا ہے''۔(۷)

واقعات کے بیان میں بھی چودھری غلام عباس موزوں الفاظ اور حسن بیان کا خیال رکھتے ہیں، جس سے ان کے بیان میں ایک سلجھا ہوا وقار آیا ہے:۔

> ''میں نے خون کی ہولی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن جیل کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر مارنے والوں کی گولیوں کی آوازیں، مرنے والے مظلوموں کی آخری چیخیں، اغوا ہونے والی سیکڑوں معصوم دوشیزاؤں کی بے اثر آہیں اور فریادیں ایک مجبور قیدی کی حیثیت سے کلیجہ تھام کر سنیں''۔(۸)

عبدالمجید سالک ''کشمکش'' کے بارے میں پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

> ''ادبی پہلو سے میرے لیے یہ امر انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے کہ چودھری صاحب تقریر کے علاوہ تحریر کے بھی دھنی ہیں۔ وہ نہ صرف واقعات وحالات کو تسلسل اور دلچسپی سے بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں بلکہ بعض مقامات پر احساسات اور واردات کی کیفیت بھی ایسے سنجیدہ اور فلسفیانہ انداز سے ظاہر فرماتے ہیں کہ اُن کی انشاپردازی کی داد دینی پڑتی ہے''۔(۹)

لہٰذا ''کشمکش'' ایک سیاسی اور عوامی شخصیت کی آپ بیتی ہونے کے باوجود اپنے اندازِ بیان، خوبصورت لہجے اور لوازمے کے باعث اُردو ادب کی ایک اچھی آپ بیتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد منظر عام پر آنے والی یہ کشمیر میں پہلی آپ بیتی ہے، جس نے آگے چل کر کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کے لیے اچھی مثال قائم کی ہے۔

''کشمکش'' میں فنی حوالے سے پہلی کمی تو یہ ہے کہ یہ جزوی ہے۔ چودھری غلام عباس نے ابتدا میں بیان کر دیا ہے کہ یہ وسط اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ان کے آخری بار جیل میں جانے کے حالات تک محدود ہے۔ اس طرح ''کشمکش'' چودھری غلام عباس کی زندگی کے آخری بیس سالوں کے تذکرے سے خالی ہے۔ چودھری غلام عباس نے آغاز میں ہی اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آٹو بائیوگرافی ایک مشکل فن ہے۔ اس میں غیر جانب داری وروا داری اور جرأتِ اظہار و بے باکی کا پلڑا متوازن رہنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ چودھری غلام عباس آپ بیتی کے فن سے آگاہ ہیں مگر جس مشکل کا انھوں نے تذکرہ کیا ہے، اگرچہ انھوں نے اس سے نبرد آزما ہونے کی کوشش اپنی آپ بیتی میں کی ہے، مگر وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ انھوں نے کہیں کہیں اپنی تحریر میں ادبی رنگ لانے کی کوشش کی ہے لیکن چند ایک مواقع پر ہی، انھوں نے اکثر و بیشتر سیدھے سادے اور سپاٹ لہجے میں واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان واقعات اور معاملات کی تاریخی اعتبار سے اہمیت مسلم ہے مگر آپ بیتی کے فن اور اس کے خوبصورت اسلوب بیان کے حوالے سے ''کشمکش'' حق ادا کرنے سے اکثر مقامات پر قاصر نظر آتی ہے۔

چودھری غلام عباس کے مطابق شروع سے آخر تک پوری کتاب اُن کے حافظہ اور یاداشت کی مرہون منت ہے۔ اس پر اُن کی یاداشت کی داد دینا پڑتی ہے، مگر منصوبہ بندی اور ذہنی اور فکری تیاری کے بغیر لکھی جانے والی تصنیف کے خامیوں سے وہ دامن نہ بچا سکے۔

المختصر ''کشمکش''، اگرچہ آپ بیتی کے اعلیٰ ادبی معیار کی حامل نہیں ہے مگر تاریخ کشمیر کے ایک اہم باب کی مستند دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ چودھری صاحب کی ذاتی زندگی کے احوال اور قابلِ مطالعہ لوازمے کے باعث اہم ہے۔ چودھری غلام عباس کی ''کشمکش''، کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی اہم کڑی ہے۔

متاعِ زندگی (سردار محمد ابراہیم خان)

''متاعِ زندگی''، کشمیر کی سیاست کے ایک اہم رہنما، تحریکِ آزاد کشمیر ۱۹۴۷ء کے قائد اور آزاد کشمیر کے بانی صدر سردار محمد ابراہیم خان کی آپ بیتی ہے۔ یہ آپ بیتی پہلی بار ۱۹۶۶ء میں کلاسیک لاہور سے شائع ہوئی۔

سردار محمد ابراہیم خان ۱۹۱۵ء میں راولاکوٹ کے ایک قریبی گاؤں ہورنہ میرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سردار محمد عالم خان ایک معزز زمیندار تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ وہ ۱۹۳۳ء میں پونچھ شہر سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے، جہاں سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۴۱ء میں واپس وطن لوٹے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۳ء میں سری نگر ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ آپ کو ۱۹۴۴ء میں حکومت کی طرف سے ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل بنایا گیا مگر ۱۹۴۶ء میں حکومتی پالیسیوں سے اختلافات کے باعث اس عہدہ سے استعفیٰ دے کر عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ سردار ابراہیم خان جنوری ۱۹۴۷ء میں انتخابی حلقہ پونچھ باغ اور پلندری سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ تقسیم برعظیم کے اعلان کے بعد کشمیر کے عوام نے اپنے مستقبل کے فیصلے کے حوالے سے جدوجہد شروع کی تو سردار ابراہیم خان دوسرے رہنماؤں کے ساتھ اس جدوجہد میں مسلّمہ قائد تھے۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو الحاق پاکستان کی تاریخ ساز قرارداد آپ کی رہائش گاہ آبی گزرگاہ سری نگر میں منظور ہوئی۔ کشمیری عوام کی جدوجہد کے نتیجہ میں کشمیر کا جتنا حصہ آزاد ہوا، ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ کی صدارت میں اس حصہ پر مشتمل آزاد کشمیر کی پہلی انقلابی حکومت قائم ہوئی۔ اس طرح ۳۲ سال کی عمر میں وہ آزاد کشمیر کے بانی صدر بنے۔ اس دوران دو مرتبہ (۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء) سلامتی کونسل میں کشمیر کا مقدمہ پیش کیا۔ سردار محمد ابراہیم خان چار مرتبہ مختلف اوقات میں آزاد کشمیر کے عہدہ صدارت پر فائز رہے۔ آپ نے مشکل حالات میں تحریک آزادی کشمیر کی قیادت کی، متعدد مرتبہ جیل گئے، مشکلات برداشت کیں اور ایک بھرپور زندگی گزار کر یکم اگست ۲۰۰۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔

سردار محمد ابراہیم خان کی آپ بیتی ''متاعِ زندگی'' اُن کی بھرپور زندگی کی داستان اور تحریکِ آزادی کشمیر کی ایک مستند تاریخ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے سچے اور کھرے اسلوب اور بے تکلفانہ اور بے ساختہ اظہار بیان کے باعث کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کو آگے بڑھانے والی اہم تصنیف ہے۔ دنیائے ادب میں ژان ژاک روسو کی آپ بیتی کو جس چیز نے منفرد مقام عطا کیا تھا وہ اس کی حق گوئی اور حقیقت بنانی تھی۔ روسو نے آغاز میں ہی دعویٰ کیا تھا کہ:۔

> ''میں نے ہر بات پوری سچائی اور آزادی سے بیان کی ہے۔ نہ میں نے کوئی جرم چھپایا
> اور نہ ہی اپنے میں کسی خوبی کا اضافہ کیا''۔(۱۰)

ان چند سطور میں روسو نے دراصل آپ بیتی کا ایک اہم اور سب سے بڑا وصف بیان کیا ہے اور وہ ہے، سچائی اور آزادی کے ساتھ اپنی زندگی کو بیان کرنا۔ اس پہلو سے ''متاعِ زندگی'' کا جائزہ لیا جائے تو اس کی پہلی اور سب سے بڑی خوبی یہی سامنے

آتی ہے کہ سردار محمد ابراہیم خان نے اپنی آپ بیتی میں بغیر کسی ملمع اور رنگ آمیزی کے اپنی زندگی کو بیان کیا ہے۔

سردار محمد ابراہیم خان نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی اور کٹھن حالات میں اپنی زندگی کا سفر شروع کیا اور اپنی محنت، لگن اور مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی خوبی کے باعث تحریکِ آزادی میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے آزاد کشمیر کے بانی صدر بنے۔ زندگی کے سفر میں مشکل حالات سے گزر کر، کسی بڑے مقام پر پہنچنے کے بعد انسان اکثر اپنے پرانے ایام کو بھول جاتا ہے یا اُن سے آنکھیں چرانے لگتا ہے۔ مگر سردار محمد ابراہیم خان اپنے گزرے ہوئے ایام کے سرد وگرم کو اچھی طرح یاد رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی پر پڑی ہوئی گرد کو ہٹا کر اس کا اصل چہرہ سامنے لانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے اور اپنی پُرشکوہ شخصیت پر پڑے ہوئے پردے بے تکلفی سے اٹھاتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پیدائشی عظیم الشان بنا کر نہیں پیش کرتے بلکہ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی جدوجہد کا آغاز عام انسان کی حیثیت سے کیا تھا:۔

> ''میری پیدائش پر اتنی خوشی ضرور ہوئی کہ ایک بیٹا ہوا ورنہ جہاں پہلے چھے بھائی بہن ہوں وہاں ایک اور کا ہو جانا کوئی بڑی بات نہ تھی''۔(۱۱)

> ''میں چھوٹی عمر ہی میں گھر کے معمولی کام کاج کرتا تھا۔ یہ کسی کے ذہن میں بات نہ تھی کہ میری تعلیم کی طرف کوئی خصوصی توجہ دی جائے۔ نہ ہی اپنے خاندان میں مجھے خاص حیثیت حاصل تھی''۔(۱۲)

> ''میرے والد پڑھے لکھے نہیں تھے۔ میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میرے والد کوئی بڑے زمیندار تھے یعنی لینڈ لارڈ کی حیثیت رکھتے تھے''۔(۱۳)

سردار ابراہیم اپنی زندگی کے اچھے بُرے کسی پہلو کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ روانی اور بے ساختگی میں ایسے ایسے سچ بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ جن کا اظہار کسی عام آدمی کے بس میں بھی نہیں۔ چناں چہ ننگے پاؤں سکول جانے، والد صاحب کے جابر ہونے، اپنی محبتوں، معاشقوں، اپنے رومان، اپنی پسند و ناپسند اور خوشیوں اور غموں کا تذکرہ بلاتکلف اور بے لاگ انداز میں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''مجھ سے ریاکاری نہیں ہوسکتی۔ میں جھوٹ بول سکتا ہوں مگر کسی کی تعریف اس کے منہ پر نہیں کرسکتا۔ چناں چہ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے کہ لیاقت علی خان مظفرآباد تشریف لائے۔ مجھ سے ان کا تعارف نہ کرایا جا سکا۔ کیوں کہ اس میں ان کی تعریف کی جانی تھی اس وجہ سے وہ بھی پریشان ہوئے اور مجھے تو پریشان ہونا ہی تھا''۔(۱۴)

> ''مجھ سے اپنی خوشامد نہیں سنی جاتی۔ مجھے پسینہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب

کوئی میری تعریف کرتا ہے تو میں اس کو ٹال دیتا ہوں۔ مجھے اپنے دشمن سے اتنی نفرت نہیں جتنی ریا کار سے''۔(۱۵)

''متاعِ زندگی'' سردار محمد ابراہیم کے اس بیان کی تائید کرتی ہے۔ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے انکشافِ ذات اور اظہارِ ذات کی منزلیں طے کرتے ہیں اور وہ بھی پوری سچائی کے ساتھ:۔

''میرا خیال تھا کہ میری اس (ایک انگریز خاتون) سے شادی ہو جائے گی، مگر متواتر تین سال کی دوستی کے بعد اس نے مجھے ایک بار صاف کہہ دیا کہ وہ میری بیوی بننے کے قابل نہیں ہے''۔(۱۶)

''میں نے ایک صحیح موقع کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا جب کہ دوسرے کنارے پر کھڑے سوچتے رہے''۔(۱۷)

اس طرح ''متاعِ زندگی'' کا مصنف بغیر کسی لگی لپٹی کے حقائق بیان کرتے ہوئے آگے بڑھتا جاتا ہے۔آپ بیتی ایک مشکل فن ہے۔اس میں ذات اور قلم کے درمیان توازن قائم کرنا ضروری ہوتا ہے، جو ہر ایک کے بس میں نہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:۔

''آپ بیتی نگار کبھی تو اپنی کمزوریوں کو بالکل چھپا جاتا ہے اور کبھی ''بننے'' کی کوشش میں خود کو تیس مار خان بنا کر پیش کرتا ہے اور ناکردہ گناہوں کا کریڈٹ بھی لے لیتا ہے تا کہ لوگ اس کی جرأت اور ''حق گوئی'' پر تعریف کے ڈونگرے برسائیں اور کہیں واہ واہ''۔(۱۸)

''متاعِ زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کے مصنف نے توازن کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ سے لے کر بڑے سے بڑے فیصلہ تک نہ ''بننے'' کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی اپنے گناہوں اور غلطیوں کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے بلکہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے:۔

''کشمیر کے مسئلہ پر غور کرنا محض اخباروں میں نام پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جس لیڈر کو سب سے بڑی خبر چھپوانی ہوا سے کشمیر پر بیان دینے کی ضرورت تھی''۔(۱۹)

''۱۹۴۸ء میں ریاست کے دو تہائی رقبہ میں سے بہت سا رقبہ ہم سے چھن گیا''۔(۲۰)

''ایک وزیرِ امورِ کشمیر کا کشمیر کے متعلق ذاتی علم یہ تھا کہ ان کے علم میں جھیل ولر بھی ایک افسانوی معاملہ تھا''۔(۲۱)

''میری حکومت کے پرخچے اڑا دیئے گئے۔ مجھے اپنی بیٹی کے عوض ایسی دس حکومتیں

سالہا سال کے لیے ملیں تو یہ سودا کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گا''۔(۲۲)

سردار محمد ابراہیم خان کی آپ بیتی میں انکشاف ذات اور خود کشائی کے مثبت رویوں کے ساتھ ساتھ سچائی، حقیقت بیانی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خوبیاں بھی نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ یہ آپ بیتی طنز و مزاح، منظر نگاری، شوخیانہ پن اور انشا پردازی کی خوبیاں بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔

''میرے استاد ڈاکٹر تاثیر کراکلی کی ایک عجیب سی ٹوپی پہنے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی شکل بھی تو خاصی ہیبت ناک ہوا کرتی تھی''۔(۲۳)

''نہ پوچھیے سمندر نے بغیر شکایت کیے ہمارے کیا کیا راز اپنی گود میں لیے اور اتھاہ گہرائیوں میں دبا دیئے''۔(۲۴)

میری زندگی، پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے ماحول کی پیداوار ہے۔ ان پہاڑوں کی بلندیوں، دریاؤں کی گہرائیوں اور جنگلوں کے سبز مناظر نے میری زندگی کی تصویر میں رنگ بھرے ہیں۔ اس معاملہ میں بے حد حساس ہوں۔ ہر قدرتی منظر سے محظوظ ہوتا ہوں''۔(۲۵)

''متاعِ زندگی'' اپنی ان گونا گوں خوبیوں کے باوجود فنی اعتبار سے بعض اہم اور بنیادی خامیوں سے دوچار ہے، جن میں اوّلاً اس کا اختصار ہے، دوم بعض اہم امور جن میں تحریکِ آزادی کشمیر اہم ترین ہے، کے سلسلہ میں ''متاعِ زندگی'' کے مطالعے سے تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان کی ذات سے تحریکِ آزادی کشمیر کی اہم کڑیاں وابستہ ہیں، کشمیر کی سیاست اور تحریکِ آزادی کے اہم کردار ہونے کی حیثیت سے ''متاعِ زندگی'' میں اس موضوع پر زیادہ وضاحت سے لکھا جانا چاہیے تھا۔ ان کے سیاسی حریفوں کی نسبت سیاست حاضرہ اور دیگر موضوعات پر اُنھوں نے زیادہ سنجیدگی اور وضاحت سے نہیں لکھا۔ سردار ابراہیم کی آپ بیتی میں ان کی شخصیت جس قدر بڑی ہے اس قدر کوئی اہم انکشاف بھی نہیں ہے، بلکہ وہ اس حوالے سے ایک عام فرد کی داستان لگتی ہے۔ آپ بیتی کا ایک اہم عنصر رجال کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مصنف جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے، وہ اس کی زندگی پر دیرپا اثرات چھوڑتے ہیں۔ چناں چہ ان کا متوازن تذکرہ، آپ بیتی کا اہم حصہ ہوتا ہے، مگر سردار محمد ابراہیم خان کی ''متاعِ زندگی'' میں رجال کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ علاوہ ازیں یہ سردار ابراہیم خان کی زندگی کے آخری پینتیس سال کے بیان سے بھی خالی ہے، لہٰذا جزوی ہے۔

بایں ہمہ مجموعی طور پر ''متاعِ زندگی'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی اہم کڑی ہے۔ اپنے بے لاگ طرزِ تحریر، بے ساختہ اور بے تکلف اظہارِ بیان اور انکشافِ ذات کے حوالے سے ایک منفرد اور رجحان ساز آپ بیتی ہے۔ سردار محمد ابراہیم خان

تحریکِ آزادی کشمیر کے ایک اہم کردار اور آزاد کشمیر کی سیاست کے فعال رکن، ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے والی شخصیت، ایک بڑے رہنما اور سیاست دان ہونے کے باوجود اپنی زندگی کی داستان ایک عام آدمی کی طرح عمدہ لہجے اور شریفانہ رویے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت میں نہ صرف عمدہ اضافہ ہے بلکہ ایک منفرد اور اپنی نوعیت کی واحد تصنیف ہے، جس میں سچائی، بے ساختگی اور خود کشائی کے اصولوں کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔ ایک سیاست دان کی تصنیف ہونے کے باعث ادبی معیارات پر بلند مقام کی حامل نہ سہی، لوازمے اور رجال کے تذکرے میں تشنگی کے باوصف ایک عمدہ آپ بیتی ہے۔

آتش چنار (شیخ محمد عبداللہ)

شیخ عبداللہ کشمیر کی سیاست کے ایک اہم کردار اور متحدہ کشمیر کے سب سے مقبول رہنما تھے۔ کشمیر کی تاریخ کے نازک موڑ پر اُن کے بعض فیصلوں نے پھر انھیں اس مقام بلند سے گرا دیا اور سب سے مقبول لیڈر سب سے زیادہ نامقبول اور متنازعہ شخصیت بن کر سامنے آئے۔ شیخ عبداللہ نے ایک یتیم بچے کی حیثیت سے آنکھ کھولی۔ بہت مشکل حالات میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ ایک عام مدرس سے وقت اور حالات انھیں سیاست میں لے آئے اور مختصر عرصے میں وہ کشمیری سیاست میں اس قدر شہرت کے حامل ہو گئے کہ اپنی آپ بیتی میں وہ لکھتے ہیں:۔

> ''میں کشمیری عوام کی تحریک کا ایک نشان بن گیا تھا اور میرے نام نے ایک اسطوری یعنی Legendry حیثیت اختیار کر لی تھی''۔(۲۶)

تقسیم برعظیم کے مرحلے پر بلاشبہ شیخ عبداللہ کو کشمیری عوام میں یہ حیثیت حاصل تھی۔ وہ کشمیری عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکے تھے۔ مگر اس مرحلے پر اپنی ساری بڑائی سمیت ہندو کی سازش کا شکار ہو گئے اور نہ صرف خود بلکہ کشمیری قوم کے مقدر میں غلامی کی سیاہ رات طویل کرنے کا باعث ہوئے۔ اگر وہ چاہتے تو پوری قوم ان کے ہاتھ میں تھی اور شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ بس ایک فیصلے کی دیر تھی اور آزادی مقدر بن سکتی تھی۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے، جو عظمت نظر آ رہی ہو وہ حقیقی بھی ہو۔ شہرت، مقبولیت اور اسطوری حیثیت فریب کی کوئی صورت بھی تو ہو سکتی ہے۔

> ''بعض آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کا صرف ایک دن آتا ہے اور اس دن کے ڈھلنے کے بعد ممکن ہے کہ اُن کی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں بسر ہو جائے۔ بدی اور نیکی کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں تو ننگ کائنات اور ایک قدم آگے بڑھا لیں تو اشرف المخلوقات، درمیان میں ٹھہر جائیں تو محض ہجوم آبادی۔ ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو بعض لوگوں نے یہ قدم پیچھے کی جانب اٹھایا تھا۔ تاریخ آگے بڑھ رہی تھی اور تاریخ ساز پیچھے ہٹ رہے تھے''۔(۲۷)

شیخ عبداللہ بھی انھی لوگوں میں شامل تھے، جو اس تاریخ ساز لمحے میں اپنا رُخ غلط جانب پھیر چکے تھے۔ چناں چہ ان کے اس فعل نے ماضی کے ایک مقبول ترین لیڈر کو نئے دور میں سب سے زیادہ متنازع اور ناقابلِ قبول سیاسی رہنما بنایا۔ ایک وقت تھا کہ جب شیخ عبداللہ کے ایک اشارے پر لاکھوں کشمیری جمع ہو جاتے تھے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اُن کی قبر پر فوج کا مستقل پہرا لگا دیا گیا، مبادا کوئی اس کو اکھاڑ نہ پھینکے۔ شیخ عبداللہ کی اس ڈرامائی، سنسنی خیز اور اتار چڑھاؤ سے بھرپور زندگی کی آپ بیتی اسی قدر دلچسپ، اہم اور قابلِ مطالعہ ہونا لازمی امر ہے۔ شیخ عبداللہ کی آپ بیتی ''آتش چنار'' اپنے مواد اور موضوعات، ادبی رنگ

کے باعث ہی اہم نہیں ہے بلکہ اُن کی زندگی کے عجیب وغریب نشیب وفراز کی عبرت ناک داستان بھی ہے۔

آپ بیتی کے تین اسلوب رائج ہیں۔ واحد حاضر میں لکھنا، صیغہ غائب میں لکھنا اور تیسرے شخص کو اپنی سوانح خود روایت کرنے کا انداز۔ اُردو زبان کی اکثر آپ بیتیاں پہلے اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ ''ناممکن کی جستجو'' دوسرے اور حکیم نورالدین کی آپ بیتی تیسرے اسلوب کی مثال ہے۔ شیخ عبداللہ کی آپ بیتی بھی لکھوائی ہوئی سوانح ہے، جو اُنھوں نے محمد یوسف ٹینگ کو لکھوائی۔ ''آتش چنار'' کی ادبیت خوبصورت طرزِ بیان اور عمدہ پیرائیہ اظہار میں یوسف ٹینگ ہی کی محنت کارفرما ہے مگر خود شیخ عبداللہ بھی صاحب مطالعہ، ذہین اور شعروشاعری سے وابستگی اور دلچسپی رکھنے والے تھے۔ علامہ اقبال اور غالب کے اشعار کا کثرت سے اور برمحل استعمال اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ شیخ عبداللہ کے علامہ اقبال سے نیاز مندی اور فیض احمد فیض سے دیرینہ ذاتی تعلقات معروف ہیں۔ شیخ عبداللہ کی شاعری وادب سے دلچسپی اور یوسف ٹینگ کی تحریر نے ''آتش چنار'' کے اسلوب کو خوبصورت اور دلنشیں بنا دیا ہے۔ ''آتش چنار'' کی دوسری خوبی انکشاف ذات اور اظہار ذات ہے۔ شیخ عبداللہ نے اپنے بچپن کی محرومیوں، اپنے گھرانے کی غربت، اپنی طبیعت کی جولانیوں اور سیاسی کلابازیوں کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''میری زندگی میں دھوپ چھاؤں ایک دوسرے کا اس تواتر، تسلسل اور تیزی سے پیچھا کرتے رہے ہیں کہ مجھے ستانے کی فرصت کم نصیب ہوئی۔ یہ ایک عاشق اور سپاہی کی زندگی کا تانا بانا ہے، جو بظاہر دو مختلف رنگوں سے بنا ہے، لیکن غور سے دیکھنے پر ان میں ایک باطنی ہم آہنگی نظر آئے گی۔ میری زندگی میں رومان پرست اور سپاہی کی آویزش میری جستجو کی نوعیت میں ہی مضمر تھی''۔ (۲۸)
>
> ''میرے والد میری پیدائش سے کوئی پندرہ دن پہلے وفات پا گئے تھے اور اس طرح میں نے ایک یتیم کی حیثیت سے دنیا میں آنکھ کھولی...... میرے والد نے تین نکاح کیے تھے''۔
>
> ''دیگ دان چوں کہ مشترک تھا لہٰذا اس بڑے کنبے میں ہماری پرورش ایک سوتیلے ماحول میں ہوئی''۔ (۲۹)
>
> میری والدہ کو اپنے سوتیلے بیٹوں کے طعنے اور کبھی کبھار جھڑکیاں بھی سہنا پڑتی تھیں۔ بچاری کو کبھی کبھار ذہنی کوفت کے علاوہ جسمانی اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ اس قسم کے ماحول میں ہماری تعلیم وتربیت کا جو حال ہوسکتا تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں''۔ (۳۰)

''آتش چنار'' کے مصنف کی سیاسی زندگی اگرچہ متنازعہ ہے اور ان کے بعض سیاسی فیصلے عجیب وغریب ہیں مگر اپنی عوامی

مقبولیت کے باعث شیخ عبداللہ اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں سے ہو کر انھیں اپنی غلطیاں، غلطیاں نہیں لگتیں۔ اُن کے پاس ان کے سوسو جواز موجود ہیں۔ مگر وہ اپنی غلطیوں کے برملا اظہار اور خوش دلی سے اعتراف بھی کرتے نظر آتے ہیں ''اپنے بھی خفا بیگانے بھی ناخوش''، ''اسیرِ بے تقصیر''، ''کشمیر چھوڑ دو''، ''ہاں جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت''، ''اقوامِ متحدہ بڑی طاقتوں کے شطرنج'' اور اس نوع کے دوسرے عنوانات کے تحت شیخ عبداللہ نے متعدد مقامات پر اپنی غلطیوں کا جواز مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ اعتراف بھی کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر پرویز پروازی:۔

> ''شیخ صاحب نے اس کتاب کو کشمیر کی تحریکِ آزادی کی تاریخ بنانے کی کوشش کی ہے اور تاریخ بھی وہ جو شیخ صاحب کے زاویہ نگاہ سے صحیح ہو''۔(۳۱)

''آتش چنار'' کی اہمیت اس حوالے سے زیادہ ہے کہ اس میں کشمیر کی تاریخ اور تحریک کو دوسری آپ بیتیوں کی نسبت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

> ''میں ذاتی طور پر ایک ناچیز بندہ ہوں، مگر قدرت نے مجھے ایک تقدیر ساز اور انقلاب آفریں تحریک کی ساربانی اور حدی خواہی کا شرف عطا فرمایا۔ اس لحاظ سے میری کہانی میرے عہد میں کشمیر کی آپ بیتی بن جاتی ہے اور ہماری عظیم تواریخ کا حصہ''۔(۳۲)

ان کی بیان کردہ تاریخ اور تحریک خود ان کے اپنے نقطہ نظر اور کردار کا جواز پیش کرنے والی ہے، جس سے اختلاف کرنے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ شیخ عبداللہ دوقومی نظریے کے بھی مخالف تھے۔ چناں چہ اس حوالے سے ''آتش چنار'' میں جابجا اس کے اظہار کے مواقع پید کیے ہیں اور مختلف واقعات اور حادثات سے اس کے نقصانات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

آپ بیتی کا ایک اہم حصہ تذکرہ رجال ہوتا ہے۔ رجال کے بیان میں بھی اعتدال اور توازن ضروری ہے۔ آپ بیتی نگار کو اپنے احباب، دوستوں، حریفوں اور مخالفین کا بیان بھی پوری دیانت داری اور سچائی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ دوسروں کی کردار کشی اور اُن کی شخصیت کو مسخ کر کے وہ اپنی شخصیت کو پروان نہیں چڑھاتا بلکہ کسی احساسِ محرومی کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ شیخ عبداللہ نے ''آتش چنار'' میں اس حوالے سے اعتدال کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر پرویز کے مطابق:۔

> ''شیخ صاحب نے ایک ہزار صفحات کی اس کتاب (پہلا ایڈیشن) میں اپنے ساتھیوں کی چھوٹی چھوٹی آویزشوں اور سیاسی حریفوں کی مذمت میں بہت سا وقت ضائع کیا ہے''۔(۳۳)

شیخ صاحب کے اس رویے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے انانیت کے بڑے اونچے پہاڑ پر متمکن ہو چکے ہیں:۔

''جناح صاحب نے مولوی صاحب (میر واعظ) کو کشمیر کی سیاست کا Rotten egg کہہ کر بھی پکارا''۔(۳۴)

''پچھلے صفحات میں کئی مقامات پر میر واعظ خاندان کی مجھ سے ذاتی چشمک اور تحریکِ آزادی کے بڑے دھارے سے ان کی عداوت کی طرف اشارے کیے ہیں''۔

''اس خاندان کی خاص روش نے کشمیر کی سماجی، مذہبی اور سیاسی دھارے میں بڑے گل کھلائے ہیں اور فتنے بپا کیے ہیں۔اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رجحان کی کچھ گرہیں کھول دی جائیں......''۔(۳۵)

''افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے جموں کے ہم جلیس اُسی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں، جو ہمارے حکمرانوں کا خاصا ہے''۔(۳۶)

دوسروں پر اس طرح کے طنز اور اپنے آپ کو کسی بلند مقام سے ہو کر مخاطب کرنے کا انداز شیخ عبداللہ کی ''آتش چنار'' میں جا بجا ہے۔

المختصر شیخ عبداللہ کی آپ بیتی ''آتش چنار'' اگر چہ اپنے خوبصورت اسلوب بیان، ادبیت، بھر پور بیانیے اور نفس مضمون کی سنسنی کے حوالے سے ایک دلچسپ اور قابلِ مطالعہ لوازمے کی حامل ہے، مگر بعض واقعات کے بار بار بیان سے جہاں اس کی وحدت مجروح ہوتی ہے وہاں ضخامت بھی غیر ضروری حد تک بڑھ گئی ہے۔ پوری کتاب شیخ عبداللہ نے اپنی سیاسی غلطیوں اور بعض غلط فیصلوں کو درست ثابت کرنے کے لیے طویل دلائل کی نذر کر دی ہے۔ بچپن کی محرومیوں کے باعث اپنے دوست و احباب سے لے کر سیاسی حریفوں تک کی کردار کشی اور انھیں کم تر ثابت کرنے میں بعض مقامات پر تضحیک آمیز انداز اپنانے کی صورت حال سے دوچار نظر آتی ہے۔ ''آتش چنار'' میں اپنی مرضی کی تاریخ بنانے اور اپنے حریفوں بالخصوص چودھری غلام عباس کی ''کشمکش'' کا بھر پور جواب دینے، تحریکِ آزادی کشمیر اور کشمیر کے مستقبل کے حوالے سے من چاہے نظریات کی جوازیت پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل (شورش کاشمیری)

شورش کاشمیری کی آپ بیتی ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل'' کشمیر کی اُردو آپ بیتی کی روایت کا حصہ ان معنوں میں ہے کہ شورش کاشمیری کشمیری الاصل تھے۔ شورش نہ صرف اپنے نام کے ساتھ کاشمیری کا لفظ مستقل حصہ بنائے ہوئے تھے بلکہ اپنے کشمیری ہونے پر برملا اظہار کرتے ہیں:۔

''وطن ہمارا کشمیر اور گوت ''ڈار'' ہے جو کشمیری برہمنوں کی ایک شاخ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈار اصلاً در تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ڈار راجپوتوں کا ایک قبیلہ ہے''۔ (۳۷)

کشمیری مشاہرین کی آپ بیتیاں بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں۔ پہلی قسم ایسی شخصیات کی آپ بیتیوں کی ہے، جن کی پیدائش کشمیر میں ہوئی اور کشمیر کے کسی بھی حصے میں ہی رہ کر اپنی خدمات سرانجام دیں۔ ان کی دلچسپیوں کے حوالے تو مختلف رہے مگر میدان کار کشمیر کی سرزمین ہی رہی۔ دوسری قسم کی آپ بیتیاں اُن شخصیات کی ہیں جو اصلاً کشمیری تھے، مگر کسی وجہ سے ہجرت کر کے پاکستان یا ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ پھر وہیں سیاست، علم و ادب اور دوسرے میدانوں میں بلند مقام حاصل کیا۔ ایسی شخصیات میں پنڈت نہرو، شورش کاشمیری، قدرت اللہ شہاب سے رشید امجد تک متعدد اصحاب ہیں جنھوں نے آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ شورش کاشمیری کا شمار دوسری قسم کے مشاہرین میں ہوتا ہے۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کے حوالے سے ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل'' کا مطالعہ اس حوالے سے اہم ہے کہ قبل ازیں زیرِ مطالعہ آپ بیتیوں ''کشمکش''، ''متاعِ زندگی'' اور ''آتش چنار'' کی نسبت نئے حوالوں اور نئے امکانات کو وا کرتی ہے۔ پچھلی تینوں آپ بیتیاں سرزمین کشمیر میں لکھی گئیں۔ چناں چہ کشمیر کی تاریخ، جغرافیہ، سیاست اور منظر کو ہمارے سامنے لاتی ہیں، جب کہ شورش کاشمیری ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے اور سیاست، علم و ادب، تحریر و تقریر میں نام کمایا۔ ان کی تصنیف ایک ایسی جگہ تصنیف ہوئی ہے جہاں اُردو آپ بیتی کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ چناں چہ وہ دوسری کشمیری مشاہرین کی آپ بیتیوں کی نسبت ایک نئی جہت سامنے لاتی ہے۔

شورش کاشمیری کے آباؤ اجداد سری نگر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہوئے۔ بعد ازاں شورش کے دادا لاہور آ گئے۔ پہلے شال اور پشمینہ کا کاروبار کرتے رہے پھر کلچہ، باقر خانی اور نمکین کشمیری چائے کا کاروبار شروع کر دیا۔ شورش نے اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہی حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں میٹرک کیا تو یہ دور برعظیم میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک کا تھا۔ انھوں نے سیاست میں ایک طالب علم کی حیثیت سے مختلف جلسوں، جلوسوں کی صورت میں شامل ہو کر حصہ لینا شروع کیا۔ مسجد شہید گنج کے واقعے کے بعد احتجاج کرتے ہوئے بڑے بڑے لیڈر گرفتار ہوئے تو جو نوجوان اس تحریک میں سامنے آئے اُن میں شورش کاشمیری سب سے نمایاں تھے۔ شورش کاشمیری نے بعد ازاں سید عطا اللہ شاہ بخاری اور احرار سے وابستگی اختیار کی اور عملی سیاست

کے ذریعے بھرپور زندگی گزاری۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر، شاعر، صحافی اور ادیب تھے۔ بہت سے اخبارات میں کام کیا۔ ''چٹان'' اخبار نکالا۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل'' میں اگرچہ شورش کاشمیری کے خطابت اور دوسری بعض کتب کی طرح کا طمطراق نہیں ہے مگر ایک متحرک اور سرگرم کشمیری کی داستان ہے، جو اپنے وطن سے دور ایک نئی سرزمین پر اپنے آپ کو منوا کر مشاہیر میں شامل ہوتا ہے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ کشمیری مہاجرین جہاں جہاں گئے وہ عبقری اور نابغہ بنے۔ چناں چہ ان کشمیری نابغوں کا تذکرہ اپنی آپ بیتی میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''سیاست میں علامہ اقبال، پنڈت موتی لال، پنڈت جواہر لال، ڈاکٹر سیف اللہ کچلو، سر تیج بہادر سپرو اس کان کے ہیرے تھے۔ خطابت میں سید عطا اللہ شاہ بخاری کا ہم پایہ آج تک پیدا نہ ہو سکا، ان کے اجداد کشمیری تھے۔ علامہ انور شاہ کا ہمہ مرتبہ فن حدیث میں اب تک دیکھا نہ گیا۔ پہلوانی میں رستم زماں گاماں اور ان کا خاندان، ڈرامہ میں آغا حشر، افسانہ میں منٹو، کہانی میں کرشن چندر، نظم میں میرا جی یہ سب اسی لڑی کے موتی ہیں''۔(۳۸)

چناں چہ اس لڑی کے وہ خود بھی ایک موتی بننے کے لیے سیاست، صحافت، شعر و ادب میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل'' کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شورش نے اپنے آپ کو 'بنانے' کی کوشش کی ہے اور نہ ہی اپنے حالات پر مصنوعی رنگ آمیزی کی۔ شورش نے خوب صورت اور سچے انداز میں اپنی زندگی کا احوال صاف صاف بیان کیا ہے۔ شورش کاشمیری کی آپ بیتی اس کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں کرتی مگر ''پس دیوار زنداں'' اور اُن کی دوسری تصانیف کے ساتھ مل کر ان کی پوری زندگی سامنے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی لکھتے ہیں:۔

> ''شورش کاشمیری نے اپنے خد و خال چھپانے یا ان پر غازہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اوّل و آخر کانگریسی اور احراری تھے اور رہے''۔(۳۹)

شورش کاشمیری ایک معروف ادیب، خطیب، شاعر اور صحافی تھے۔ ان کے سامنے آپ بیتی کے نمونے موجود تھے۔ چناں چہ ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل'' کو اسلوب کی دلکشی، پیشکش کی خوبصورتی اور رجال کے متوازن تذکرے نے ایک عمدہ آپ بیتی کی صف میں شامل کر دیا ہے۔

شورش کاشمیری احراری تھے اور سیاست میں سرگرم رہے۔ ان کے علاوہ بھی اُن کی دلچسپیوں کے بہت سے میدان رہے، جن میں وہ مصروف کار تھے لیکن اپنی آپ بیتی کو غیر ضروری طول نہیں دیا۔ واقعات کا بہترین چناؤ، اچھے اسلوب میں بیان

اور دلچسپ اور خوبصورت پیرائیہ بیان اور مناسب ضخامت میں انھوں نے اپنی سرگزشت کو سمیٹا ہے۔ ''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل'' اُردو آپ بیتی کے سرمائے میں اگرچہ کوئی منفرد اور بہت نمایاں تصنیف نہیں ہے مگر کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی اہم کڑی اور اس سلسلہ کی ایک عمدہ تصنیف ہے، جس میں شورش کاشمیری نے اپنے منفرد اسلوب بیان میں نہ صرف اپنی ذات بلکہ بیسویں صدی کے درمیانی عشروں کی برعظیم کی سیاست اور تحریکِ آزادی کی داستان بھی بیان کر دی ہے۔ تحریکِ پاکستان، دو قومی نظریے کے حوالے سے اپنے اور اپنی جماعت کے مؤقف سے آگاہ کیا ہے اور اس پر اپنے دلائل سے بھی مطلع، مگر چوں کہ وہ بنیادی طور پر ایک تجزیہ کار اور صحافی تھے لہٰذا انھوں نے اپنی نظریاتی وابستگیوں سے الگ ہو کر حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغِ محفل'' کا اختتام ان سطور پر ہوتا ہے:۔

> ''ابھی پو نہ پھٹی تھی کہ 'الصلوٰۃ خیر من النوم' کی دلفریب صدا بلند ہو رہی تھی، اللہ بڑا ہے کا اعلان ہو رہا تھا۔ میں نماز پڑھ کر سو گیا۔ دوبارہ اٹھا تو ریڈیو بج رہا تھا ''یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے'' قاری قرآن پاک کا ترجمہ سنا رہا تھا ''اُن کو مردہ مت کہو، جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں، وہ زندہ ہیں لیکن تمھیں اس کا شعور نہیں''۔ (۴۰)

ولی عہد (ڈاکٹر کرن سنگھ)

''ولی عہد'' سابق مہاراجا کشمیر کرن سنگھ کی آپ بیتی ہے، جو انھوں نے انگریزی میں Heir Apparant کے نام سے تحریر کی ہے۔ اُردو ترجمہ غلام نبی شیدا نے کیا ہے، جسے گلشن پبلشرز سری نگر نے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ، ہری سنگھ کے بیٹے ہیں۔ ہری سنگھ تقسیم برعظیم کے موقع پر کشمیر کا مہاراجا تھا۔ تاریخ کشمیر کے اس نازک موڑ پر مہاراجا کا کردار کئی حوالوں سے اہم اور متنازعہ ہے۔ اُسے ایک طرف شخصی حکومت کا خاتمہ ہوتا نظر آرہا تھا، دوسری طرف ریاستی عوام کی خواہشات اور دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتے تھے اور تیسری طرف بھارتی حکومت اور ہندو کے ساتھ اس کی مذہبی وابستگی تھی۔ چناں چہ کشمکش میں مبتلا وہ پہلے پاکستان کے ساتھ معاہدہ قائمہ کرتا ہے اور پھر بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق۔ بہرحال مہاراجا ہری سنگھ کے فیصلوں اور اقدامات نے ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہری سنگھ کا الحاق ہندوستان کا فیصلہ بھی اُس کے اقتدار کو دائمی نہ بنا سکا۔ بھارت نے پہلے ہری سنگھ کو معزول کیا اور ان کے بیٹے کرن سنگھ کو کشمیر کا صدر بنایا اور پھر ریاست کشمیر کو اپنا حصہ بنانے کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔

کرن سنگھ نے کشمیر یونی ورسٹی سے بی۔اے، ایم۔اے اور بعد ازاں پی ایچ ڈی کیا۔ اُن کی آپ بیتی سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال فرد کا تاثر واضح طور پر اُبھرتا ہے۔ ''ولی عہد'' میں کرن سنگھ نے صاف گوئی اور کھرے لہجے میں نہ صرف اپنی ذاتی زندگی اور خاندان کی غلطیوں کوتاہیوں کا تذکرہ کیا ہے بلکہ سیاست کشمیر کے کئی اہم واقعات سے پردہ بھی اٹھایا ہے۔ اپنے والدین کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''میری والدہ کانگڑہ کے گاؤں کی ایک دیہاتی لڑکی تھی جب کہ میرے والد ہندوستان کی پانچ سو ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کے حکمران تھے۔ میری ماں بہت مذہبی تھیں جب کہ میرے والد آخر تک درحقیقت خدا کے منکر رہے۔ میری والدہ شفیق اور ملنسار تھیں اور بچوں سے پیار کرتی تھیں لیکن میرے والد سخت مزاج، مخصوص درباریوں اور چند دوستوں میں گھومتے تھے۔ میری ماں گفتگو میں بہت ماہر تھیں لیکن میرے والد اتنے خوف ناک کہ ان کی موجودگی میں عام قسم کی گفتگو ناممکن تھی''۔ (۴۱)

کرن سنگھ، شیخ عبداللہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے خلاف اپنی نفرت چھپا نہیں پاتے۔ شیخ عبداللہ کو تحقیر سے ''ایک غیر معروف سکول ماسٹر'' لکھتے ہیں۔ البتہ ''ولی عہد'' میں شامل شیخ عبداللہ کا مہاراجا کے نام ''مشروط معافی نامہ'' شیخ عبداللہ کے ظاہری طمطراق اور ''آتش چنار'' کے احساسِ برتری سے لبریز لب و لہجے کا حقیقی رُخ سامنے لاتا ہے۔ اس اہم معافی نامے کے بعض حصے ''ولی عہد'' سے بذیل ہیں:۔

''حضور کا اقبال بلند ہو۔ ماضی کے بہت سے افسوس ناک واقعات زیادہ تر غلط فہمیوں کا نتیجہ تھے، جواب لگتا ہے مفاد خصوصی رکھنے والے لوگوں نے خاص مفاد حاصل کرنے کی غرض سے جان بوجھ کر پیدا کی تھیں۔ سابقہ وزیرِ اعظم آر۔ بی رام چند کاک نے اپنی فتنہ انگیز حرکتوں اور ماہرانہ چالوں کے ذریعے ان غلط فہمیوں کو انتہا تک پہنچایا اور کسی حد تک چاہے عارضی طور پر ہی سہی، اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے۔ خدا کا شکر ہے کہ حضور اور ریاست کے یہ تمام دشمن آج منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

''جو کچھ بھی ماضی میں ہوا اُس کے باوجود میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یا میری جماعت نے کبھی کسی ایسے جذبے کو دل میں جگہ نہیں دی جس کا مقصد سرکار کے تخت یا خاندان سے بے وفائی ہو''۔

''میں سرکار کو اپنی اور اپنی تنظیم کی بھرپور حمایت کا یقین دلاتا ہوں۔ یہی نہیں میں سرکار کو یقین دلاتا ہوں کہ ریاست کے اندر یا ریاست کے باہر کی کوئی جماعت جو ہمارے مقاصد حاصل کرنے والی کوشش میں رکاوٹ پیدا کرنے کی سعی کرے گی ہم اپنا دشمن سمجھیں گے اور اسی لحاظ سے اس کے ساتھ نپٹا جائے گا''۔

''اس خط کو ختم کرنے سے پہلے میں سرکار کو اپنی ثابت قدمی و وفاداری کا یقین دلاتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا سرکار کی سرپرستی میں امن، بہبودی اور اچھی حکومت کا دور لائے جو بے مثال اور دوسروں کے لیے قابلِ تقلید ہو''۔ (۴۲)

''ولی عہد'' میں کئی سیاسی حوالے جس طور ساتھ آئے ہیں وہ تصویر کا ایک دوسرا رخ سامنے لاتے ہیں۔ چند حوالے درج کیے جاتے ہیں:۔

''ماؤنٹ بیٹن کے رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے ان سے ملاقات کا وقت مقرر کر دیا اور یہ (مہاراجا) بہانہ کر کے ملاقات سے اُٹھ کر چلے آئے کہ انھیں اچانک قولنج (پیٹ درد) کا شدید حملہ ہوا ہے''۔ (۴۳)

''میں پرانے نظام کا آخری نمائندہ تھا، جو لوگوں کی منظوری سے نئے نظام میں پہلا خادم بن رہا تھا''۔ (۴۴)

''شیخ عبداللہ خود بھی ۲۵/ اکتوبر کو ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی چلے گئے تھے۔ یعنی

ہمارے سری نگر چھوڑنے سے پہلے اور تب تک واپس نہیں لوٹے جب تک ہندوستان نے فوج نہیں بھیجی تھی''۔(۴۵)

کرن سنگھ کی آپ بیتی میں اس طرح کے متعدد انکشافات موجود ہیں، جس سے اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔اس حوالے سے اس کتاب میں شیخ عبداللہ کی ''آتش چنار'' کے مقابلے میں سچائی اور حقیقت کو زیادہ بہتر طریقے سے سامنے لایا ہے۔ ایک حکمران اور خاندانی راج کے ایک فرد سے اس طرح کی صاف گوئی اور حقیقت بیانی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔اپنی ان خوبیوں کی بنا پر ''ولی عہد'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی اہم تصنیف ہے، جس میں کرن سنگھ کی ذاتی زندگی کا احوال، انکشافِ ذات اور خود کشائی کے ساتھ ساتھ تاریخ کے کئی گوشے بھی وا ہوتے ہیں۔

''ولی عہد'' میں ابواب بندی کا التزام نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کا آغاز ایک کہانی، ناول یا داستان کی طرح خوب صورت انداز میں ہوتا ہے اور کرن سنگھ کی زندگی اور اس کے ساتھ جڑے واقعات کو سمیٹے ہوئے بڑھتی چلی جاتی ہے:۔

''ساحل سمندر پر واقع کیناس کا تفریحی قصبہ اگلے وقتوں میں یورپ اور ہندوستان کی اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والوں کی ہمیشہ ایک پسندیدہ آماجگاہ رہا۔مشہور کوئے، ڈی زور کے ساتھ جو قابل غور سیاحی قیام گاہیں تعمیر کی گئیں ان میں ہوٹل مارٹینز بھی شامل ہے''۔(۴۶)

بایں ہمہ ''ولی عہد'' ایک ادھوری آپ بیتی ہے۔ یہ کرن سنگھ کی زندگی کے ابتدائی تیئیس سال کی داستان ہے، جس میں وہ صدر ریاست کے عہدہ پر پہنچے اور کئی تاریخی واقعات کا سامنا کیا۔کتاب دلچسپ، رواں اور خوب صورت اسلوب میں تحریر کی گئی ہے۔''ولی عہد'' کرن سنگھ کے بطور صدر ریاست، وزیرِ اعظم شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد جن سطور پر اختتام پذیر ہوتی ہے وہ قارئین کو اگلے حصے کے لیے بے تاب کرتی ہے۔

''اس رات میں لمحہ بھر کے لیے نہیں سویا اور حیرت انگیز طور پر میں نے اپنے آپ کو لاتعلقی اور ہلکی کیفیت میں پایا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا وہ قومی بھلائی کے لیے تھا اور اگر قوم کو فائدہ پہنچے تو سبھی خطرات لیے جاسکتے ہیں۔آشا بھی ساری رات اپنے کمرے میں بے چینی سے جاگی تھی۔آہستہ آہستہ میں نے سیڑھیاں چڑھیں اور کمرے میں داخل ہوا۔کام ختم ہو چکا ہے۔ میں نے کہا اور ہم دونوں مسکرائے۔ان کا ستر واں اور میرا تیئیسواں (۲۳) سال چل رہا ہے۔ بستر کو چھونے سے پہلے ہی میں تقریباً سو چکا تھا''۔(۴۷)

حوالہ جات

۱۔ ظہور الدین، ڈاکٹر: جموں میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا، مشمولہ ششماہی مجلّہ ''تسلسل''، جلد ۱، شمارہ ۱۔ شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی جموں توی، جولائی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۶

۲۔ خوش دیو مینی: پونچھ میں اُردو ادب کا ارتقا، مشمولہ، ششماہی مجلّہ ''تسلسل''، جلد ۱، شمارہ ۱

۳۔ بشیر احمد قریشی: قائد کشمیر۔ ناشر عمر قریشی راولا کوٹ، چوتھا ایڈیشن ۱۹۹۴ء، ص ۳۰۰

۴۔ غلام عباس، چودھری: کشمکش۔ راولپنڈی: فیروز سنز ۱۹۵۴ء، ص ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۴۴

۶۔ ایضاً، ص ۹

۷۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۸۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۹۔ عبد المجید سالک: پیش لفظ، کشمکش۔ راولپنڈی: فیروز سنز ۱۹۵۴ء، ص ۴

۱۰۔ ژان ژاک روسو: اعترافات، اُردو ترجمہ امجد علی بھٹی۔ لاہور: بک ہوم ۲۰۰۶ء، ص ۸

۱۱۔ محمد ابراہیم خان، سردار: متاعِ زندگی۔ راولا کوٹ: دھرتی پبلی کیشنز، بار دوم، سنہ ندارد، ص ۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۹

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۸۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۱۸۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر: وجہی سے عبد الحق تک۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء، ص ۳۰۱

۱۹۔ محمد ابراہیم خان، سردار: متاعِ زندگی۔ ص ۱۷۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۲۶۔ شیخ عبد اللہ: آتش چنار۔ راولپنڈی: رائل پبلشنگ کمپنی ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۱

۲۷۔ مختار مسعود: آوازِ دوست۔ لاہور: فیروز سنز، اٹھارہواں ایڈیشن، ۱۹۹۷ء، ص ۴۴

۲۸۔ شیخ عبداللہ: آتش چنار، ص ۲۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۱۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر: آتش چنار، مشمولہ پس نوشت۔ لاہور: نیاز مانہ پبلی کیشنز: س، ن، ص ۱۰۶

۳۲۔ شیخ عبداللہ: آتش چنار۔ پیش لفظ

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۳۴۔ شیخ عبداللہ: آتش چنار۔ ص ۵۰۷

۳۵۔ ایضاً، ۵۰۳

۳۶۔ ایضاً، ۴۹۵

۳۷۔ شورش کاشمیری: بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل۔ لاہور: مطبوعات چٹان لمیٹڈ، اشاعت دوم، ۱۹۸۸ء، ص ۹

۳۸۔ ایضا! ص ۵۰

۳۹۔ پرویز پروازی: پس نوشت اور پس پس نوشت۔ ص ۴

۴۰۔ شورش کاشمیری: بوئے گل، نالہ دل، دودِ چراغ محفل۔ ص ۴۵۳

۴۱۔ یوراج کرن سنگھ: ولی عہد (ترجمہ، غلام نبی شیدا)۔ سری نگر: گلشن پبلشرز، گاؤ کدل، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۷۵، ۱۷۶

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۱۵

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۰

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۵۴

فصل دوم

ترقی یافتہ دور

۱۹۷۱ء تا ۱۹۹۰ء

تاریخ کی گزرگاہوں میں سرسبز و شاداب پہاڑوں اور آبشاروں کی دھرتی کشمیر یہاں کے باسیوں کے لیے کئی بار جہنم زار بنی۔ ملکی اور غیر ملکی سامراج، قحط، زلزلے، سیلاب اور دوسری آفات سماوی اس کی بہاروں کو غارت کرتے رہے۔ کشمیر کے عظیم فرزند، تاریخ اور جغرافیے پر نظر رکھنے والے اور قوموں کے عروج و زوال کے آشنا فلسفی و شاعر، علامہ محمد اقبال نے کشمیریوں کی اس بدقسمتی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ پہاڑوں کی سرحدیں ہی ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں:۔

زیستن اندر حدِ ساحل حد است

ساحل ما سنگے اندر راہ ما است

کشمیریوں کی اس ازلی بدقسمتی کو دُور کرنے کا وقت ۱۹۴۷ء کے سال آیا تھا، مگر یہ موقع بھی ہندو کی مکاری اور کشمیری قیادت کی سادگی اور ذاتی اغراض کے باعث گنوا دیا گیا۔ بعدازاں وقت اور حالات نے شیخ عبداللہ پر یہ عقدہ وا کر دیا تھا کہ اس نے ہندو دوستوں پر بھروسہ کر کے کشمیر کے مستقبل کو تاریک کیا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے نام جیل سے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''میں نے کئی مواقع پر بھارتی حکومت پر مسئلہ کشمیر پر پاکستان سے سمجھوتہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کیوں کہ مسئلے کے حل کے بغیر کشمیر میں پُر امن ترقی ممکن نہیں تھی۔ بھارتی قیادت کا ردّعمل میری توقعات کے یکسر خلاف تھا''۔(۱)

لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ چناں چہ انھیں اپنے موَقف سے ہٹ کر بھارتی حکام سے سمجھوتہ کرنا پڑا، بھارت نت نئے حربوں سے کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط کرتا رہا اور پھر بالآخر اُسے آئینی طور پر بھی اٹوٹ انگ بنانے کے لیے اقدامات کیے۔ اس دوران شیخ عبداللہ کو جیل میں ڈال کر بخشی غلام محمد، جی ایم صادق اور سید میر کو وزیراعظم/ وزیرِ اعلیٰ بنایا گیا۔

ستر کی دھائی میں پہلے میر قاسم اور پھر شیخ عبداللہ وزیرِ اعلیٰ کے عہدے پر بٹھائے گئے۔ اب کی بار شیخ عبداللہ کشمیر خود مختار اور آزاد مملکت کے سارے خواب دریا برد کر کے ایک ایسے معاہدے کے تحت برسرِ اقتدار آئے، جس کے مطابق وہ بھارت کے آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے مطابق بھارت کی بالادستی قبول کر کے کشمیر کو بھارت کا حصہ گردانتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ بنے۔ یہ ''اندرا عبداللہ معاہدہ'' تھا۔ اس پر نہ صرف پاکستان، آزاد کشمیر بلکہ خود مقبوضہ کشمیر میں بھی شدید ردّعمل سامنے آیا۔

ستر کی دہائی کشمیر میں مایوسی کی انتہائی کیفیت کی دہائی تھی لیکن اسی مایوسی اور پریشانی کی کیفیت سے جہاں ایک طرف سیاسی سطح پر سید علی گیلانی کی صورت میں تحریکِ حریت کے علمبردار سامنے آئے وہاں مایوس کشمیری نوجوانوں نے تحریکِ مزاحمت شروع کرنے کی منصوبہ بندی کا آغاز کیا۔ ان نوجوانوں میں فاروق رحمانی، فضل الحق قریشی، نذیر احمد وانی، شبیر شاہ اور دوسرے سیاسی کارکن شامل تھے۔ مقبول بٹ اور ان کے ساتھیوں نے بھارتی جہازوں کے اغوا سمیت دوسری مسلح کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اب کشمیر کے عوام اور رہنماؤں پر یہ آشکار ہو چکا تھا کہ کشمیر کا بھارت کے ساتھ جوڑا جانا ایک سوچی سمجھی سازش اور کشمیریوں

کے مستقبل کو تاریک کرنے کا باعث ہوا۔ عارف بہار اس صورت حال کے حوالے سے رقم طراز ہیں:۔

> ''کشمیری سیاسی کارکنوں اور دانشوروں نے اس تاثر کو گہرا کیا کہ بھارت نے کشمیر کو عالم اسلام کے سماجی ماحول سے کاٹ کر دہلی اور امرتسر کے ماحول کے ساتھ غیر فطری جوڑ رکھا ہے۔ اس غیر فطری پیوند کاری سے نہ صرف کشمیر میں معاشی ترقی کے احکامات معدوم ہو کر رہ گئے بلکہ کشمیریوں کی ذہنی ترقی کا سفر بھی رک گیا۔ کیوں کہ تاریخ کے ہر دور میں کشمیر کے فطری دھاروں کا رُخ شمال کی جانب رہا۔ سری نگر سے راولپنڈی، پشاور سے کابل، تہران اور بخارا اور سمر قند تک کسی دور میں کشمیریوں کا 'طاہر لاہوتی' اپنے رزق، تعلیمی اور معاشی ترقی کے لیے ان لامحدود اور لامتناہی راستوں پر بلند اڑانیں بھرتا چلا جاتا تھا۔ لیکن کشمیر پر بھارت کے قبضے کے بعد بلند پروازی کا یہ سفر دہلی تک محدود ہو کر رہ گیا اور کشمیریوں نے غصے اور ردّعمل میں خود کو درّہ بانہال کے پیچھے محصور کر لیا''۔(۲)

چناں چہ اسی احساس نے انھیں بھارت کے خلاف ایک نئی تحریک مزاحمت اور تحریکِ جہاد کی طرف راغب کیا اور وہ اس کے لیے منصوبہ بندی میں مشغول ہو گئے۔ اسی منصوبہ بندی کے نتیجہ میں اسّی کی دہائی کے اختتام پر مسلح جدوجہد شروع ہوئی۔

اِدھر آزاد کشمیر میں قائم ہونے والی انقلابی حکومت، جس کا مقصد وجود کشمیر کی مکمل آزادی تھا بھی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔ یہاں پر اقتدار کی جنگ نے وہ گل کھلائے کہ کسی کو عظیم مقاصد یاد نہیں رہے۔ کشمیریوں کی اکثریت کے دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ کشمیر کی مسلمہ قیادت الحاق پاکستان کی قرارداد کی صورت میں اپنے مستقبل کے فیصلہ کا اعلان تقسیم برّعظیم کے فوراً بعد ہی کر چکی تھی، مگر المیہ کا ایک بھیانک رُخ یہ ہے کہ پاکستان کی جانب سے آزاد کشمیر کے معاملات میں دخل انداز وزارتِ امورِ کشمیر اقتدار کے اس کھیل کی اصل کردار تھی۔ وزارتِ امور کشمیر نے کشمیریوں کو متحد کر کے اصل مقصد کے لیے تیار کرنے کے بجائے کشمیری لیڈروں کو لڑانے، ہٹانے، بٹھانے، اختلافات کو ہوا دینے کا کردار ادا کیا۔ وزارتِ امور کشمیر کے اس کردار کا جائزہ لیتے ہوئے سردار مختار خان اپنی کتاب ''آزادی کا خوابِ پریشاں'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''آزاد کشمیر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نے آزاد کشمیر کے عوام کو اپنے اعتماد میں لینے کے بجائے نوکر شاہی کو آزاد کشمیر پر مسلط کرتے ہوئے وزارت امور کشمیر کو قائم کیا۔ اس وزارت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آزاد کشمیر کی لیڈر شپ میں پھوٹ ڈال کر اس متحدہ قوت کو تتر بتر کر دیا، جو جنگ آزادی کے دوران

مشترکہ نصب العین کے باعث ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ناقابلِ تسخیر تھی۔ وزارت امور کشمیر نے کشمیری لیڈروں میں اقتدار کی رسّہ کشی کی داغ بیل ڈالی۔ سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی ایک کھیپ تیار کی، جو اس وزارت کی ہاں میں ہاں ملاتی رہے اور اس کے عوض ماہوار وظیفہ وصول کرتی رہے۔ چناں چہ آزاد کشمیر کے عوام کی خواہشات کے خلاف ان پر حکومت کے لیے وزارت امور کشمیر اپنی مرضی سے حکمرانوں کو نامزد کرتی اور ان وظیفہ خور لیڈروں سے ان نامزدگیوں کے حق میں خیر مقدم کے بیانات کو عوامی تائید و حمایت کا سرٹیفکیٹ چپکا کر پردہ ڈالتی رہی اور عوامی احتجاج کو بغاوت اور پاکستان دشمنی قرار دے کر فوج اور پولیس کو عوام کو دبانے کے لیے استعمال کرتی رہی............ یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات تک جاری رہا''۔(۳)

اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں مارشل لاؤں کے تواتر سے آنے، بنتے بگڑتے تصورات زندگی، قیامِ پاکستان کے مقاصد سے غداری اور کلمہ لا الہٰ الاّ اللہ سے دوری کے سبب کشمیر کی آزادی کا نصب العین بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

۱۹۷۳ء میں پاکستان کا پہلا متفقہ آئین تیار ہوا۔ چناں چہ اس طرز پر ایکٹ ۱۹۷۴ء کے نام سے آزاد کشمیر کا نیا عبوری آئین تیار کیا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں پاکستان میں جنرل محمد ضیاالحق کے مارشل لا کے بعد کشمیر میں بھی جمہوریت کی بساط لپیٹ دی گئی اور پہلے میجر جنرل عبدالرحمان خان اور بعد ازاں بریگیڈیر محمد حیات خان چیف ایگزیکٹو بنے۔ یوں کشمیر کے دونوں حصوں میں ہونے والی اقتدار کے حصول کے لیے ہونے والی اس رسہ کشی اور ذاتی مفادات کی جنگ نے کشمیر کے لیے نعمت آزادی کو اس قدر دور کر دیا کہ اب آزادی کی باتیں ہی عجیب لگنے لگیں۔ بقول جی ایم میر:۔

> ''تاریخ نے اقبال کی اس ''قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ'' کی آزادی اور اقوامِ عالم میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے بار بار مواقع پیدا کیے، لیکن اس کے رہنماؤں نے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ان مواقع کو ضائع کر دیا۔ اب جو کچھ اس قوم کے ساتھ ہو رہا ہے وہ تاریخ کا انتقام ہے''۔(۴)

تاریخ ادب کے مطالعے سے عیاں کہ جب بھی کسی قوم و ملک میں مایوسیوں، ناامیدوں اور زوال و نکبت کے آثار نمایاں ہوں اس عہد میں تخلیق ہونے والا ادب لازوال اور منفرد ہوا کرتا ہے۔ خطۂ کشمیر میں بھی اس دورانیے (۱۹۷۰ءتا۱۹۹۰ء) میں مختلف اصناف کے بہترین نمونے منظر عام پر آئے۔ تقسیم برعظیم کے نتیجہ میں کشمیر کے اندر پیدا ہونے والے سیاسی منظر نامے کے باعث کشمیر ادب کے اُفق پر اگر چہ مایوسی کے بادل مزید گہرے ہوئے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر کے دونوں

حصوں میں ادبی حلقے اب سنبھل چکے تھے۔ سرحد کے پار جموں وکشمیر میں کلچرل اکیڈمی کے زیرِ انتظام شائع ہونے والے ادبی جریدے ''شیرازہ'' اور ''ہمارا ادب'' نے کئی عمدہ نمبر منظرِ عام پر لائے، جن میں مشاہیر نمبر، جموں وکشمیر نمبر، شخصیات نمبر، اولیا نمبر قابلِ ذکر ہیں۔ مرحوم شمیم کے زیرِ ادارت ''تعمیر'' نے بھی کئی عمدہ نمبر شائع کیے۔ اسی طرح سری نگر یونی ورسٹی کے ''ادبیات'' اور بعد ازاں ''بازیافت'' نے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کو منظرِ عام پر لایا۔ امر سنگھ کالج کا سالانہ میگزین ''لالہ رخ''، سری پرتاب سنگھ کالج کے ''پرتاب میگزین''، گرلز کالج کا ''زون'' اور اسلامیہ کالج کا ''بادم واَر'' بھی نوجوانوں میں اُردو ادب کے فروغ کا باعث ہوئے۔ اُردو ادب کی خدمت میں اس حصے کے درجنوں اخبارات، ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی ویژن کی ادبی خدمات بھی اہم ہیں۔ اس حوالے سے نشاط انصاری رقم طراز ہیں:۔

> ''اُردو نثر کے نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں جموں وکشمیر کے دونوں خطوں میں قابلِ تعریف حد تک ادبی ترقی کی منزلیں ان دہائیوں کے دوران طے ہو چکی ہیں اور اس طرح اُردو نثر نگاری فن اور موضوع دونوں کے اعتبار سے وسعت، تنوع اور نئے افکار سے ہم کنار ہو رہی ہے''۔(۵)

پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد ''جموں میں اُردو زبان و ادب'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ریاست میں اُردو زبان و ادب کو سب سے زیادہ استحکام ۱۹۷۵ء میں حاصل ہوا۔ اس دور کی قیادت میں ریاستی سرکار نے زبانوں سے متعلق جو پالیسی اختیار کی وہ قابلِ ستائش ہے۔ اُردو اور ہندی کو لازمی مضامین قرار دے کر خطۂ جموں میں اُردو کے فروغ کے یہ امکانات پیدا کیے''۔(۶)

اس دورانیے میں آزاد کشمیر میں انفرادی طور پر علمی ادبی شخصیات، مختلف ادبی انجمنوں، مختلف کالجوں کے ادبی میگزین اُردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ ان ادبی رسالوں میں ''پتن''، ''توی''، ''شاداب''، ''سروش''، ''بیتاڑ''، ''سرن''، ''المبین''، ''خیابان''، ''کوہ کاف''، ''پرل''، ''خورشید''، ''دومیل'' اور ''زون'' اہم ہیں۔

آزاد کشمیر میں اُردو ادب کی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں:۔

> ''آزاد کشمیر میں گزشتہ پچاس سالوں میں اُردو کا بہترین شعر و ادب تخلیق ہوا ہے۔ آج یہاں کے درجنوں شاعر اور ادیب نہ صرف برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آزاد کشمیر وہ واحد علاقہ ہے جہاں سرکاری زبان اُردو ہے اور اس طرح یہ علاقہ قومی زبان کے ادب کا اہم مرکز بن گیا ہے''۔(۷)

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے ارتقا کے حوالے سے یہ دور نہایت اہم ہے۔اس دور میں قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' جیسی اہم اور کئی حوالوں سے منفرد اُردو آپ بیتی منظر عام پر آئی۔ثریا خورشید کی ''چناروں کے سائے میں''،سید میر قاسم کی ''داستانِ حیات''،کرنل مرزا حسن خان کی ''شمشیر سے زنجیر تک''،سید محمود آزاد کی ''عمر رفتہ'' کے علاوہ درجنوں آپ بیتیاں لکھی گئیں۔اس دور کی آپ بیتیاں فنی اور فکری حوالے سے کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سفر میں ترقی یافتہ دور کی آپ بیتیاں ہیں۔اس دور میں آپ بیتی نگار صرف سیاست دان نہ تھے بلکہ اعلیٰ پائے کے ادیب بھی تھے،جن کی تحریروں میں نہ صرف اسلوب بیان کی ندرت اور خوبصورتی ہے بلکہ اکثر کشمیری آپ بیتی نگار اُردو ادب کے اہم مراکز جیسے لاہور سے جڑے ہوئے تھے۔اس کی وجہ سے اُن کا اُردو ادب کے مجموعی مزاج اور اصناف ادب کے فن سے پوری آگہی تھی۔اس بنیاد پر یہ آپ بیتیاں اُردو ادب کی بہترین آپ بیتیوں میں شامل ہیں۔کشمیر میں آپ بیتی کی روایت کے ترقی یافتہ دور کی اہم آپ بیتیوں کا مطالعہ ''شہاب نامہ'' کے تفصیلی مطالعے سے شروع کرتے ہیں۔

شہاب نامہ (قدرت اللہ شہاب)

قدرت اللہ شہاب کشمیری مشاہرین کی اس صف کے اہم فرد ہیں، جنھوں نے بیرون کشمیر اپنی بیشتر زندگی بسر کی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر بلند مقام حاصل کیا۔ قدرت اللہ شہاب ۱۹۱۷ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جموں میں ہی حاصل کی۔ پرنس ویلز کالج جموں میں دورانِ تعلیم شہاب نے عالمی مقابلے کے لیے ایک مضمون لکھ کر اوّل انعام حاصل کیا۔ ریاست کے کسی طالب علم کی طرف سے اتنا بڑا اعزاز حاصل کرنے پر مہاراجا ہری سنگھ نے خوش ہو کر ایسے طالب علم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چناں چہ اس کا اہتمام کیا گیا۔ قدرت اللہ شہاب اس ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے ''شہاب نامہ'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''صوفے پر ہز ہاہینس راج، راجیشور، مہاراج ادھیراج، سری مہاراج، ہری سنگھ بہادر، اندر مہندر، سپہر سلطنتِ انگلشیہ، جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ای، کے۔ سی۔ وی نڈھال بھینسے کی طرح اوندھے پڑے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت صوفے پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے گندے کپڑوں سے بھرا سوٹ کیس تیز رفتار گاڑی سے باہر گر کا پھٹ گیا ہو۔ مہاراجا ہری سنگھ رات بھر شراب کے ساتھ کچے اور پکے گوشت کا شغل فرماتے تھے اور دن بھر حکیم اور ڈاکٹر ان کے لیے کشتوں کے پشتے لگا کر انھیں اگلی شب کے لیے تازہ دم کرتے رہتے تھے، چناں چہ اس وقت بھی چند عورتیں اور مرد ان کے اعضائے رئیسہ و غریبہ کی خفی اور جلی مالش کرنے میں مصروف تھے۔ مہاراجا کی آنکھیں کچھ کھلی اور کچھ بند تھیں اور ان کے کونوں میں گید گندے بیروزے کی طرح تہہ در تہہ جم رہی تھی۔ ایک اے ڈی سی نے مجھے دھکیل کر مہاراجا کی سرکار میں پیش کیا۔ دوسرے اے ڈی سی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مہاراجا کے دست مبارک کے ساتھ ہلکے سے رگڑ دیا۔ ہاتھ ملانے کی رسم میں وہ کیفیت تھی، جو مینڈک کے لجلجے پیٹ کو ہتھیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے''۔ (۸)

بی اے کرنے کے بعد قدرت اللہ شہاب نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کیا۔ اس کے بعد آئی سی ایس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں آ گئے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں خدمات سرانجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان پہنچے اور سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد کشمیر کی انقلابی حکومت انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوئی۔ کشمیر کے دورافتادہ پہاڑوں (جونجال ہل) میں اس حکومت کا کام خیموں اور چند ٹوٹی پھوٹی عمارات میں چلتا تھا۔ اس انقلابی حکومت کے حوالے سے عالمی اور ملکی سطح پر کئی خدشات موجود تھے اور اس کے چلنے کو کوئی

صورت نہ تھی۔اس صورت حال میں قدرت اللہ شہاب رضا کارانہ آزادکشمیر کی انتظامیہ میں شامل ہوئے اور یہاں اپنی خدمات پیش کیں۔وہ آزادکشمیر میں بطورسیکرٹری جنرل تعینات ہوئے (موجودہ چیف سیکرٹری)۔انقلابی حکومت کے ابتدائی دور میں بطور سیکرٹری جنرل ان کی تعیناتی یہاں کے سرکاری اداروں اور ریاستی نظام کی تشکیل کے لیے نیک فعال ثابت ہوئی۔انھوں نے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اپنی محنت اور صلاحیت سے نہ صرف یہاں کی انقلابی حکومت کو مستحکم کیا بلکہ فعال اور بہترین انتظامیہ تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا اور اپنی ادبی شخصیت کی بنیاد پر یہاں علمی وادبی فضا کو فروغ دینے میں بھی بنیادی کردار ادا کیا۔

قدرت اللہ شہاب کے ادبی سفر میں ''یا خدا''، ''ماں جی'' کے ساتھ ساتھ ''شہاب نامہ'' وہ اہم تصنیف ہے، جس نے انھیں اُردوادب میں ایک نمایاں حیثیت دی ہے۔قدرت اللہ شہاب اگرچہ ساری زندگی پاکستان میں اعلیٰ بیوروکریسی کے ایک اہم فرد کی حیثیت سے پاکستان میں رہے مگر کشمیر سے تعلق، آزادکشمیر میں ملازمت اور اپنے ادب کی بنیاد پر ان کی تخلیقات کو کشمیر کے ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔اس پس منظر میں اُن کی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی ایک عمدہ تصنیف ہے، جس نے کشمیر کی اُردو آپ بیتی کو نیا رنگ وروپ دیا اور اسے اُردو آپ بیتی کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ کر کے ترقی دی۔

''شہاب نامہ'' میں ۵۹ عنوانات قائم کیے گئے ہیں، جنھیں ابواب تصور کیا جا سکتا ہے۔ان عنوانات کے تحت شامل لوازمے میں موضوعات، واقعات، مشاہدات اور شخصیات کا تذکرہ ایک اندرونی تسلسل کے ساتھ آ کر عمدہ تصنیف کی صورت میں ڈھل گیا ہے۔زمانی تسلسل اور سیاق وسباق کے ربط نے کتاب میں ایک ناول کی سی دلچسپی اور تجسس پیدا کر دیا ہے۔ابواب کے باہم منسلک ہونے اور بیان کے قدرتی بہاؤ نے ''شہاب نامہ'' کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کیا ہے۔جان محمد آزادؔ اپنی کتاب ''جموں وکشمیر کے اُردو مصنفین'' میں ''شہاب نامہ'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''یہ خودنوشت لگ بھگ تیرہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں نجانے کتنی عبرتیں اور قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔اس کی شعاعوں کی روشنی میں ہر شخص اور ادارے کے حقیقی خدوخال اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔یہ کتاب ایک قوم اور ایک ملک کے عروج وزوال کا آئینہ پیش کرتی ہے۔یہ سربراہوں کی کج رویوں، اہل سیاست کی ہیرا پھیریوں، نوکر شاہی کی جی حضوریوں اور بیوروکریٹس کی من مانیوں کے علاوہ معاشرے کی بے حسی کی بے لاگ داستان ہے۔اس کتاب کے مطالعے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نسل انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ پوری لطافت اور کثافت کے ساتھ بیدار ہوگئی ہے''۔(۹)

''شہاب نامہ'' ایک فرد کی داستان ہی نہیں بلکہ ایک عہد کی تاریخ بھی ہے۔قدرت اللہ شہاب نے متحدہ کشمیر میں اپنا

بچپن اور جوانی گزارا، آزاد کشمیر میں ایک با اختیار عہدہ میں رہے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں قیام کیا۔ پاکستان میں اعلیٰ ترین انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے بیوروکریٹ، ذہین انسان اور بڑے ادیب تھے۔ وہ بنیادی طور پر تخلیق کار تھے۔ ادب سے محبت، فکر کی گہرائی، تصوّف سے دلچسپی اور ایک حساس اور رومانی شخصیت کے مالک تھے۔ تصوف اور رومانیت نے اُن کی شخصیت میں عجیب طرح کی کشش اور رنگ بھر دیے تھے، جس کا اظہار ان کی تحریروں میں جا بجا ہوتا ہے۔ وہ وطن، مذہب، فرائض، رشتوں ناطوں میں اس رومانیت کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ شہاب کی زندگی کی یہی رنگا رنگی ''شہاب نامہ'' کو ایک انتہائی دلآویز اور خوبصورت کتاب بناتی ہے، جو ان کے ذاتی زندگی کے ساتھ برِعظیم کے ایک عہد کی تاریخ کا بھی حصہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ''شہاب نامہ'' کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں چار بڑے موضوعات ہیں۔ مصنف کی ذاتی زندگی، کشمیر، پاکستان اور اسلام۔

قدرت اللہ شہاب سادگی اور معصومیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ بچپن میں ہی انھوں نے ایک خوف یا پریشانی کے باعث ایک وظیفہ شروع کیا، جو زندگی بھر کے لیے اپنا لیا، وہ لکھتے ہیں:۔

> ''ورنیکلر فائنل کا وظیفہ تو مجھے صرف دو برس کے لیے ملا لیکن درود شریف کا وظیفہ میرے نام تا حیات لگ گیا''۔(۱۰)

تھرڈ ایئر میں عالمی مقابلے میں پہلا انعام، مہاراجا کے دربار میں حاضری سے لے کر ان کی محبتیں اور معاشقے اور ان کی زندگی کے سبھی رنگ پوری دیانت داری کے ساتھ اس کتاب میں سمٹ آیا ہے۔ ڈاکٹر احسان اکبر ''ذکرِ شہاب'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''شہاب صاحب کا یہ ''زندگی نامہ'' ان کے سفرِ حیات کی جو جھلکیاں دکھاتا ہے، اس میں خودنمائی یا ''سلف ایگرنڈائزمنٹ'' سرے سے نہیں ہے۔ چندراوتی جس پر وہ اپنے طالبِ علمی کے زمانے میں فدا ہو گئے تھے اس کے ساتھ مراسم کے ذکر میں کئی اپنے ''مردانہ شاہ نزم'' کے تحت محبت کی کامیابیوں یا چندراوتی کو فتح کر لینے یا بقول غالب ''مار رکھنے'' کی روداد درج نہیں کی۔ صرف اپنی یک طرفہ محبت کا اظہار ہے، چندراوتی کی پاکیزگی اور سادگی کا ذکر ہے''۔(۱۱)

''شہاب نامہ'' کا ایک پورا باب ''چندراوتی'' کے عنوان سے شہاب کی محبت اور عشق کی داستان ہے۔ چندراوتی کا تعارف کرواتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

> ''چندراوتی واقعی سورن کنیا تھی۔ وہ سُپر ڈیشر سمیشر قسم کی لڑکیوں کی طرح حسین نہ تھی لیکن اس کے وجود پر ہر وقت سپیدۂ سحر کا ہالہ چھایا رہتا تھا۔ رنگت میں وہ سونے کی ڈلی تھی اور جلد اس کی باریک مومی کاغذ تھی، جس کے آر پار نگاہ جاتی بھی ہے اور نہیں بھی جاتی۔ اس

کی گردن میں چند باریک باریک نیلی رگوں کی بڑی خوشنما پچی کاری تھی اور جب وہ پانی
پیتی تھی تو اس کے گلے سے گزرتا ہوا ایک گھونٹ دور سے گنا جا سکتا تھا۔(۱۲)

اس تحریر میں قدرت اللہ شہاب کے ایک بہترین افسانہ نگار ہونے، کردار نگاری اور خوبصورت ادبی نثر کے نمونہ کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ پھر سول سروس کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا۔ تقسیم سے قبل وہ بھاگلپور میں اسسٹنٹ کمشنر، اورنگ آباد اور تملوک میں ایس ڈی او اور صوبائی سیکرٹریٹ اُڑیسہ میں انڈر سیکرٹری رہے۔ پاکستان آئے تو یہاں سیکرٹریٹ میں مختلف عہدوں اور مناصب پر رہے۔ آزاد کشمیر میں سیکرٹری جنرل تعینات ہوئے۔ ڈپٹی کمشنر سے لے کر سیکرٹری اور تین سربراہان مملکت کے پرسنل سیکرٹری تک پہنچے۔ بیرون ملک سفیر بھی رہے۔ چناں چہ ان حیثیتوں میں انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اور زندگی میں جو اتار چڑھاؤ آئے، انھیں بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔

قدرت اللہ شہاب اہم عہدوں پر رہے اور ان عہدوں اور مناصب میں رہ کر بہت سے افراد نے جائیدادیں اور جاگیریں بنائیں، مگر انھیں یہ ''ہنر'' نہ آیا۔ ایک مرتبہ انھیں جنرل ضیاالحق کے دور میں ایک پلاٹ کی الاٹمنٹ ہوئی مگر انھوں نے قبول نہ کی۔ شہاب کی شخصیت کا یہ روشن پہلو ان کے کردار کی بلندی اور شخصیت کی دل کشی کا باعث ہے اور اس نے ان کی کتابِ زندگی کو بھی خوب صورت بنایا ہے۔ اپنی ابتدائی ملازمت کے دور میں جب وہ ہندوستان میں تعینات تھے، ایک ہندو فیکٹری مالک کی طرف سے رشوت کی پیش کش پر جس کیفیت کا شکار ہوتے ہیں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اس روز مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ مجھے رہ رہ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ پریم ناتھ اگروال نے گردن سے پکڑ کر میرا منہ غلاظت کے ڈھیر میں جھونک دیا ہے۔ تمام شب میں اسی ادھیڑ بن میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ اگروال کو آخر یہ خیال کیسے آیا کہ وہ مجھے رشوت دے کر اپنا کام نکال سکتا ہے۔ میں جتنا اپنے آپ کو کریدتا تھا میرے رگ رگ میں احساس ندامت اور سبکی کے متعفن پرنالے چھوٹنے لگتے تھے''۔(۱۳)

قدرت اللہ شہاب کی زندگی کے ایسے منفرد واقعات کے ساتھ ساتھ مزاروں اور زیارتوں سے پیسے چرانا، سکول سے بھاگنا، چھپ چھپ کر فلمیں دیکھنا اور اس طرح کے متعدد واقعات ''شہاب نامہ'' میں بیان ہونا اس بات کا غماز ہے کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی خامیوں کا تذکرہ، غلطیوں کا بیان بھی کھل کر کیا ہے، جو ''شہاب نامہ'' کی ایک بڑی خوبی ہے۔ شہاب نامہ کے اس پہلو کے حوالے سے ڈاکٹر احسان اکبر لکھتے ہیں:۔

''مصنف کے صدق کی یہ داخلی شہادت ہر خودنوشت کا لازمہ ہوا کرتی ہے۔ ''شہاب نامہ'' نہ صرف اس صفت سے بدرجہ اُتم متصف ہے بلکہ شہاب صاحب کی شخصیت کا

فطری ارتقا بھی کسی منضبط داستان کی طرح آخری اوراق کے روحانی اشغال تک
رواں رہتا ہے''۔(۱۴)

''شہاب نامہ کا دوسرا بڑا موضوع کشمیر ہے۔کشمیر سے قدرت اللہ شہاب کی دلی وابستگی کا اظہار ''شہاب نامہ'' میں جا بجا ملتا ہے۔وہ خود کشمیری تھے،اس لیے انھیں اپنے بچپن کی یادیں اور باتیں بہت ستاتی ہیں۔وہ کشمیری مسلمانوں کی پسماندگی پر کڑھتے ہیں اور اپنی نفرت اور غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ڈوگرہ مہاراجا کے عہد میں ان پر ہونے والی زیادتیوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''کشمیری مسلمانوں کا مال ومتاع تو ہر وقت ریاست کے اہلکاروں ،خفیہ نویسوں ، رئیسوں اور جاگیرداروں کے رحم وکرم پر رہتا ہی تھا، اس غریب کی جان بھی اپنی سرزمین پر بے حد ارزاں تھی۔ایک زمانے میں کشمیری مسلمانوں کی زندگی کی قانونی قیمت مبلغ دو روپے تھی''۔(۱۵)

کشمیر کی تاریخ،تحریکِ آزادیِ کشمیر کا احوال ایک باب میں نہایت خوبصورتی اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔تقسیم برعظیم کے آس پاس کے واقعات کی کڑیاں بڑی محنت اور تاریخی سچائیوں کے ساتھ مرتب کی ہیں،جس سے اس عہد کی اصلی صورت حال آئینے کی طرح سامنے آ گئی ہے۔اس حوالے سے نذیر احمد ''شہاب نامہ ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:۔

''کشمیر کے بارے میں تمام واقعات کی کڑیاں قدرت اللہ شہاب نے بڑی محنت سے جوڑی ہیں۔اندرونی سیاست کی کشمکش، شیخ عبداللہ کی قلب ماہیت، چودھری غلام عباس کا استقلال، مجاہدین کی قربانیاں، ہندوستان کی ہٹ دھرمی، نہرو کا دوغلا پن، پاکستانیوں کی سادگی، سبھی تار چھیڑے ہیں اور ان کی مدد سے کشمیر کی المناک کہانی بیان کی ہے''۔(۱۶)

کشمیر کی آزادی کے مرحلے پر برسرِ پیکار رہنماؤں میں سے شیخ عبداللہ کے کردار کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''مسلم کانفرنس کی سات سالہ بے تاج بادشاہی کے بعد ۱۹۳۹ء میں شیخ عبداللہ سیاستِ اسلامیہ کی ہمالیہ کی چوٹی سے لڑھک کر منہ کے بل گرے اور ہندو کانگریس کی جھولی میں دھم سے آ پڑے، زوال کے اس عمل میں ان کے چہرے پر سجی ہوئی خوبصورت اور دیدہ زیب ریش مبارک آناً فاناً غائب ہو گئی اور ان کے سر کی سج دھج ایک سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی بھی راستے میں کہیں گر کر کانگریس کی گنگا ماتا میں ڈوب گئی۔مسلم کانفرنس سے رشتہ توڑ کر شیخ صاحب نے آل انڈیا کانگریس سے فیضان اور

وجدان اور رہنمائی حاصل کر کے جموں و کشمیر نیشنل پارٹی کا ڈول ڈالا۔ یہ پارٹی شروع سے ہی آل انڈیا کانگریس کی داسی بنی رہی''۔(۱۷)

آزاد حکومت کے قیام کے حوالے سے قدرت اللہ شہاب رقم طراز ہیں:۔

> ''جب پونچھ کا بیشتر علاقہ آزاد ہو کر ڈوگرہ حکومت کی لعنت سے پاک ہو گیا تو رفتہ رفتہ چاروں طرف پھیلے ہوئے گوریلا لیڈروں اور مجاہدین کا آپس میں رابطہ ہوتا گیا۔ اور ۱۹۴۷ء کے ماہ اکتوبر کے وسط میں انھوں نے باہمی تعاون سے ایک مرکزی جنگی کونسل قائم کر لی۔ اس کے بعد آزاد شدہ علاقے کا نظم ونسق سنبھالتے ہوئے ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں و کشمیر کی حکومت کا قیام عمل میں آیا، جس کے پہلے صدر سردار محمد ابراہیم خان تھے۔ اس حکومت کے قائم ہونے کے بعد مجاہدین آزادی نے باقاعدہ منظّم ہو کر ڈوگرہ حکومت کے رہے سہے اقتدار کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار مربع میل سے زیادہ رقبہ آزاد کرا لیا''۔(۱۸)

آزاد کشمیر کے ابتدائی دارالحکومت میں انھوں نے جس بے سروسامانی کی کیفیت میں کام کیا اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''جونجال ہل ایک نہایت پُر فضا مقام تھا اور طرح طرح کے سرسبز درختوں کے گھنے جنگل میں گھرا ہوا تھا۔ آس پاس ایک دو پہاڑی جھرنے تھے، جن کی ہلکی ہلکی، مدھم مدھم سی موسیقی دن رات اپنی تانیں اڑاتی رہتی تھی۔ دفتروں کے کمرے روایتی ساز وسامان سے بڑی حد تک محروم تھے۔ فائلوں کے لیے نہ الماریاں تھیں نہ شیلف۔ عام طور پر پتھر کی سلوں کو ہموار رکھ کر ان سے کام لیا جاتا تھا۔ موسم کے لحاظ سے باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر دفتری کام کرنے کا رواج بھی عام تھا''۔(۱۹)

اس صورت حال میں آزاد کشمیر کی نئی عبوری حکومت کے کام میں قدرت اللہ شہاب کا اپنی مرضی سے درخواست دے کر اور پُر آسائش ماحول اور آرام دہ نوکری چھوڑ کر آنا ان کا مجاہدین آزادی، تحریکِ آزادی کشمیر اور کشمیر کے عوام سے دلی محبت اور سچے پکے کشمیری ہونے کا ثبوت ہے۔

اسی طرح ''پاکستان اور اسلام'' کے موضوعات پر بھی ''شہاب نامہ'' ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہے۔ تحریکِ آزادی، مسلم ہندو فسادات، نہرو اور گاندھی کی مکاری، قائدِ اعظم کی ذہانت اور عظمت، پاکستان کی خارجہ وداخلہ پالیسی کے نشیب وفراز، جمہوریت اور آمریت کی آنکھ مچولی، اسلام کے نعرے اور دعویٰ سے یہاں ہونے والے سلوک کا احوال اور دیگر درجنوں

عنوانات کے تحت عمدہ لوازمہ موجود ہے، جو قدرت اللہ شہاب کی ذات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ بقول مسعود قریشی:۔

> ''مجموعی طور پر ''شہاب نامہ'' ایک ایسی کتاب ہے جسے نہ پاکستان کا کوئی مؤرخ نظر انداز کرسکتا ہے نہ ادب کا طالب علم۔ پاکستان کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے''۔(۲۰)

''شہاب نامہ'' ایک بڑے پھیلاؤ والی کتاب ہے، جس میں واقعات بھی ہیں، حادثات بھی اور ساتھ ساتھ مشاہیر سے عام افراد تک اتنے رجال کا تذکرہ ہے کہ اگر صرف کتاب میں شامل افراد کی فہرست بنائی جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ یوں تذکرہ رجال کے حوالے سے بھی یہ ایک بھرپور آپ بیتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب اُردو ادب کے ایک بڑے ادیب تھے۔ ان کی فکشن نگاری نے ان کی نثر میں بلاغت کی عمدہ خوبی پید کر دی تھی اور یہی خوب صورت اسلوب بیان ''شہاب نامہ'' کو دوسری آپ بیتیوں سے منفرد کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت جملے، عمدہ تشبیہات اور استعارے ''شہاب نامہ'' کی رواں اور عمدہ نثر کی لطافت میں اضافے کا باعث ہیں:۔

> ''اس ننھی منی معصوم بچی کے پاؤں ننگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی بہت سے سوراخ ہیں۔ اس کے سنہری بال ریشم کے الجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگھریالے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرق کی طرح چمک رہے ہیں۔ بچی کی پلکیں گھنی اور نوکدار ہیں اور اس کی اداس آنکھوں میں جھیلوں کی اتھاہ گہرائیاں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوتی، تو بے شک وہ جنت کی حور بنتی لیکن وہ بے رحم زمین پر پیدا ہوئی اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں خدا کا یہ نادر شاہکار بھوک سے مرجھایا ہوا ہے، خوف سے سہا ہوا ہے، بے گھر ہے، بے سہارا ہے، اداس ہے، پامال ہے............''۔(۲۱)

آپ بیتی کی بنیادی خوبی انکشاف ذات اور اظہار ذات کے حوالے سے دیکھا جائے تو ''شہاب نامہ'' میں جس صداقت اور دیانت داری سے شہاب نے اپنی زندگی کی تلخ سچائیوں، بچپن کے عشق اور اپنی شخصیت کے ناقابلِ یقین پہلوؤں کو بیان کیا ہے وہ اُردو ادب کی کم آپ بیتیوں کے حصہ میں آیا ہے۔ چندراوتی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے فوراً کتاب اس کے حوالے کر دی اور ساتھ ہی اپنا سارا علم وفضل بھی اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ وہ دوسرے تیسرے روز گورنمنٹ کالج آجاتی۔ میں اپنی کلاس چھوڑ کر لان میں بیٹھ جاتا اور دیر تک اُسے بڑی محنت سے پڑھتا رہتا تھا''۔(۲۲)

’’شہاب نامہ‘‘ اپنی بے شمار خوبیوں کے باوجود موضوع اور فن کے حوالے سے بعض خامیوں کا شکار بھی ہے۔ ’’شہاب نامہ‘‘ کا اسلوب زیادہ تر افسانوی ہے۔ قدرت اللہ شہاب ایک معروف افسانہ نگار تھے۔ چناں چہ وہ سچی اور حقیقی باتوں کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے کے عادی ہیں۔ اسی وجہ سے اس پر حقیقت کے بجائے افسانے کا گمان ہوتا ہے۔ شہاب نے افسانوی تخیّل آمیزی سے واقعات کو بھی ایسا رنگ دیا ہے کہ وہ حقیقی کے بجائے ذہنی پیداوار لگتے ہیں اور ’’شہاب نامہ‘‘ پر یہی ایک بڑا اعتراض بھی ہے۔ اسلوبِ بیان میں بھی کہیں کہیں روزمرہ کے اصولوں سے انحراف بعض مقامات پر طویل اور پیچیدہ جملوں سے روانی متاثر ہوتی ہے۔

’’شہاب نامہ‘‘ میں مختلف نوعیت کے موضوعات کو جمع کیا گیا ہے، تاریخ، ادب، سیاست، سیاحت، کشمیر، پاکستان، عالمی حالات وغیرہ ان مختلف موضوعات کو بعض مقامات پر بالکل غیر فطری طریقے سے آپ بیتی میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ایک فرد کی زندگی سے جڑے یہ واقعات اور موضوعات ایک محدود دائرے میں آنا ایک آپ بیتی میں ناگزیر ہیں، مگر ان موضوعات کا اپنے الگ تشخص کے ساتھ آپ بیتی میں سمونا، ان پر فلسفیانہ اور تجزیاتی نقطہ نظر سے بحث، آپ بیتی کے دائرے سے تجاوز کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے ’’شہاب نامہ‘‘ کو تاریخ، تصوف، سیاسیات اور سوانح ہر ایک میں شامل کیا جاتا ہے۔

’’شہاب نامہ‘‘ کے مضمون میں ایک بڑی خامی فوق العادت کرداروں کا احوال ہے، جو ’’نائنٹی‘‘ اور ’’کملا کماری کی بے چین روح‘‘ کے عنوانات کے تحت آئے ہیں۔ ان روحانی تجربات کا حیرت انگیز طریقے سے بیان ’’شہاب نامہ‘‘ کی تفہیم اور قدرت اللہ شہاب کی شخصیت کو سمجھنے میں ابہام کا شکار کرتے ہیں۔ ان فوق العادت واقعات اور روحانی تجربات نے ’’شہاب نامہ‘‘ کے نفس مضمون پر کئی سوال پیدا کیے ہیں اور لوازمے کو مشکوک بنایا ہے۔

تصوف کے موضوع پر شہاب کے اس اظہار خیال سے ایک باقاعدہ دبستان اور بقول اظہر سہیل وہ سلسلہ ’’شہابیہ‘‘ کے بانی مبانی بن چکے ہیں (شہاب نامہ، ص۳۵۴)۔ یہ صورت حال قدرت اللہ شہاب کی سیدھی سادی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت سے میل نہیں کھاتی۔ آپ بیتی کے نقادوں کے لیے یہ بات نہ صرف ناقابلِ یقین ہے بلکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور دوسرے نقادوں نے اُردو آپ بیتی کے اس رجحان پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے بین السطور ’’شہاب نامہ‘‘ کو ہدف تنقید بنایا ہے:۔

> ’’اُردو آپ بیتیوں کے من گھڑت مواد میں معاشقوں کے دوش بدوش جو دوسرا بڑا جزو بطور خاص نظر آتا ہے وہ روحانی تجربات اور کشف و کرامات کا ہے‘‘۔ (۲۳)

بایں ہمہ ’’شہاب نامہ‘‘ اپنی چند ایک خامیوں کے علاوہ اُردو آپ بیتیوں کے سفر میں ایک اہم اور رجحان ساز اُردو آپ بیتی ہے، جسے اُردو آپ بیتی کا کوئی بھی نقاد اور محقق نظرانداز نہیں کرسکتا ہے۔ ’’شہاب نامہ‘‘ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا بھی ایک اہم حصہ ہے، جس نے کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کو ابتدائی اور تشکیلی دور سے نکال کر ترقی یافتہ دور میں داخل کیا۔ کشمیر میں اُردو

آپ بیتی کی روایت پر ''شہاب نامہ'' نے دیر پا اثرات چھوڑے ہیں۔ ''شہاب نامہ'' کے بعد منظر عام پر آنے والی اُردو آپ بیتیوں میں ایک واضح فرق اور بلوغت کے آثار ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کا سب سے بڑا حوالہ اور ایک نئی طرح اور روایت ڈالنے والی آپ بیتی کہا جا سکتا ہے۔ ''شہاب نامہ'' کے بعد منظر عام پر آنے والی کئی آپ بیتیوں میں اسلوبِ بیان، لوازمے، بیانیے اور پیش کش میں اس کی تقلید کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔ اُردو ادب کی آپ بیتیوں میں سب سے زیادہ شائع ہونے والی اور پڑھی جانے والی آپ بیتی بھی ''شہاب نامہ'' ہی ہے۔

چناروں کے سائے (ثریا خورشید)

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سفر میں ثریا خورشید کی ''چناروں کے سائے'' آپ بیتی کے ایک اور رُخ اور سٹائل کو سامنے لاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء سے قبل کی اُردو آپ بیتی ایک طے شدہ طریق کار، ابواب بندی اور واقعاتی تسلسل میں ایک فرد کی پیدائش، خاندان اور زندگی کے کارناموں اور کارگزاریوں کی داستان کے طور پر منظّم و مربوط کی جاتی تھی، لیکن بعد ازاں آپ بیتی کی پیش کش میں نیا پن پیدا کرنے کے لیے بہت سے نئے انداز سامنے آئے۔ ان نئے طریقوں کی حامل آپ بیتیوں میں ایک آپ بیتی ثریا خورشید کی ''چناروں کے سائے'' بھی ہے۔

ثریا خورشید، کشمیر کے ایک علمی و ادبی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے شوہر کے۔ ایچ خورشید آزاد کشمیر کے صدر اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سیکرٹری رہے۔ آپ کے دو بھائی خالد حسن اور مسعود حسن صحافی اور ادیب تھے۔ آپ نے افسانوں کا مجموعہ ''املتاس کے پیڑ'' اور سفر نامہ ''بانہال کے اس پار'' کے علاوہ محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ بیتے لمحوں پر ''یادوں کی کہکشاں'' اور کے ایچ خورشید کے حوالے سے بھی کتب لکھی ہیں۔

''چناروں کے سائے'' ایک آپ بیتی ہے مگر اس میں آپ بیتی کے معروف انداز کی طرح ابواب بندی ہے اور نہ ہی واقعاتی تسلسل موجود ہے۔ اس میں اُردو کی بعض آپ بیتیوں '' کارِ جہاں دراز ہے'' یا ''میرے بھی صنم خانے'' کی طرح ناول کا سا انداز اپنایا گیا ہے۔ ثریا خورشید کی دوسری کتابوں کی طرح اس کا پس منظر بھی کشمیر ہے۔ اپنی یادوں اور زندگی کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ثریا خورشید نے کشمیر کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور تحریکِ آزادی کشمیر کی صورتِ حال بھی بیان کی ہے۔ ''چناروں کے سائے'' کی مصنفہ اپنی زندگی کی کہانی کو یوں شروع کرتی ہیں۔

> ''زندگی کا جو واقعہ سب سے پہلے میرے ذہن میں اُبھرتا ہے اور میری یادوں کے جھروکوں میں مجھے ماضی کی طرف لے جاتا ہے، وہ طویل سال گزرنے کے بعد بھی تازہ ہے۔ جب بچپن کے ان معصوم ایام کا سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ روز روشن کی طرح میرے سامنے ہے۔ اس روز میرے ابا انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر واپس آ رہے تھے اور ہم سب بہن بھائی ان کے انتظار میں اپنے لان میں کھڑے تھے'' (۲۴)۔

اپنے والد کے انگلستان سے لوٹنے سے شروع ہو کر کشمیر چھوڑ کر پاکستان کی طرف ان کی ہجرت تک کے عرصے پر محیط ہے، اس حوالے سے یہ ایک جزوی آپ بیتی ہے۔

''چناروں کے سائے'' کی مصنفہ جگہ جگہ اپنے خیالات کے اظہار میں اپنی افسانہ نگاری کے جوہر دکھاتی نظر آتی ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق، ہجرت کے پُر آشوب منظر، فسادات کے دلخراش مناظر، خون سے لت پت لاشوں اور اُجڑے ہوئے کھیت و کھلیان انھیں جذباتی کر دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ ان مناظر اور حالات کو ایک افسانہ نگار یا ناول نگار کی طرح بیان کرنے لگتی ہیں۔ ''چناروں کے

سائے‘‘ میں دوسری اصناف کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ان اصناف میں سفرنامہ، رپورتاژ، ناول شامل ہیں۔

’’چناروں کے سائے‘‘ روایتی انداز کی آپ بیتی کے طرز پر نہیں لکھی گئی، جس میں زندگی کے مراحل کو ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تاثراتی انداز دلی کیفیات، احساسات اور جذبات کے بیان پر مشتمل ہے۔

ایک اچھی آپ بیتی واقعات کا خشک بیان نہیں۔ ان واقعات کے ساتھ جو کیفیات وابستہ ہیں ان کی داستان بھی ہے۔ واقعات اس لیے اہم ہیں کہ ان واقعات نے کیا تاثرات اور کیفیات عطا کی ہیں یعنی ان سے دل پر کیا گزری ہے۔ آپ بیتی جگ بیتی بھی ہے کیوں کہ اپنی زندگی میں ایک فرد اپنے خاندان، ماحول، علمی اداروں، تحریکوں، شخصیات، تہذیبی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ ان سب سے بہت کچھ لیتا ہے اور شاید تھوڑا بہت ان کو دیتا بھی ہے۔ اُردو کے بہت سے ادیبوں کی آپ بیتیاں افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی طرز پر موجود ہیں۔ اس پس منظر میں ’’چناروں کے سائے میں‘‘ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت میں اس نئے انداز اور اسلوب کی ایک مثال ہے۔ چناں چہ ممتاز مفتی کی ’’علی پور کا ایلی‘‘، الکھ نگری‘‘، مشتاق احمد یوسفی کی ’’زرگزشت‘‘، قراۃ العین حیدر کی ’’کارِ جہاں دراز ہے‘‘ وغیرہ کی طرز میں لکھی جانے والی کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی ایک تصنیف سمجھی جاسکتی ہے۔ اگر چہ اپنے اسلوب اور فن میں کسی طور ان کے مقابلے کی نہیں ہے، مگر اسی سٹائل اور انداز کی ایک تصنیف کی صورت اسے کشمیری مشاہیر کی آپ بیتیوں میں شامل کیا سکتا ہے۔

ثریا خورشید ہجرت کر کے پاکستان آئیں مگر اُن کی یادوں اور باتوں میں کشمیر کی خوشبو ہے۔ ’’چناروں کے سائے‘‘ اُن کی انھی یادوں کا مرقع ہے، جو خطہ کشمیر سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنی ان یادداشتوں کے ذریعے کشمیر کے حالات، تہذیب و تمدن اور ادب اور ثقافت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ کتاب محض اُن کی یادوں کا مجموعہ ہی نہیں رہی بلکہ کشمیر کے بہت سے پہلوؤں کو بیان کرتی ہے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں رہتے ہوئے وہ جن خوابوں اور تمناؤں کے ساتھ یہاں آئی تھیں، وہ پورا نہ ہونے کے باوجود ’’چناروں کے سائے‘‘ کا اختتام ان پُر امید لفظوں میں کرتی ہیں:۔

> ’’جو کچھ کہ ہم نے کھو دیا ہے یا حاصل نہیں کر سکے، اس کے لیے قدرت نے ابھی بھی ہمیں موقعے دیے ہیں۔ بیدار مغز اور تازہ ذہن ہم میں موجود ہیں، جن میں بہت کچھ کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور جو لالچ، ہوس اور خود غرضی سے بہت دور ہیں۔ زندہ قومیں اسی طرح تو زندہ رہتی ہیں۔ تابندہ اور روشن مستقبل کی ضمانت ہمارے وہ حوصلے ہیں جنھیں کھو کر ہم پھر پانا چاہتے ہیں‘‘۔ (۲۵)

داستانِ حیات (سید میر قاسم)

''داستانِ حیات'' مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیرِ اعلیٰ سید میر قاسم کی آپ بیتی ہے۔ یہ آپ بیتی بھی دوسرے کشمیری مشاہرین، غلام عباس، شیخ عبداللہ، سردار محمد ابراہیم کی طرح میدانِ سیاست کی ایک شخصیت کی داستانِ حیات ہے، جس میں میر قاسم کی ذاتی زندگی کے احوال کے ساتھ سیاسی اور تاریخی واقعات پر اُن کی رائے اور تبصرہ ہے۔ ادارہ ادبیات دلی نے یہ آپ بیتی شائع کی ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی سیاست میں شیخ عبداللہ کا کردار کلیدی اور اہم رہا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کی مقبوضہ کشمیر کی سیاست میں ان کے کردار کے حوالے سے اُن کی آپ بیتی ''آتش چنار'' کے علاوہ بہت کچھ منظر عام پر آچکا ہے۔ بھارت کے ساتھ اُن کی دوستی اور تعلقات کے اتار چڑھاؤ تاریخ کا حصہ ہیں۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں دو مرتبہ برسرِ اقتدار آئے۔ پہلی دفعہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک اور دوسری بار ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۲ء میں اپنی وفات تک۔ شیخ عبداللہ کی حکومت کے ان دو ادوار کے درمیانی عرصے کے خلا کو بخشی غلام محمد، خواجہ محمد صادق، خواجہ شمس الدین اور سید میر قاسم نے پُر کیا۔

سید میر قاسم ۱۹۱۹ء میں ضلع اننت ناگ کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی سید احمد اللہ ایک پڑھے لکھے اور دین دار فرد تھے۔ سید میر قاسم نے ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وکالت کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ سیاسی طور پر پوری زندگی کانگریس کے ساتھ وابستہ رہے اور اسی تعلق کی بنا پر وہ اقتدار تک پہنچے۔ پھر جب بھارتی حکومت شیخ عبداللہ کی دوبارہ ضرورت پڑی تو انھیں بغیر کسی وجہ کے فارغ کر دیا گیا۔ میر قاسم کشمیری سیاست کے ایک اہم دور کے ایک گواہ ہیں۔ چناں چہ اُن کی آپ بیتی تاریخی اعتبار سے بعض اہم واقعات کے تذکرہ کے باعث اہم ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں عبدالرحمٰن کوندو لکھتے ہیں:۔

> ''کشمیر کی تحریکِ آزادی اور سیاسی اتار چڑھاؤ کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے
> محترم سید میر قاسم کی آپ بیتی نعمت غیر مُترقبہ ثابت ہوگی''۔(۲۶)

''داستانِ حیات'' کشمیر میں ۱۹۴۵ء کے بعد پیش آنے والے واقعات کا ایک اہم حوالہ ہے۔ اگر چہ اس عہد کی تاریخ کشمیر پر متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں مگر میر قاسم اس دور کے واقعات کے شریکِ کار تھے۔ لہٰذا ۱۹۴۶ء کی کشمیر چھوڑ دو تحریک، ۱۹۴۷ء کے واقعات، شیخ عبداللہ کی وزارت، کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ کیا جانے والا الحاق، مہاراجا کی حکومت کا خاتمہ، شیخ عبداللہ اور بخشی وزارت کا قیام، خواجہ غلام صادق اور خواجہ شمس الدین کا دورِ حکومت وغیرہ پر سید میر قاسم کی آپ بیتی میں بعض ضروری معلومات موجود ہیں۔ اس تصنیف سے سید میر قاسم کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی بیسویں صدی کے حالات کے حوالے سے ایک دوسرے فریق کی رائے بھی منظر عام پر آتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں خاندان سے متعلق بعض اصحاب کے بارے میں تفصیلی معلومات لکھی ہیں، جو اہم ہیں۔ الحاج سید ولی اللہ شاہ راہی سے متعلق لکھتے ہیں:۔

''حضرت موصوف میری والد صاحب کے چچا تھے۔ اپنے زمانے کے بڑے عالم فاضل اور فارسی زبان کے قادرالکلام شاعر تھے۔ سیرت النبی کے موضوع پر موصوف نے چار (۴) جلدوں پر مشتمل نظم ''السیر'' نامہ معرکتہ الآرا کتاب منظوم کی ہے۔ یہ نظم فارسی زبان میں سیرت سرور عالمؐ اور دوسرے حضرات انبیا کے حالات و کمالات پر فارسی زبان کے علم و ادب کا ایک شاہکار ہے''۔(۲۷)

آپ بیتی کے فن کے حوالے سے ''داستانِ حیات'' کوئی رجحان ساز یا اہم آپ بیتی نہیں ہے۔ ساڑھے چار سو صفحات کی اس کتاب میں مصنف کی ذاتی زندگی کے لیے صرف پچھتر صفحات مختص ہیں، جب کہ باقی لوازمہ سیاسیات کشمیر کے حوالے سے ہے۔ انکشافِ ذات اور اظہار ذات کے پہلو سے بھی اس میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ محض روکھے پھیکے انداز میں کسی کے حالات زندگی بیان کیے جا رہے ہیں۔ البتہ کتاب کی تاریخی اہمیت موجود ہے۔

عمرِ رفتہ (سید محمود آزاد)

''عمر رفتہ'' سید محمود آزاد کی آپ بیتی ہے۔سید محمود آزاد ریاست پونچھ کی تحصیل باغ کے گاؤں سنگڑ میں پیدا ہوئے۔انھوں نے پرائمری تک تعلیم موہری فرمان شاہ میں حاصل کی۔۱۹۴۷ء کے جہادِ آزادی کی وجہ سے مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔سکول کی تعلیم کے دوران ہی سکول کی لائبریری سے کتب کے مطالعے کا آغاز کیا۔بعدازاں آخر وقت تک مطالعے کی عادت کو اپنائے رکھا اور پنجاب کی بڑی بڑی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔گھر کے خراب مالی حالات کی وجہ سے آغاز جوانی سے ہی مختلف ملازمتیں اختیار کرنا پڑیں،مگر مطالعے اور لکھنے پڑھنے کے سلسلہ کو جاری رکھا۔سید محمود آزاد کی رسمی تعلیم تو میٹرک ہے،لیکن اپنے مطالعے کی بنیاد پر تین درجن تک تصانیف اور تالیفات یادگار چھوڑی ہیں۔وہ بطور محقق اور مؤرخ کشمیر کے تاریخی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔تاریخ، سیاست اور ادب ان کی قلمی میدان رہے۔صحافت کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور علمی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ سیاست میں بھی متحرک رہے۔''عمر رفتہ'' اُن کی آپ بیتی ہے، جو زیورطبع سے آراستہ نہیں ہوسکی۔اس کا مسوّدہ راقم کو اُن کے بھانجے،متعدد کتابوں کے مصنف اور آزادکشمیر سیکرٹریٹ میں بطور سیکرٹری تعینات سید سلیم گردیزی سے ملا ہے۔

سید محمود آزاد نہ صرف ممتاز ادیب تھے بلکہ سیاست، سیاحت اور دیگر کئی حوالوں سے معروف تھے۔چناں چہ اُن کی آپ بیتی کشمیری مشاہرین کی آپ بیتیوں میں اپنے لوازمے،اسلوبِ بیان اور آپ بیتی کے فن کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔

''عمرِ رفتہ'' میں بیاسی عنوانات کے تحت سید محمود آزاد نے اپنی زندگی کی طویل داستان کو مختصر اور بامعنی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔انسانی زندگی کی داستان کو جس قدر طویل کیا جائے، ہوسکتی ہے،مگر آپ بیتی زندگی کی داستان سے ایسے واقعات اور حالات کے انتخاب کے باعث خوب صورت بنتی ہے، جو ایک داستان زندگی کو عمدہ طریقے سے بیان کریں۔اس حوالے سے ''عمر رفتہ'' ایک بہترین آپ بیتی ہے، جس میں سید محمود آزاد کی زندگی کے سبھی اتار چڑھاؤ بھی آئے ہیں اور غیر ضروری اور غیر اہم مباحث اور واقعات سے بھی دامن بچایا گیا ہے۔

''عمر رفتہ'' میں سید محمود آزاد کے نسب نامے سے بات شروع ہوتی ہے۔پھر بچپن کے حالات، ابتدائی تعلیم کے تذکرے، انقلاب ۱۹۴۷ء کی کہانی، سیاست میں اُن کی شرکت سے سلسلہ کلام اُن کی تصانیف وتالیفات تک پہنچتا ہے۔انفرادی معاملات کے ساتھ ساتھ اجتماعی امور میں سید محمود آزاد اپنی ذات سے جڑے واقعات اور معاملات تک ہی محدود رہتے ہیں۔وہ ایک مؤرخ تھے، تحقیق اور تنقید کے میدانوں میں بھی سرگرم عمل رہے،لیکن یہ بات اہم ہے کہ اپنی آپ بیتی میں انھوں نے دوسری اصناف اور موضوعات کو زبردستی نہیں گھسایا۔وہ تاریخی واقعات اور سیاست کا بیان اسی قدر کرتے ہیں، جو ان کی ذات سے جڑا ہے۔۱۹۴۷ء کے انقلاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب ریڈیو کا لوگوں نے صرف نام سن رکھا تھا۔اخبار شاذو

نادر ہی کسی کو ملتا تھا۔ ۱۶/اگست کو ہمارے گاؤں کا ایک آدمی راولپنڈی سے آیا تو اس کی زبانی پتہ چلا کہ ۱۴/اگست کو قیامِ پاکستان کا اعلان ہو گیا ہے۔ یہ بات ہمارے گاؤں میں پھیل گئی اور ادھر دوسرے تمام علاقوں میں بھی لوگوں کو پتہ چل گیا کہ پاکستان بن گیا ہے۔ لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے، لیکن ساتھ ہی ان کے دل میں یہ سوال بھی تھا کہ اب ہمارے ملک کا کیا ہوگا''۔(۲۸)

سید محمود آزاد نے صحافتی زندگی کا آغاز مولانا ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' سے کیا اور متعدد اخبارات اور رسائل میں کام کیا۔ آخری عمر میں محکمہ اوقاف کے ترجمان رسالہ ''عزیمت'' کے بھی مدیر رہے۔ علمی ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ لاہور میں دوران ملازمت شروع ہوا اور سفر زندگی میں متعدد اتار چڑھاؤ، مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود جاری رہا۔ ان کی تصانیف اور تالیفات کی تعداد تین درجن سے زائد ہے، جن میں سے درجن زیور طباعت سے آراستہ ہو سکیں باقیوں کے مسوّدے موجود ہیں۔ ان میں ایک اہم کام وہ ضخیم انسائیکلوپیڈیا بھی ہے، جو انھوں نے آزاد کشمیر یونی ورسٹی کے ساتھ ریسرچ فیلو کی حیثیت سے وابستہ ہو کر مرتب کیا ہے۔ اس کا مسوّدہ آزاد کشمیر یونی ورسٹی میں موجود ہے، مگر زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اُن کی معروف کتب میں ''تاریخ کشمیر'' (تین جلدیں)، ''تاریخ پونچھ''، ''تاریخ اولیائے کشمیر''، ''سوانح شیخ عبداللہ''، ''حیاتِ جوہر'' (سوانح محمد علی جوہر)، ''سوانح غازی ملت سردار محمد ابراہیم''، ''تاریخ سادات گردیزیہ پونچھ''، ''عراق میدانِ جنگ میں''، ''پاکستان مارشل لا سے پہلے اور مارشل لا کے بعد'' اور ''میں اور شیطان'' (ناول) شامل ہیں۔

سید محمود آزاد سیاسی طور پر مسلم کانفرنس کے ساتھ وابستہ رہے اور سیاسیات کشمیر کے بڑے کرداروں چودھری غلام عباس، سردار محمد ابراہیم خان، سردار عبدالقیوم خان، کے ایچ خورشید سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ مسلم کانفرنس میں غازی ملت کے دھڑے کے سیکرٹری اطلاعات بھی رہے لیکن مخدوش مالی حالات اور آزاد کشمیر کی سیاست کے مخصوص چلن کے باعث سیاست میں زیادہ دیر تک اور دور تک نہ جا سکے۔

''لیڈروں کے باہمی رابطہ اور اس انداز نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا اور وسیع غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ میرا سیاست میں بھر پور حصہ لینا محض وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ کیوں کہ یہ سیاست نہیں گروہی جنگ اور کشمکش ہے اور اس ساری جنگ کو وزارتِ امور کشمیر کے افراد اپنے مذموم مقاصد کے لیے ہوا دیتے ہیں''۔(۲۹)

''عمر رفتہ'' تذکرہ رجال کے حوالے سے بھی بھر پور آپ بیتی ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے نصف دوم کے شعرا، ادیبوں، آزاد کشمیر کے جملہ سیاسی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے بڑے بڑے علمائے کرام اور علمی ادبی شخصیات سے

مصنف کی ملاقاتوں اور تعلقات کی تفاصیل موجود ہیں۔ ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، جنرل ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو، احسان دانش، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مولانا کوثر نیازی، سعادت حسین منٹو، عبدالقدوس ہاشمی، رشید اختر ندوی سمیت متعدد شخصیات سے کسی نہ کسی طرح مصنف کی وابستگی رہی ہے، جس کا مناسب احوال ''عمر رفتہ'' میں کیا گیا ہے۔

سید محمود آزاد کا ایک ناول ''میں اور شیطان'' بھی چھپا ہے اور ان کے بقول خراب مالی حالات کی وجہ سے انھوں نے اپنے پندرہ ناولوں کے مسوّدے ایک ناشر کو فروخت کیے تھے، جو بعد میں کسی معروف مصنف کے نام سے شائع ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

> ''پبلشر نے دو سو روپے فی مسوّدہ دینے کا وعدہ کیا اور میں نے تین ہزار روپے میں اپنے سارے مسوّدے پبلشر کو سونپ دیے، جو بعد میں کسی معروف مصنف کے نام سے شائع ہوئے اور دو تین ناول کو اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کے کئی کئی ایڈیشن چھپے''۔(۳۰)

مصنف نے ایسا کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ علمی ادبی کتب پڑھنے اور اپنے سنجیدہ مطالعے کے نتیجہ میں فکشن سے تعلق توڑ دیا اور علمی، تاریخی اور دینی کتب کے مطالعے اور تصنیف و تالیف کی طرف راغب ہو گئے، مگر آخری عمر میں لکھی گئی ''آپ بیتی'' میں ان ناولوں کے نام، جن کے نام سے شائع ہوئے ان کے بارے میں انکشافات ضروری تھے۔ یہ بجا کہ اس دور میں بعض شعرا اور ادیب اپنی غربت کے باعث ایسا کرتے رہے ہیں اور سید محمود آزاد کی سیاحانہ زندگی انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی رہی ہوگی۔ خود ان کے قریبی عزیزوں کا بیان بھی ہے کہ سید محمود آزاد نے اپنے بہت سے ناولوں کے مسوّدے فروخت کیے ہیں۔

''عمر رفتہ'' کا ایک خاص کردار ایک خاتون کا ہے۔ یہ پُر اسرار خاتون ساری کتاب میں مختلف وقفوں کے بعد نمودار ہوتی ہے اور ایک ناول کی طرح کتاب کی دل کشی اور تجسس میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ داستان حقیقی ہے یا فرضی، اس کے بارے میں کوئی ٹھوس شواہد نہ مل سکے۔ چوں کہ مصنف نے اس آپ بیتی میں بھی اس کا نام اور دیگر تفصیلات صیغہ راز میں رکھی ہیں اور ہمیشہ ''ایک خاتون'' کے نام سے ڈھیروں تفصیلات نذر قارئین کرتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ سید محمود آزاد کے ذوق ناول نگاری کے باعث ''خاتون'' کا کردار ان کی آپ بیتی میں آیا ہے، جس نے آپ بیتی کی عام فضا میں دل کشی پیدا کی ہے۔ اس خاتون کے حوالے سے تفصیلات بیان کرتے ہوئے سید سلیم گردیزی لکھتے ہیں:۔

> ''انھیں [سید محمود آزاد] ایک پبلشر کے ہاں مسوّدوں کی پروف ریڈنگ کا کام ملا، جن میں کسی خاتون ناول نگار کا ایک پلندہ بھی تھا۔ موصوفہ کی لکھائی اتنی بھدی تھی کہ کاتب پڑھ نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا پبلشر نے انھیں سو روپے فی مسوّدہ کے حساب سے مسوّدہ تحریر کرنے کو کام سونپ دیا۔ گھر لا کر وہ مسوّدہ دیکھا تو ناول کہلائے جانے کے قابل نہ

تھا۔نہایت غیر معیاری پلاٹ،طفلانہ زبان، بے جان کردار، بے ربط تحریر۔انھوں نے اس مسوّدہ کو ایک طرف رکھا اور اسی مرکزی خیال پر ایک ناول کا مسوّدہ لکھا،جس میں پلاٹ کو بہتر بنایا، کرداروں میں جان پیدا کی،بعض نئے کردار شامل کیے۔ جب یہ ناول چھپا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور خاتون ناول نگار اچانک شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ان محترمہ نے سید صاحب سے رابطہ کیا اور معقول معاوضے پر اپنے دیگر ناول بھی ان سے تحریر کراتی رہیں،جس کی اشاعت سے ان محترمہ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔لیکن اب تک یہ کسی کو معلوم نہیں کہ ان ناولوں کا اصل خالق کون ہے''۔(۳۱)

''عمر رفتہ'' میں یہ خاتون کئی مواقعوں اور مقامات پر اچانک مصنف کو مل جاتی ہیں اور کئی کئی روز تک ملاقاتیں جاری رہتی ہیں۔محترمہ امیر خاتون ہیں،ان کے خاوند بھی ایک بڑے سرمایہ دار،ملوں کے مالک ہیں لیکن عمروں کے تفاوت کے باعث ان کے باہمی روابط زیادہ اچھے نہ تھے۔ خاوند اپنی دولت بڑھانے میں مصروف اور نوجوان بیوی خوابوں اور خیالوں کے کسی جزیرے میں گم ناول نگاری میں مصروف کار۔ وہ خود ناول نہیں لکھ سکتی چناں چہ انھیں مصنف کا ساتھ میسر آتا ہے،جن کے لکھے ہوئے کئی ناول اس کے نام سے چھپتے ہیں اور وہ شہرت حاصل کرتی ہے۔مصنف کی تنگ دستی بھی وقتاً فوقتاً دور ہوتی رہی اور خاتون کا کام بھی چلتا رہا۔مصنف کو شادی کی آفر بھی ہوتی ہے۔قربت کے لمحے بھی نصیب ہوتے ہیں اور مال و دولت بھی لیکن مصنف کے بقول:۔

''اس وقت میرے پاس مختلف علمی اور دینی موضوعات پر ۳۰ ہزار سے لگ بھگ نہایت بلند پایہ کتابیں موجود تھیں، جن میں سے اکثر کا مطالعہ کئی کئی دفعہ کر چکا تھا۔ اس مطالعے نے میری سوچ کو بدل دیا تھا۔اس وقت میری عمر ۲۰،۲۲ سال کی تھی لیکن فکری اعتبار سے مجھ پر بڑھاپا طاری تھا اور مجھے اس عمر میں نوجوانوں کی کوئی بھی ادا پسند نہ تھی''۔(۳۲)

چناں چہ یہ سلسلہ اسی پُر اسرار انداز میں پوری آپ بیتی میں چلتا ہے۔''عمر رفتہ'' کا یہ عنصر اسے آپ بیتی کے فن سے نکال کر ناول کی فضاؤں میں لے جاتا ہے اور اس کی سچائی اور صداقت بھی سوالیہ نشان ہے۔اس ایک عنصر کے علاوہ ''عمر رفتہ'' کا لوازمہ عمدہ ہے۔ واقعات کا انتخاب، زندگی کی ارتقائی منازل،مصنف کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور دلچسپیوں کو خوب صورتی سے سامنے لایا گیا ہے۔مصنف نے اپنی زندگی کے ناخوشگوار واقعات،نجی زندگی کے المیوں کا تذکرہ کرنے میں کسی قسم کے اخفا کا مظاہرہ نہیں کیا،پہلی شادی کی ناکامی،بچوں کا خراب ہونا،غربت کی پریشانیاں اور گھریلو الجھنوں کو بلاکم و کاست بیان کیا ہے۔

مصنف کی زندگی ایک سیاح کی طرح کی ہے۔ وہ ساری زندگی سیر وتفریح کرتے رہے اوراس کے باعث اپنی ذاتی زندگی اور مالی معاملات میں مشکلات کا شکار رہے،لیکن خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے تصنیف وتالیف،مطالعہ اور جدوجہد کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ آپ بیتی ایک باصلاحیت فرد کی زندگی کی بھرپور جدوجہد اور مسائل کی عدم دستیابی کے باوجود کئی اداروں اتنا علمی وادبی کام کرنے کے سفر کی داستان ہے۔''عمر رفتہ'' کا اسلوب بیان صاف اور شستہ ہے۔ وہ سہل اور خوب صورت نثر میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر''عمر رفتہ'' ایک اچھی آپ بیتی ہے اور کشمیر اور اُردو آپ بیتی کی روایت میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔لہٰذا''عمرِ رفتہ'' کو زیورطبع سے آراستہ کیا جانا چاہیے۔ یہ نہ صرف ایک فرد کی داستان اور آپ بیتی کے سرمائے میں اضافے کا باعث ہوگا بلکہ سیاسیات کشمیر کے کئی چھپے ہوئے پہلو اور گوشے وا کرنے کے حوالے سے بھی اہم ہے۔

شمشیر سے زنجیر تک (مرزا حسن خان)

''شمشیر سے زنجیر تک'' مرزا حسن خان کی آپ بیتی ہے۔ مرزا حسن خان ۱۹۱۹ء کو گلگت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم گلگت میں حاصل کی۔ میٹرک پونچھ شہر سے کرنے کے بعد سری پرتاب سنگھ کالج سری نگر سے ایف اے کیا۔ ۱۹۳۷ء میں انڈین ملٹری میں بحیثیت کیڈٹ منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں میجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس دوران بہترین کارکردگی کے باعث ملٹری کراس اور برما سٹار کے اعزازات حاصل کیے۔ ۱۹۴۷ء میں ڈوگرہ راج کے خاتمے اور کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ گلگت بلتستان کا علاقہ کرنل مرزا حسن اوران کے ساتھیوں کی جدوجہد ہی کے باعث آزاد ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حالات سازگار ہونے پر پاک آرمی میں کمیشن آفیسر بھرتی ہوئے اور کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ''شمشیر سے زنجیر تک'' کرنل حسن کی ہنگامہ خیز زندگی کی داستان ہے۔ ''شمشیر سے زنجیر تک'' تیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب ''بچپن سے لڑکپن تک'' میں بچپن کے حالات، تعلیمی سرگرمیوں اور کشمیر کے بڑے شہروں سری نگر، جمّوں اور پونچھ میں گزارے دنوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ میٹرک کے دوران پونچھ میں قیام پذیر تھے تو ان ایام کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''یہاں (پونچھ) کی زمردیں وادیاں پھلوں اور پھولوں سے بھرپور تھیں۔ یہ مجاہدوں اور غازیوں کی سرزمین ہے۔ یہاں کے لوگوں کا اخلاص، سادگی اور وفا شعاری بے مثال۔ یہ لوگ جس کے دوست ہو گئے عمر بھر دوستی نبھاتے ہیں۔ یہاں کی آب وہوا اور دوستوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ طبعاً مجھے پونچھی ہی سمجھا جائے''۔(۳۳)

''فوج میں بھرتی'' کے عنوان سے دوسرے باب میں ریاستی پونچھ میں بھرتی کے بعد جموں، سری نگر، اسلام آباد (اننت ناگ)، اونتی پورہ میں اپنی ٹریننگ اور تعیناتیوں کی تفاصیل بیان کی ہیں۔ مختلف شہروں میں مختلف کورسز اور ٹریننگ وغیرہ کے بعد میجر کے عہدے پر ترقی کا احوال تحریر کیا گیا ہے۔

''شادی''، ''محاذ جنگ کی طرف''، ''ملٹری کراس'' کے عنوانات سے ابواب میں اپنی زندگی کے اہم واقعات کو بیان کرنے کے بعد ان کی زندگی تقسیم ہند کے مرحلے پر آن پہنچی۔ ''صبح آزادی کا انقلاب'' کے تحت کشمیر میں شروع ہونے والی تحریکِ آزادی کے اس مرحلے کی روداد آنکھوں دیکھا حال بیان کیا اور پھر آزادی کی جدوجہد میں عملاً شریک ہو کر گلگت بلتستان کی آزادی کے لیے لڑی جانے والی جنگ آزادی کی تفاصیل اگلے تین ابواب میں پیش کیں۔ یہ تفاصیل ایک سفرنامہ نگار کی طرح زمانی ترتیب سے بیان ہوئی ہیں:۔

> ''ہم اپنی پیش قدمی میں یک بعد دیگر پر قبضہ کیے جا رہے تھے، مگر ہراول دستہ ابھی تک جنگل میں غائب تھا۔ بہت دیر تک ہر طرف نظر دوڑانے کے بعد دیکھا تو اگلے جنگل

میں کچھ عمارتوں کے اوپر سکھ رجمنٹ کے بہت سے سپاہی برف ہٹانے میں مصروف تھے۔ اس وردی پوش دشمن کو بے دریغ مارنا بڑا ثواب تھا۔ ان کو وہاں سے فیصلہ کن طریقے سے بھگا کر ہی ہم اس ظالم برف اور جابر پہاڑ پر ٹک سکتے تھے''۔(۳۴)

جہادِ آزادی ۱۹۴۷ء کے خاتمے کے بعد مرزا حسن پاک آرمی میں بھرتی ہو گئے۔ ایک باب میں راولپنڈی سازش کیس کی تفصیلات ہیں۔ ''یاران قفس'' میں اسیری کے رفقا کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یوں یہ رنگا رنگ موضوعات اور عنوانات کا حامل آپ بیتی دستاویزات، تصاویر اور نقشہ جات کے باب پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

کرنل مرزا حسن کی آپ بیتی کا اسلوب بیان عمدہ ہے۔ مختلف مقامات پر اقوام، افراد اور علاقہ پر عمدہ تبصرے بھی موجود ہیں:۔

''کشمیری اتنے ذہین ہیں کہ وہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں اور یہی زائد از ضرورت ذہانت ان کی غلامی کا اصل سبب ہے۔ یہ تر دماغ لوگ جنگ کی خرمستیاں پسند نہیں کرتے''۔(۳۵)

جنگ کے دوران ایک اونچے پہاڑ سے وادی کشمیر کا نظارہ کرتے ہوئے ماضی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں:۔

''درہ کی چوٹی پر پہنچے تھے تو سجدہ شکر کے لیے برف پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ پھر جب آنکھ اٹھائی تو وادی کشمیر دھند کا لحاف اوڑھے مغموم مغموم سو رہی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ نکلا بھی تو اداس اداس سا۔ یہ عجیب ماحول اور عجیب موسم تھا۔ اے حسن جہاں سوز کہاں ہیں وہ شرارے؟ سری پرتاب سنگھ کالج یاد آیا۔ کیڈٹی کے دن یاد آئے اور مخلص ساتھی بھی۔ جن کے ساتھ اس وادی کا کونا کونا چھانتے تھے۔ باغوں، پھولوں، پھلوں، جنگلوں اور جھیلوں سے بھری یہ وادی اب بھارتی فوج کا کیمپ بن گئی تھی۔ کشمیر میں ہر طرف دھواں دھواں تھا۔ فیض کا مصرعہ ع یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر اسی صورت حال پر ہی صادق آتا ہے''۔(۳۶)

جنگ آزادی کا یہ مجاہد منزل آزادی کو بھول کر اقتدار کی جنگ میں برسر پیکار مجاہدوں کی اولاد کو دیکھ کر کڑھتا ہے اور اپنی آپ بیتی کے اختتام پر اس جانب متوجہ کرتے ہوئے رخصت ہوتا:۔

''میں نے آزاد کشمیر کی نورا کشتی (اقتدار کے لیے) دیکھی ہے۔ کہاں جنگِ آزادی کے اصلی مجاہد اور کہاں یہ ہوشیار لوگ۔ بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائے نہ بنے۔ بد قسمت کشمیر کا یہ ٹکڑا اب اس جنگ زرگری کی ایک انوکھی تجربہ گاہ بن گیا ہے، جہاں

مرحومہ آزادی کے بھو کے کارتوس ہر دم زبانی فائر ہوتے رہتے ہیں۔ جو اس صراط
مستقیم سے بھٹک گیا وہ دلائی کیمپ کی طرف سیدھا لڑھک گیا۔ فاعتبر و یا اولی
الابصار''۔(۳۷)

''شمشیر سے زنجیر تک'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت میں اس طور اہم ہے کہ کشمیر کے مقبوضہ اور آزاد حصے کے علاوہ ایک تیسرے حصے گلگت بلتستان کے ایک فرد کی آپ بیتی ہے، جو اس علاقے کے مزاج، معاملات، سیاست اور ثقافت کے رنگوں کو پیش کرتی ہے۔ جسمانی اور ارضی دوریوں کے باوجود اس میں بھی ایک کشمیری کا دل دھڑکتا ہے اور وہ بھی کشمیر کی غلامی پر ماتم کناں اور منزل آزادی سے دور ہونے پر دوسرے کشمیریوں کی طرح پریشان ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عارف بہار، سید: کشمیر تاریخ کے گرداب میں۔ کراچی: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۹۸
۲۔ عارف بہار: کشمیر تاریخ کے گرداب میں، ص ۱۰۶
۳۔ مختار خان، سردار: آزادی کا خوابِ پریشاں۔ راولاکوٹ: مسٹر بکس، سنہ ندارد، ص ۱۴۷
۴۔ جی ایم میر: کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ۔ میر پور: رضوان پبلشرز، ۲۰۰۴ء ص ۲۸۰
۵۔ نشاط انصاری: جموں و کشمیر میں اُردو نثر مختصر جائزہ، مشمولہ ''شیرازہ''، جلد ۳۷، شمارہ ۶، ۸، ص ۱۷۴
۶۔ ظہور الدین، پروفیسر: جموں میں اُردو ادب، مشمولہ ''پاکستان میں اُردو''۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۸
۷۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر: آزاد کشمیر میں شعر و ادب کے پچاس سال، مشمولہ پاکستان میں اُردو (کشمیر)، ص ۱۱۶
۸۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، بیسواں ایڈیشن، ص ۱۱۷
۹۔ جان محمد آزادؔ: جموں و کشمیر کے اُردو مصنفین۔ سری نگر: جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۰۴ء، ص ۴۲۵
۱۰۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ۔ ص ۱۱۲
۱۱۔ احسان اکبر، ڈاکٹر: شہاب نامہ سے شہاب تک، مشمولہ ذکرِ شہاب۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۴
۱۲۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ، ص ۱۲۴
۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱۵
۱۴۔ احسان اکبر، ڈاکٹر: شہاب نامہ سے شہاب تک، مشمولہ ''ذکرِ شہاب''۔ ص ۱۳۷
۱۵۔ قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ، ص ۴۷
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۲۴
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۷۶
۱۸۔ ایضاً، ص ۳۸۳
۱۹۔ ایضاً، ص ۴۰۵
۲۰۔ مسعود قریشی: شہاب نامہ پہلی نظر میں، مشمولہ ''ذکرِ شہاب''۔ ص ۱۱۵
۲۱۔ شہاب نامہ، ص ۵۹۱
۲۲۔ ایضاً، ص ۱۲۴
۲۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: خودنوشت اور اُردو خودنوشت، ص ۱۴۱

۲۴۔ ثریا خورشید، ایم اے: چناروں کے سائے۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء، ص ۳۷

۲۵۔ ثریا خورشید: چناروں کے سائے، ص ۱۸۵

۲۶۔ عبدالرحمٰن کوندو: پیش لفظ، داستانِ حیات۔ دلی: ادارہ ادبیات، ۱۹۸۵ء، ص ۱۳

۲۷۔ میر قاسم، سید: داستانِ حیات، مرتبہ عبدالرّحمٰن کوندو۔ دلی: ادارہ ادبیات، ۱۹۸۵، ص ۱۷

۲۸۔ محمود آزاد، سید: عمر رفتہ، غیر مطبوعہ مسوّدہ، مملوکہ سید سلیم گردیزی، ص ۲۰

۲۹۔ ایضاً، ص ۶۵

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۶

۳۱۔ سلیم گردیزی، سید: مؤرخ کشمیر سید محمود آزاد، مشمولہ ''ارقم'' شمارہ ۳، ۲۰۱۲ء، راولاکوٹ، ص ۱۱۷

۳۲۔ محمود آزاد، سید: عمر رفتہ، ص ۶

۳۳۔ مرزا حسن خان، کرنل: شمشیر سے زنجیر تک۔ جلال گرافکس اینڈ کمپیوٹر، سوم، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۶۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۵۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۴۴۰

باب سوم

کشمیر میں اُردو آپ بیتی

(۱۹۹۱ء تا ۲۰۱۰ء)

فصل اوّل

جدید دور

(۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۰ء)

کشمیر کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ خطہ کئی بار بیرونی حملہ آوروں کے تسلط کا شکار ہوا، مگر کشمیریوں نے کبھی اس تسلط کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ انھوں نے تاریخ کے ہر دور میں بیرونی جارحیت کے خلاف مزاحمت کی۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کی تاریخ کے مستند مؤرخ پنڈت کلہن نے ''راج ترنگنی'' میں لکھا ہے کہ ''کشمیر کو لشکر کشی سے نہیں بلکہ صرف روحانی طاقت سے فتح کیا جا سکتا ہے''۔(۱) چناں چہ کلہن کے اس نفسیاتی تجزیے کے نتیجے میں بھارت نے کشمیر پر قبضے کے لیے جارحیت کے ساتھ ساتھ نفسیاتی حربے، چالاکی، مکاری اور سازشوں کے طریقے اپنائے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک وہ اپنے ان حربوں سے کسی نہ کسی طرح کشمیریوں کو دھوکا دیتا رہا، مگر ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پہلے ایرانی انقلاب اور پھر افغانستان میں روس کی شکست نے کشمیری نوجوانوں کو آزادی کے حصول کے لیے مسلح جدوجہد کی جانب راغب کیا۔

۱۹۸۴ء میں ریاستی اسمبلی کے انتخابات اس مسلح تحریک کے باضابطہ شروع ہونے کا نقطہ آغاز ثابت ہوئے۔ ان انتخابات میں آزادی اور اسلام پسند کشمیری مسلم متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم تلے جمع ہوئے۔ مسلم متحدہ محاذ کی کامیابی کو بدترین دھاندلی سے شکست میں تبدیل کر دیا گیا تو اب کشمیریوں کے پاس مسلح جدوجہد شروع کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ رہا۔ صندوق سے بندوق اور بیلٹ سے بُلٹ تک کے اس سفر کے پیچھے دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کے تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم نسلوں کی ذہن سازی بھی تھی۔ چناں چہ اس مسلح جدوجہد میں شریک کار نوجوانوں کی اکثریت اسی تربیت اور فکر کی پیداوار تھی۔ آغاز میں ان نوجوانوں نے لبریشن فرنٹ کے پرچم تلے کارروائیوں کا آغاز کیا۔ بعد ازاں حزب المجاہدین اور دوسری مسلح تنظیمیں اس میں شامل ہوئیں۔ ان ساری تنظیموں میں شامل نوجوانوں کا تعلق پیپلز لیگ، پیپلز کانفرنس، جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ جیسی تنظیموں سے تھا۔

جہادِ کشمیر کے اس مرحلے میں جہاں بین الاقوامی حالات اور کشمیری نوجوانوں کی بیداری جیسے محرکات کارفرما تھے وہاں پاکستان کے اس وقت کے حکمران جنرل ضیاالحق کی حکمت عملی اور منصوبہ بندی بھی ایک بنیادی اور اہم محرک تھی۔ جنرل ضیاالحق کی موت کے باوجود یہ جدوجہد شروع ہو چکی تھی، مگر ضیاالحق کے بعد پاکستان کے پالیسی سازوں کے پاس نئی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کوئی منصوبہ نہ تھا۔ بہر حال یہ مسلح جدوجہد تیزی سے آگے بڑھنے اور کشمیر میں پھیلنے لگی۔ ۹۰ کی دہائی میں اس نے بھارتی افواج کو ناکامیوں کی طرف دھکیل کر عروج حاصل کرنا شروع کر دیا۔ بھارت نے اسے کچلنے کے لیے بے انتہا ظلم ڈھائے، انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں، مگر ۱۱ ستمبر کے واقعات نے عالمی حالات کو اس طور بدل دیا کہ بھارت دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ کشمیریوں کی جدوجہد عالمی دہشت گردی کا حصہ ہے۔ اس دباؤ کے نتیجے میں پاکستانی حکام نے نئے نئے فارمولے پیش کر کے پوری تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح ایک جنرل (ضیاالحق) کی منصوبہ بندی سے

شروع ہونے والی یہ تحریک دوسرے جنرل (پرویز مشرف) کے ہاتھوں شدید خطرات سے دوچار ہوگئی۔ یوں کشمیر کے مقدر میں آزادی کی سحر طلوع نہ ہوسکی اور ایک لاکھ انسانی جانوں اور اربوں کے مالی نقصانات کے باوجود کشمیری منزل آزادی پر نہ پہنچ سکے۔لیکن منزل کے حصول کے لیے ان کا اضطراب آج بھی موجود ہے۔

دنیا بھر میں مزاحمتی ادب کی اپنی ایک تاریخ ہے۔آزادی کی خواہش ہر دل میں موجود ہوتی ہے۔معاشروں میں موجود غلامی، ظلم، عدم استحکام، جہالت، غربت، پسماندگی اور سیاسی کشمکش سے ہر فرد متاثر ہوتا ہے۔ چناں چہ اس صورت حال سے ملک کا ادیب اور شاعر الگ نہیں رہ سکتا۔ابرار احمد ''مزاحمتی ادب'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ژاں پال سارتر کہتا ہے، ادیب کا قلم اس کا ہتھیار ہے۔ بلکہ فرانسیسی ادیبوں نے تو دوسرے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا کہ وہ بحیثیت ادیب عملی جدوجہد کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو آزاد خیال نہیں کرتے تھے اور آزادی کا حصول ان کا حق تھا، جس کے لیے انھیں ہر محاذ پر لڑنا تھا۔لیکن ایسی جدوجہد ایک ایسے معاشرے میں ہی ممکن ہے، جہاں آزادی کی کوئی نہ کوئی شکل پہلے سے موجود ہو یا پھر استحصالی قوتیں اپنی بالادستی کے نتیجے میں محکوم طبقوں کو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کی سطح پر لے جائیں''۔(۲)

کشمیر میں چوں کہ استحصالی قوتوں کے جبر کی تاریخ پرانی ہے۔اس لیے آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد بھی اسی قدر قدیم ہے۔گزشتہ صدی کے آغاز میں ہی اقبال نے کشمیریوں پر ہونے والے جبر کے خلاف آواز بلند کی۔

پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقروض ہمیں بے پر و بال کیا
توڑ اس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے
روحِ آزادی کشمیر کو پامال کیا (۳)

محمد دین فوقؔ، حبیب کیفوی، طاؤس بانہالی، ضیاالحسن ضیا، احمد شمیم سے لے کر ڈاکٹر صابر آفاقی اور عہد جدید کے کشمیری شعرا تک ہر ایک کے ہاں آزادی کی گونج اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کا موضوع ایک بڑے حوالے کے طور پر موجود ہے۔ اسی طرح نثری اصناف میں آزاد کشمیر، پاکستان اور دنیا بھر میں کشمیری ادیبوں نے اپنی تصانیف کی صورت میں گراں قدر مزاحمتی ادب تخلیق کیا ہے۔موجودہ تحریک آزادی کے حوالے سے کشمیری ادب میں مزاحمتی ادب مرکزی روایت کے طور پر سامنے آیا ہے۔البتہ یہ امر باعث تعجب ہے کہ مقبوضہ کشمیر، جہاں موجودہ تحریک کے دوران سب سے زیادہ قربانی دی گئی، کا ادیب اور

شاعر اس تحریک سے لاتعلقی اور بھارت سے مفاہمت کی پالیسی پر گامزن نظر آتا ہے۔اس کی بڑی وجہ جموں، سری نگر اور پونچھ میں تخلیق ہونے والا ادب ریاستی سرکار کے زیرِ انتظام اداروں، کلچرل اکیڈمی، جامعات اور ادبی انجمنوں کے زیرِ اثر پروان چڑھا ہے۔ چناں چہ وہاں تاریخ، تہذیب وثقافت، ادب وفن، تعلیم وصنعت گری ہر موضوع پر لکھا جاتا رہا مگر تحریک آزادی کشمیر، حقوق انسانی، استحصال اور آزادی جیسے موضوعات سے اصناف تقریباً لاتعلق ہی رہیں۔تحریکِ آزادی کشمیر کے موجودہ مرحلے کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ اُسے اس تحریک میں کوئی ملا طاہر غنی، علامہ محمد اقبال ملا نہ محمد دین فوقؔ، حسرت موہانی، ظفر علی خان، حفیظ جالندھری اور نہ ہی فیض اور فراز۔ یہ سچ ہے کشمیری (مقبوضہ) ادیب کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، پھر بھی وطن کی مٹی اور دین و ایمان ان سے اعلیٰ کردار کا تقاضا کرتے ہیں۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا یہ دور ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۰ء پر محیط ہے۔اس عہد میں آپ بیتی کی ہر قسم موجود ہے۔اس دور میں سید علی گیلانی کی ''رودادِ قفس'' اور امان اللہ کی ''جہدِ مسلسل'' بھی ہیں، جو تحریکِ آزادی کے اس مرحلے کے اہم کردار ہیں۔علمی و ادبی شخصیات میں رشید امجد کی ''تمنّا بے تاب''، کلیم احمد کی ''ریت پر قدموں کے نشان'' جیسی آپ بیتیاں بھی منظر عام پر آئیں۔ سیاسی شخصیات کی آپ بیتیوں میں محمد یوسف چودھری کی ''کاروان یوسف''، اساتذہ اور سرکاری ملازمین کی آپ بیتیوں میں بشیر احمد صدیقی کی ''زندگی ہے یا کوئی طوفان'' اور سردار محمد ایوب کی ''تنگ آمد'' اور خواتین کی آپ بیتیوں میں شملہ مفتی کی ''چلمن سے چمن تک'' جیسی آپ بیتیاں بھی ہیں۔

اُردو آپ بیتی کی صنف کشمیر میں اس دور تک پہنچتے ہوئے کئی مراحل سے گزر کر بالغ نظر ہو چکی تھی۔آپ بیتی کے سامنے کئی انداز اور مثالیں موجود تھیں۔ ذرائع ابلاغ اور جدید ذرائع نے ہندوستان، پاکستان اور دوسرے ملکوں میں تخلیق ہونے والی آپ بیتیوں تک رسائی آسان کر دی تھی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں کشمیری مشاہیر کی آپ بیتیوں میں بھی مختلف انداز کی آپ بیتیاں موجود ہیں۔اس دور کی نمایاں آپ بیتیوں کے مطالعے کا آغاز تحریکِ آزادی کے اہم رہنما سید علی گیلانی کی ''رودادِ قفس'' سے کیا جاتا ہے۔

روداد قفس (سید علی گیلانی)

''رودادِ قفس''، کشمیر کی تحریکِ آزادی کے اہم رہنما، سابق چیئرمین کل جماعتی حریت کانفرنس اور جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر کے مرکزی ذمہ دار سید علی گیلانی کی آپ بیتی ہے۔ سید علی گیلانی تحریکِ آزادی کی علامت اور جہاد و حریت کی موجودہ داستان کا اہم استعارہ ہیں۔ انھوں نے جدوجہد آزادی میں اپنی زندگی کے بہترین سال جیلوں کی نذر کیے۔ وہ بیس سال سے زائد عرصہ بھارتی عقوبت خانوں میں رہ کر آزادی کی شمع کو جلاتے رہے اور اس بات کا اعلان کرتے رہے:

جب کسی قوم کا دستور لکھا جاتا ہے
گھر میں چھپ کر نہیں سر طور لکھا جاتا ہے
انگلیاں کاٹ کر دیوار میں زنداں کی کبھی
حکم آزادیٔ جمہور لکھا جاتا ہے

سید علی گیلانی کی زندگی کا بیشتر حصہ چوں کہ جیلوں میں گزرا ہے اس لیے ''رودادِ قفس'' ایک داستان عزیمت ہے۔ ''رودادِ قفس'' نہ صرف ایام جیل کی کہانی ہے بلکہ جدوجہد آزادی کی مکمل تاریخ اور گیلانی کی زندگی کے شب و روز کی عکاس بھی ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

> ''برصغیر کی جیلوں نے بڑے بڑے مجاہدوں کے طوق و سلاسل کی گونج سنی ہے، لیکن دورِ جدید میں جس فرزانے کی ''جیل یاترا'' کو ایک منفرد مقام حاصل ہے وہ کشمیر کی تحریک اسلامی کا بے باک ترجمان سید علی گیلانی ہے، اس کی داستان حیات کی ورق گردانی کرتے ہوئے دل بے ساختہ پکار اٹھتا ہے ع ایسی چنگاری بھی یاربّ اپنے خاکستر میں ہے''۔(۴)

نواب زادہ نصر اللہ خان کے مطابق:۔

> ''رودادِ قفس'' تاریخ جہاد کا سنہری باب ہے''۔(۵)

سابق ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف جنرل کے ایم عارف لکھتے ہیں:۔

> ''رودادِ قفس'' میں سید علی گیلانی نے بھارت کے اصل چہرے کو بے نقاب کیا ہے''(۶)

سید علی گیلانی کی پوری زندگی بھرپور اور پُر آشوب ہنگاموں میں گزری ہے۔ انھوں نے مشکل حالات میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ بچپن میں غربت، پریشانی، تنگی، عسرت اور نا موافق حالات سے گزر کر سیاست کے میدان میں آئے۔ جماعت اسلامی میں شامل ہو کر انھوں نے اور زیادہ مشکل راستے کا انتخاب کر لیا۔ تحریکِ آزادی کے ہدی خواں اور رہنما ہو کر وہ گویا مشکلات کے بحرِ بے کراں میں کود پڑے۔ چناں چہ اُن کی اس بھرپور زندگی کی یہ داستان بھی کئی حوالوں سے منفرد اور

بھرپور ہے:۔

''لوگ آپ بیتی لکھتے ہیں اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے اور خودنوشت سوانح عمریاں ''میں'' ہی کے گرد گھومتی ہیں، لیکن سید علی گیلانی کی آپ بیتی ایک تحریک اور جدوجہد کی کہانی ہے۔ بات آخری گرفتاری (اپریل ۱۹۹۰ء) سے شروع ہوئی اور پھر کشمکش سے بھرپور ایک پوری زندگانی پردہ سیمیں پر فلم کی مانند جلوہ فگن ہوگئی ہے اور قاری داستان کے مرکزی کردار سے بھی کہیں زیادہ اصل جدوجہد میں گم ہوجاتا ہے، جیسے وہ خود بھی اس جہاد کا ایک کردار رہا ہو''۔(۷)

خواجہ غلام پنڈت ''رودادِ قفس'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''سید علی گیلانی ڈرائنگ روم کے مصنف نہیں بلکہ میدان عمل اور سچائی اور پامردی کے امین ہیں''۔(۸)

''رودادِ قفس'' پہلی بار ۱۹۹۳ء میں الہدیٰ پبلشنگ ہاؤس سری نگر نے شائع کی۔ بعدازاں ۱۹۹۳ء ہی میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد نے اسے دوجلدوں میں شائع کیا۔ اب تک اس کے دس ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ ستر ابواب پر مشتمل یہ طویل داستان عزیمت اپنے خوبصورت اسلوب، بہترین لوازمے اور موضوعاتی انتخاب کی وجہ سے اوّل تا آخر دلچسپی اور انہماک سے پڑھی جانے والی آپ بیتی ہے۔

کتاب کا آغاز دلچسپ انداز میں ''خواب'' کے عنوان سے ہوتا ہے، ''ام انسہ کا خواب'' (۱۹۹۰ء) سے داستان اسیری کا آغاز ہوکر فلیش بیک کی طرز پر اسیری کی داستان پیچھے ۱۹۶۲ء تک چلی جاتی ہے۔

''۹/اپریل ۱۹۹۰ء سوموار کا دن تھا اور رمضان المبارک کا مہینہ تھا، گیلانی منزل ڈورو، سوپور میں سادہ سے پارک میں امّ انسہ (بیگم علی گیلانی) کے گرد تینوں بیٹیاں آنسہ، ثریا اور فرحت ہالہ بنائے بیٹھی تھیں۔ آسمان پر سفید بادل کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہی تھیں، جیسے آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں'' (۹)

پھر ''رودادِ قفس میں'' علی گیلانی جیل یاترا، گھر، خاندان اور احباب کا تعارف کراتے ہوئے، تحریکِ جہاد آزادی، تاریخ کشمیر، بھارت کے عقوبت خانوں کی داستان اور کشمیر کے تاریخ اور جغرافیے کی جانے کن کن منزلوں سے گزر جاتے ہیں۔ خارجی حالات وکوائف کے ساتھ ساتھ جذبات واحساسات اور دل کی کیفیات بھی ''رودادِ قفس'' میں بیان ہوئی ہیں:۔

''دل کی کیفیت کا خامہ فرسائی کے ذریعے بہت کم اظہار ہوسکتا ہے اور دنیا میں بہت

ہی کم لوگ ایسے ہیں، جو دل کے خوں کو قلم کے ذریعے ٹپکا کے خود بھی روتے ہیں اور
دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں، جو محسوس کیا بغیر کسی لاگ
لپٹ اور رنگ آمیزی کے سیدھے سادے لفظوں میں کہہ دیا، جو محسوس کیا کہہ بیٹھے۔
سیدھے سادے لفظوں میں، ہم دیوانے کیا جانیں، کیا شے دانائی ہوتی ہے''۔(۱۰)

اسی سیدھے سادے انداز، خلوص اور سچائی کے بیان نے علی گیلانی کی ''رودادِ قفس'' کو کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سرمائے میں خوبصورت اضافہ بنا دیا ہے۔ آپ بیتی کے فن کی اس بنیادی خوبی سے گیلانی اچھی طرح آگاہ ہیں۔ انھوں نے بغیر کسی لاگ لپٹ کے اپنی زندگی کو ایک خوبصورت اور مربوط بیانیے میں پیش کرتے ہوئے واقعات، خیالات اور نظریات کو بھی اس میں پیش کیا ہے۔ اس وجہ سے ''رودادِ قفس'' صرف جیل کی تنہائیوں اور مشکلات کا بیان ہی نہیں بلکہ بقول پروفیسر خورشید احمد:

''چمن کی بربادی، چمن کے شیدائیوں کی فداکاری اور چمن کے ان باغبانوں کی ان
تھک مساعی کی پوری داستان ہے، جو گل چیں کے ہر وار کا جواب نئی روش بندی اور
نت نئی گل کاری سے دینے میں مصروف ہیں''۔(۱۱)

''رودادِ قفس'' کے ایک ایک ورق سے علی گیلانی کی شاعری اور ادب سے دلچسپی عیاں ہوتی ہے۔ سید علی گیلانی کی اقبال شناسی، اُن کی دیگر کتب اور بالخصوص ''اقبال روح دین کا شناسا'' سے واضح ہے۔ چناں چہ علامہ اقبال کے اشعار کتاب میں جا بجا ہیں۔ اقبال کے علاوہ مرزا غالب، حفیظ میرٹھی، جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، شکیل بدایونی، وحید اختر، فیض احمد فیض اور غنی کاشمیری کے خوبصورت اشعار سے نفس مضمون کو مزین کیا گیا ہے۔ اکثر ابواب کا آغاز اور اختتام شعر سے ہوتا ہے۔ ذیلی عنوانات میں بھی یہی التزام رکھا گیا ہے۔ ''رودادِ قفس'' سے اُردو کے بلاشبہ سیکڑوں خوبصورت اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا — اقبال

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں — مرزا غالبؔ

بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے — حفیظ میرٹھی

ہے مشق ستم جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی — حسرت موہانی

دیارِ یار تیری جوشِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر فیض احمد فیض

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری فیض احمد فیض

بھارت کے جمہوری نظام کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''بھارت کا جمہوری نظام بظاہر مغرب کے روایتی جمہوری نظام کی نقل ہے، اس لیے اس کے اندرونی خدوخال دیکھیں گے تو آپ یقیناً چنگیزیت اور درندگی کے نظام کا ہو بہو عکس پائیں گے، بلکہ بعض مواقع پر آج کے ان مظالم کی تلخی اور شدت اور بڑھ گئی ہے''۔(۱۲)

گیلانی ''رودادِ قفس'' میں بھارتی مظالم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے چشم دید واقعات بیان کرنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے اپنے جذبات کو بے قابو ہونے سے بچا نہیں پاتے۔ اپنے شگفتہ اور خوبصورت اسلوب بیان میں خون کے آنسو بہاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''جبر واستبداد اور سفاکیت کی یہ داستانیں تاریخ عالم میں بہت کم دہرائی گئی ہوں گی۔ نرم نرم اور کومل کومل پھولوں کے سینوں پر جب آپ پتھر توڑنا شروع کریں گے تو ان شگفتہ اور نازک پھولوں کا کیا حال ہوگا۔ پھر ان کو دیکھنے والی آنکھوں اور ان کے حال زار کو محسوس کرنے والے حساس دلوں کا کیا حال ہوگا؟

دلِ انساں پہ حوادث کی یہ چوٹیں توبہ!
پھول کے سینے پہ توڑے گئے پتھر کتنے!''(۱۳)

تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اس دورِ رحمت کی یادگار محمد شفیع ملک، غلام حسین رضوی مرحوم، محمد حسین چشتی، حافظ محی الدین مرحوم، محمد یعقوب رفیقی، محمد شفیع شاہ، پیر غلام احمد گلاب، غلام محمد بیگ مرحوم، قاری سیف الدین، حکیم غلام حسن، مولانا احرار، حکیم غلام نبی، محمد عبداللہ شیدا، غلام رسول عبداللہ مرحوم اور محترم سعدالدین، جو امیر جماعت اسلامی ہوا کرتے تھے۔ یہ سری نگر خاص کے کچھ چیدہ چیدہ اور نمایاں افراد تھے۔ سری نگر کی حدود سے باہر وادی اور پوری ریاست کے افراد جمع ہو جاتے تھے تو ان ایام سے بڑھ کر ہماری زندگی میں مسرت

اور شادمانی کی گھڑیاں کوئی اور نہیں ہوتی تھیں۔خلوص ومحبت کا وہ سماں تھا کہ انصار اور مہاجر کی مقدس اور بہار آفریں یادیں تازہ ہوجاتی تھیں''۔(۱۴)

انٹروگیشن سنٹرز اور جیلوں میں ہونے والے سلوک کا نقشہ کھینچتے ہوئے علی گیلانی رقم طراز ہیں:۔

''اس میں انٹروگیشن کی وہ سختیاں ہوتی ہیں کہ جواں سال اور توانا افراد کا زیرہ آب ہو جاتا ہے۔زدوکوب، بیڑیاں پہنا کر کھڑا رکھنا، رات کو بیدار رکھنا یہاں پھنسے افراد کا معمول تھا۔ یہاں کا عملہ جہنم کے داروغوں سے مشابہہ ہے، جو بڑے تندخُو، سخت گیر، فحش اور غلیظ زبان استعمال کرنے والے، بات بات پر گالیاں بکنے والے، نہایت ترش روئی سے پیش آنے والے ہیں۔آپ کتنے ہی معصوم و بے گناہ ہوں لیکن ان کے نزدیک آپ ''قاتل''، ''دہشت گرد''، ''تخریب کار'' اور پرلے درجے کے ''فرقہ پرست'' ہیں''۔(۱۵)

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے علی گیلانی کا مؤقف واضح اور دوٹوک ہے اور اس پر وہ اوّل روز سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہر بار ''جیل یاترا'' کے بعد وہ علی الاعلان اپنے مؤقف کا اعادہ کرتے ہیں۔دوسری جلد کے آخری حصے میں اپنے مؤقف کا ایک بار پھر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اگر عالمی دباؤ کے باعث پاکستان اور بھارت استصواب رائے کے بجائے کسی دوسری صورت پر غور کرنا چاہتے ہیں۔اس صورت حال میں ہمارا مؤقف یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر بھارت اور پاکستان کا سرحدی تنازعہ نہیں ہے، جسے وہ آپس میں مل بیٹھ کر طے کرلیں۔ یہ ریاست جموں وکشمیر کے ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں کی آزادی اور حق خود ارادیت کا مسئلہ ہے اور انھیں فریق بنائے بغیر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ از خود کوئی فیصلہ کر ڈالیں۔البتہ تینوں فریقوں اہلِ کشمیر، پاکستان اور بھارت اقوامِ متحدہ کی پاس کردہ قراردادوں اور پاکستان اور بھارت کی تسلیم کردہ قراردادوں اور تقسیم ہند کے اصولوں کی بنیاد بنا کر ایسے تصفیے پر پہنچ جائیں جو سہ فریق کو بلا جبر وکراہ تسلیم ہو اور ریاست کی تینوں اکائیوں کے لیے بھی قابل قبول ہو، تو وہ فیصلہ دیرپا ثابت ہوسکتا ہے''۔(۱٦)

رجال کے تذکرے میں علی گیلانی نے نہ صرف اعتدال اور توازن کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ دوسروں کی خوبیوں اور

صلاحیتوں کے بیان میں بھی کسی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ''رودادِقفس'' میں اپنے ساتھیوں اور جماعتی وابستگی کی بنیاد پر قائم حلقہ یاراں کے ساتھ ساتھ مخالفین اور دوسری جماعتوں اور تحریکوں کے افراد کا بھی معتدل بیان موجود ہے۔ رجال کے تذکرہ میں اُن کی خوبیوں اور صلاحیتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے خاکہ نگاری کے فن کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے:۔

''سوری صاحب میانے قد میں کیم شحیم، خوش رو، خوش پوش اور خوش ذوق لگتے تھے۔
چہرے کا رنگ نکھرا ہوا، گندمی ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، جیسے چھلکتے جام اور
زبان بڑی تیز وطرار تھی۔

ساہنی صاحب چہرے مہرے سے پچاس کی سرحد پار کیے لگ رہے تھے۔ سانولا رنگ،
پرشکن جبین، متین اور حسین کلام، قدرے قد آور، دلائل کی جنگ لڑنے کے بجائے
مصالحت کے قائل، سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر تشریف فرما تھے''۔(۱۷)

اس طرح کی کردار نگاری ''رودادِقفس'' میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ درج بالا اقتباسات سے ''رودادِقفس'' کے نثری اسلوب کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ''رودادِقفس'' کے اسلوب، موضوع اور اُردو ادب میں اس کے مقام پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:۔

''رودادِقفس'' (علی گیلانی کی گرج دار شخصیت کی نسبت) ایک دوسری نوعیت کی تحریر
ہے۔ یہ حسن خیال اور حسن بیان دونوں کا ایک حسین مرقع ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ
سرگزشت جہاد کشمیر کی ایک معتبر تاریخ ہی نہیں، نئی نسلوں کے ایمان اور عزم کی آبیاری
کا ایک مؤثر ذریعہ ہوگی اور اُردو ادب کے لیے تو یہ بلاشبہ ایک روشن چراغ ہے، جس
کی لَو دلوں کو گرمائے اور ماحول کی تاریکی کو دور کرنے کا ذریعہ بنے گی''۔(۱۸)

عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:۔

''رودادِقفس'' میں علی گیلانی ایک خوبصورت نثر نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں''۔(۱۹)

''رودادِقفس'' کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی اُردو آپ بیتیوں میں اپنے خوبصورت اسلوب بیان، مربوط اور عمدہ بیانیے، واقعات اور حالات کے فطری تسلسل کے باعث ایک بہترین آپ بیتی ہے۔ اس کی ابواب بندی، ذیلی ابواب کا طریق کار، ان کا نفس مضمون کے ساتھ عمدہ ارتباط اور اشاعتی معیار اس کے ظاہری و اندرونی حسن میں اضافے کا باعث ہے۔ سید علی گیلانی کشمیر کے ایک بالغ نظر رہنما، شعلہ نوا مقرر اور صاحب طرز ادیب ہیں۔ چناں چہ ان کی آپ بیتی کا قرینہ اور بیان فصیح، دلکش اور پُر لطف ہے، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سید علی گیلانی کی ساری عمر آزادی کی جدوجہد

میں گزری ہے۔مشکل ترین حالات میں انھوں نے آزادی کے قافلے کی قیادت سنبھالی تھی۔ جب کلمہ حق کہنا انگاروں پہ چلنے کے مترادف تھا۔کشمیر(مقبوضہ) کے حکمران بھارت کے ساتھ مفاہمت کے ذریعے ملک کی آزادی کا سودا کر چکے تھے اور وہ ایسے رہنما تھے، جو بدقسمتی سے کشمیریوں کے ہیرو اور اُن کے دلوں میں بستے تھے۔گیلانی کے عہدِ جوانی میں کشمیری اپنے محسنوں کو کانٹوں کا تاج پہنانے اور غداروں کو آنکھوں پر بٹھانے کی راہ پر گامزن تھے۔گیلانی نے کانٹوں بھرے راستے کا انتخاب کیا۔ چناں چہ اُن کی مہم جویانہ زندگی کی اس داستان میں ہمت، ولولہ، جوش، جذبہ کے ساتھ ساتھ قدرت بیاں کے جوہر بھی موجود ہیں۔اشعار کا خوبصورت اور برمحل استعمال اور عمدہ نثر نے ''رودادِ قفس'' کی ادبی نوعیت اور اہمیت بھی بڑھادی ہے۔''رودادِ قفس'' میں دیانت داری کے ساتھ نہ صرف تاریخی حقائق بیان ہوئے ہیں بلکہ بھارت کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی سچی اور چشم دید گواہیاں پیش کر کے اسے ایک تاریخی دستاویز بنادیا ہے۔علی گیلانی نے حقائق کو کسی رنگ آمیزی کے بجائے سچائی اور حقیقی طور پر پیش کیا ہے اور تاریخی واقعات کے بیان میں بھی انھوں نے حقائق کو چھپانے یا اُنھیں بدلنے کی کوشش نہیں کی۔''رودادِ قفس'' نہ صرف ایک تاریخی دستاویز ہے بلکہ تحریکِ آزادی کے ۱۹۹۰ء کے مرحلہ کی اہم کتاب اور علی گیلانی کی زندگی کے ایک بڑے حصے کی داستان بھی ہے۔البتہ یہ جزوی ہے، جس میں گیلانی کی ذاتی زندگی کم ہے۔ علی گیلانی کا طرزِ زیست ایک مکمل بھرپور آپ بیتی کی اجازت تو شاید اُنھیں نہ دے، مگر زندگی کی ہماہمی، سیاست اور تحریکِ آزادی کے ہنگاموں میں کسی قدر فرصت نصیب ہو تو ان کا طرزِ بیان انھیں کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی ایک عمدہ آپ بیتی ضرور تصنیف کرواسکتا ہے۔

جہدِ مسلسل (امان اللہ خان)

''جہدِ مسلسل''، ریاست جموں و کشمیر کی آزادی اور خودمختاری کے لیے جدوجہد کرنے والی تنظیم لبریشن فرنٹ کے قائد امان اللہ خان کی آپ بیتی ہے۔ امان اللہ خان ۲۴/اگست ۱۹۳۴ء میں استور (گلگت) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد نمبردار جمعہ خان استور کے چند پڑھے لکھے افراد میں سے تھے۔ امان اللہ اپنے والد کی دوسری شادی سے اکلوتے بیٹے تھے، جب کہ ان کے والد کی پہلی بیوی کی چھے بیٹیاں تھیں۔ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں امان اللہ ''جہدِ مسلسل'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''میں والد صاحب کی زندگی میں انتہائی ناز و نعم سے پلا تھا، لیکن اُن کی آنکھیں بند ہوتے ہی میری زندگی یکسر بدل گئی۔ خاندان والے مجھے جان سے مار دینا چاہتے تھے تا کہ نمبرداری اُن کے خاندان کو منتقل ہو جائے۔ انھوں نے مجھے زہر دے کر مار ڈالنے کی بھی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ چناں چہ میری سخت نگرانی کی جاتی تھی اور میری حیثیت ڈھائی سال کی عمر سے ایک قیدی کی سی ہو گئی تھی''۔(۲۰)

ابتدائی تعلیم استور میں ہی حاصل کرنے کے بعد امان اللہ خان نے ۱۹۵۰ء میں سری نگر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر وہ ایس پی سنگھ کالج سری نگر میں داخل ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پہلے راولپنڈی اور پھر ایڈورڈ کالج پشاور میں داخل ہوئے۔ ایف ایس سی کے بعد بی اے اور لا کی ڈگریاں کراچی میں حاصل کیں۔

امان اللہ خان نے کالج کے زمانے سے ہی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ مقبول بٹ شہید کے ساتھی اور ان کے نظریے خودمختار کشمیر کے حامی تھے۔ چناں چہ مختلف تنظیموں سے ہوتے ہوئے لبریشن فرنٹ کے قائد کی حیثیت سے اس جدوجہد میں مصروف کار رہے۔ ''جہدِ مسلسل''، امان اللہ خان کی اسی بھرپور زندگی اور اس عہد کے سیاسی حالات کا احوال ہے۔

امان اللہ خان نے اپنی جوانی میں بطور مدرس اور صحافی مختلف اداروں میں ملازمت کی۔ وہ بنیادی طور پر صحافی تھے۔ چناں چہ ان کی آپ بیتی کا اسلوب بھی ایک روداد نگار کا سا اور صحافیانہ ہے۔ ''جہدِ مسلسل''، امان اللہ خان کی ذاتی زندگی سے جڑے واقعات کا سیدھا سادہ بیان ہے۔ اس حوالے سے ''جہدِ مسلسل'' کی کوئی ادبی اہمیت یا آپ بیتی کے فنی نقطہ نظر سے زیادہ افادیت نہیں ہے۔ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی دوسری اہم آپ بیتیوں کے مقابلے میں اس کی اہمیت محض تاریخی ہے۔ تحریکِ آزادی کشمیر اور کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے امان اللہ اور لبریشن فرنٹ کا اپنا ایک الگ مؤقف ہے۔ وہ کشمیر کی خودمختاری کے علم بردار ہیں۔ چناں چہ ''جہدِ مسلسل''، بھی دراصل ان کی اس جدوجہد کی کہانی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:۔

> ''موضوعات کے لحاظ سے سب سے مشکل کام اپنی سوانح عمری لکھنا ہے۔ کیوں کہ خود نوشت سوانح عمری پر سب سے زیادہ تنقید ہوتی ہے۔ بے شمار لوگ جن کا سوانح نگار

سے کسی نہ کسی طرح کا واسطہ رہا ہو اس سے اس لیے ناراض ہوتے ہیں کہ کتاب میں
ان کا ذکر نہیں آیا''۔(۲۱)

چناں چہ امان اللہ کا آپ بیتی کے حوالے سے تصور اپنے اور دوسرے افراد کے تذکرے تک محدود ہے اور یہ تذکرہ بھی اگر محض ایک روداد کی طرزِ پر بیان کر دیا جائے تو آپ بیتی کو بے جان اور غیر اہم بنا دیتا ہے۔ ڈاکٹر صغیر اپنے مقالہ ''کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اُردو ادب'' میں ''جہدِ مسلسل'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''جہدِ مسلسل'' ایک سیاسی سوانح عمری ہے۔ لہٰذا اس کو کڑے ادبی معیار پر پرکھنا عین
انصاف نہیں ہے''۔(۲۲)

''جہدِ مسلسل'' کی اہمیت البتہ سیاسی اعتبار سے ہے۔ کشمیر کی آزادی اور مستقبل کے حوالے سے تھرڈ آپشن یعنی کشمیر کو بطور ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے تسلیم کیا جائے کے، علم بردار اور جدوجہد کرنے والے کے طور پر امان اللہ خان معروف ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ رہنے یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے حامیوں کے ساتھ ساتھ اس تیسرے مؤقف کے حوالے سے دلائل اور جدوجہد کی وجہ سے اہمیت موجود ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر صغیر لکھتے ہیں:۔

''ایک اچھی اور ادبی محاسن کی حامل سوانح کے خصائص اگرچہ ''جہدِ مسلسل'' میں موجود نہیں
ہیں لیکن تحریکِ آزادی سے متعلق سوانحی ادب میں اس کی اپنی جگہ بہر حال موجود ہے''۔(۲۳)

امان اللہ خان نے دراصل ''جہدِ مسلسل'' میں اپنے مؤقف یعنی خودمختار کشمیر کے حوالے سے تاریخی شواہد، دلائل اور دستاویزات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''جہدِ مسلسل'' کے دو حصے ہے۔ پہلا حصہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا اور دوسرا حصہ ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پہلا حصہ کسی قدر مصنف کی آپ بیتی کو بھی بیان کرتا ہے، مگر دوسرے حصے میں پہلے باب کے علاوہ باقی نو (۹) ابواب کا اُن کی آپ بیتی سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ان نو ابواب میں مصنف نے لبریشن فرنٹ کے نظریات، مقاصد، طریق کار اور تنظیم کے علاوہ مختلف حوالوں سے تنظیم کا مؤقف اور کارگزاری کی روداد بیان کی ہے۔ یہ تفصیلات بھی محض ایک مصنف کی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں انھیں مصنف اپنی زندگی سے باہم مربوط کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس طرح یہ سب تفصیلات یہاں غیر ضروری محسوس ہوتی ہیں۔

تمنا بے تاب (ڈاکٹر رشید امجد)

پاکستان کے ممتاز افسانہ نگار اور محقق ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کا اہم حصہ ہے۔ڈاکٹر رشید امجد سری نگر کشمیر میں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔اپنی ابتدائی زندگی سری نگر میں بسر کی۔۱۹۴۷ء کے دوران پہلے مظفر آباد پھر راولپنڈی منتقل ہوئے۔تعلیم اور ملازمتوں کا سلسلہ یہیں دراز ہوتا گیا۔ادب میں رشید امجد کا شمار پاکستان کے ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔تخلیق کے علاوہ وہ تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی برسرِ پیکار ہیں۔ان کی متعدد کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔

''تمنا بے تاب'' اُردو ادب کی آپ بیتیوں میں اپنے انداز، اسلوب کے ساتھ ساتھ اپنی پیش کش میں بھی منفرد ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے معروف آپ بیتیوں کی طرح اس میں نہ تو ابواب بنائے ہیں اور نہ ہی سرخیاں اور ذیلی سرخیاں۔خالص ادبی انداز میں تمہید کے ساتھ وہ اپنی پیدائش سے بات شروع کرتے ہیں۔ایک طویل مضمون کی صورت میں اپنی زندگی کی داستان بیان کرتے ہوئے وہ اس سے جڑے واقعات، خیالات اور تجزیے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔کہیں رکتے ہیں اور نہ مڑ کر پیچھے دیکھتے ہیں، بس آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔وہ ایک راوی کی حیثیت سے کہانی بیان کرتے ہیں، جس میں رنگ رنگ کے منظر اور کئی طرح کے الجھے موڑ آتے ہیں، مگر وہ ایک ستھرے اور نکھرے ہوئے اسلوب بیان میں ان سے گزر جاتے ہیں۔اسی طرح قاری بھی اس میں کھو کر پڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور پھر تین سو کے لگ بھگ صفحات ختم ہو جاتے ہیں۔''پہلی بات'' میں ڈاکٹر رشید امجد رقم طراز ہیں:۔

> ''معروف معنوں میں یہ خود نوشت نہیں بلکہ یادیں، خیالات اور مختلف اشیا کے بارے میں میرے نقطہ ہائے نظر ہیں، جن میں میری نجی زندگی اور میرا عہد دونوں شامل ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا اسے بغیر تعصب کے بیان کر دیا ہے''۔(۲۴)

''تمنا بے تاب'' کی موضوعی اعتبار سے خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر رشید امجد نے اپنی زندگی کی کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا علمی، فکری اور ادبی منظر نامہ بھی بیان کر دیا ہے۔ایک فرد کی داستان میں چاہے کتنی ہی دلچسپیاں موجود ہوں کسی دوسرے کے لیے حیرتوں اور دلچسپیوں کا سامان کم ہی ہوتا ہے۔ڈاکٹر رشید امجد کے تجزیات اور خیالات نے اس کتاب میں دوسروں کے لیے دلچسپی کا ایک جہاں شامل کر دیا ہے، جس سے اس پورے عہد کے ادب کی ایک تصویر نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

> ''ان یادداشتوں میں ذاتی احوال کے ساتھ ساتھ بعض ایسی بحثیں بھی شامل ہیں، جو کسی حد تک مضمون بن گئی ہیں۔اس طرح بعض تجزیے خاصے پھیل گئے ہیں، لیکن یہ سب

میری زندگی کا حصہ ہیں۔ میں ان سب میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہوں۔ ان سے میرا
نقطہ نظر بھی واضح ہوتا ہے اور میری پوری نسل کے ادبی وفکری مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے،
نیز یہ کہ میرے عہد کی ایک تصویر بنتی ہے، اچھی بری جو کچھ بھی ہے، سو ہے''۔(۲۵)

''تمنا بے تاب'' میں ڈاکٹر رشید امجد کی زندگی اور ان کے عہد کے علمی و ادبی حالات اس طرح سے باہم مربوط ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے بچپن کی کشمیر سے جڑی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''جھیل ڈل کے علاوہ دو اور جگہیں جو ابھی تک میرے ذہن میں نقش ہیں، درگاہ
حضرت بل اور شاہ ہمدان کا مزار ہے۔ ان دونوں جگہ میں امی کے ساتھ جاتا۔ امی کو
درگاہوں اور مزاروں پر جانے کا چسکا تھا۔ عموماً جمعرات اور سوموار کو امی، میں اور علیا
چاچا کسی نہ کسی درگاہ پر ضرور جاتے۔ شاہ ہمدان اور درگاہ حضرت بل، دریا کے قریب
ہیں۔ ان کا ماحول عجب طرح کا پُر اسرار اور خاموش ہے۔ خصوصاً شاہ ہمدان کی درگاہ
میں ایک ایسا اسرار ہے، جو ہر آنے والے میں ایک روحانی لہر دوڑا دیتا ہے''۔(۲۶)

پھر جب راولپنڈی میں مختلف ملازمتوں کے دوران ادب کے میدان میں آنا ہوا تو اس کا احوال، شخصیات کے تذکرے، ادبی محافل، ادبی رسائل کا بیان، ادبی مشاہیر کا احوال، جزو کل پورے تسلسل اور روانی کے ساتھ ''تمنا بے تاب'' میں بیان ہوا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ جیسے ایک انسائیکلو پیڈیا کھل گیا ہے۔ بقول شمس الرحمان فاروقی ''حیرت ہوتی ہے آپ نے اس کتاب میں کتنی دلچسپیاں اور کتنی نکتہ آفرینیاں بھر دی ہیں''۔(فلیپ تمنا بے تاب)۔

ڈاکٹر رشید امجد اُردو کے ایک بڑے افسانہ نگار ہیں۔ چناں چہ اسلوب بیان کے حوالے سے ''تمنا بے تاب'' میں افسانوی انداز اگرچہ ہے مگر اس میں بھی سادگی اور صداقت کے عناصر نمایاں ہیں۔ ''تمنا بے تاب'' کے اسلوب بیان کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن کتاب کے فلیپ میں لکھتے ہیں:۔

''رواں اور بلا جھجک اندازِ تحریر نے متاثر کیا، حالاں کہ خودنوشت میں ایسے کافی سخت
مقام آتے ہیں، جہاں برملا گوئی ممکن نہیں ہوتی۔ آپ کے سفر نامہ حیات میں ایسے
مقامات لاتعداد ہیں جہاں داد دینے کو جی چاہا ہے، خصوصاً ترقی پسندی کے معاملات کا
احاطہ کرنے کی کوشش میں آپ کی یافت بے مثال ہے''۔(۲۷)

تذکرہ رجال میں بھی سیکڑوں نام ہیں اور ان میں علیا چاچا سے لے کر عہد حاضر نے بڑے بڑے شاعر، ادیب، دانشور ہیں جن سے ملاقاتوں، باتوں اور مباحث کا بیان ہے۔ بعض شخصیات کی زندگی کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور اُن کی شخصی اور

ادبی زندگی کے کئی رخ واضح ہوتے ہیں:۔

> ''اپنے عہد کے جن سینئر ادیبوں سے مختلف اوقات میں کسی نہ کسی حوالے سے ملنے کا اتفاق ہوا اُن میں فیض، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، راشد، جوش، مظفر علی سید ہیں۔فیض سے جو دو چار ملاقاتیں ہوئیں وہ ایوب مرزا کے گھر ہوئیں۔فیض صاحب جس طرح ہلکی پھلکی شاعری کرتے تھے اسی طرح ان کی گفتگو بھی تھی۔فیض صاحب ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے یہاں کوئی بڑا سوال اور کوئی بڑا فلسفیانہ مسئلہ نہیں لیکن روایت سے جڑت اور روایت کی چاشنی کو سلیقے کے ساتھ برتنے کی وجہ سے ان کی شاعری میں لطف پیدا ہو گیا ہے''۔(۲۸)

کشمیر سے اپنے تعلق اور روایت سے جڑے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد ''تمنا بے تاب'' میں جگہ جگہ اپنے کشمیری ہونے کا تذکرہ بھی کرتے ہیں:۔

> ''پنڈی میں کشمیری کھانوں کا ایک ہوٹل پرانے قلعہ میں اب بھی روایت نبھا رہا ہے۔ اس ہوٹل کے مالک بارہ مولہ کے رہنے والے تھے۔ان کے دور میں تو خیر یہاں کا لطف ہی اور تھا لیکن اب ان کے بیٹے اسے چلا رہے ہیں۔ یہاں آنے والے مخصوص لوگ ہیں۔سنا ہے نواز شریف بھی یہاں سے گشتابہ منگوایا کرتے تھے۔ میں مہینہ میں ایک دو بار یہاں ضرور آتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ آپ کے کھانے کی عادات، اشیا اور ان کے ذائقے آپ کے ثقافتی مزاج سے منسلک ہوتے ہیں۔زبان اور کھانے ثقافت اور تہذیب کا اظہار ہیں۔زبان سے تو میں محروم ہو گیا لیکن زبان کا ذائقہ ابھی قائم ہے اور کم از کم ثقافتی طور پر تو کشمیری ہوں ہی''۔(۲۹)

ریاست سے باہر تخلیق ہونے والی ''تمنا بے تاب'' کشمیری مشاہیر کی آپ بیتیوں میں ایک ایسی تصنیف ہے، جو ایک الگ اور منفرد ذائقے سے آشنا کرتی ہے۔اس عہد کی کشمیر میں تصنیف ہونے والی اُردو آپ بیتیاں کشمیری سیاست، تحریکِ آزادی اور تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے محدود دائرے اور زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ایسی نکھری ہوئی نہیں ہیں۔اس لیے ''تمنا بے تاب'' بیسویں صدی کے آخری عشرے میں کشمیر کی اُردو آپ بیتی کی روایت کی ایک اہم اور جدید طرح ڈالنے والی آپ بیتی ہے۔ یہ اور اس نوع کی دوسری آپ بیتیوں نے اس عشرے کو کشمیر میں اُردو آپ بیتی کو جدید رخ سے آشنا کیا اور اُسے آپ بیتی کے جدید عہد میں ڈالا ہے۔''تمنا بے تاب'' نہ صرف کشمیری آپ بیتی کی روایت کی اہم کڑی ہے بلکہ اُردو کی آپ بیتیوں میں اپنی فنی اور

فکری لوازمے، اسلوب بیان کی چاشنی اور خوبصورتی کے باعث منفرد آپ بیتی ہے۔ ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی اس حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''گزشتہ پندرہ بیس برس میں ہمارے بزرگوں اور معاصروں نے خودنوشتیں لکھیں۔ اُن میں سے اکثر کو میں نے پڑھا اور تقریباً ہر خودنوشت نے مجھے مایوس کیا۔ مایوسی کی وجہ یہ نہیں کہ تمام خودنوشتوں میں کم یا زیادہ جھوٹ کی آمیزش ہے، مایوسی کی وجہ یہ تھی کہ کسی خودنوشت نگار نے اپنے ذہنی ارتقا، اپنے فکری رجحانات اور اپنے تخلیقی سفر کی کشاکشوں کا ذکر نہیں کیا۔ آپ کی خودنوشت میں جگہ جگہ آپ کی اور آپ کے عہد کی دانشورانہ زندگیوں کا صاف ستھرا اور بے تکلف بیان ہے۔ آپ نے اپنی خودنوشت کا بیانیہ بے حد خوبصورت اور لاجواب طرز اختیار کیا ہے، اس معنی میں کہ آپ کی شخصیت خودنوشت میں راوی کی سی ہے اور راوی بھی ایسا، جو تقریباً پوری طرح غیر جانبدار رہے، اپنی شخصیت کو ہیرو اور اپنی زندگی کو افسانہ بنا کر پیش نہیں کیا گیا ہے''۔(۳۰)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے (سردار بشیر احمد صدیقی)

سردار بشیر احمد صدیقی ادیب اور شاعر ہیں۔ اُن کی درجن سے زائد کتب، جن میں ناول، ڈرامہ، سفرنامہ، آپ بیتی جیسی اصناف نثر شامل ہیں، شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری میں دیوان صدیقی بھی طبع ہوا ہے۔ وہ ایک قابل استاد، صحافی اور متحرک کارکن کی حیثیت سے مصروف کار رہے۔ اسی باعث ان کی آپ بیتی ''زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے'' کے نام سے چھپی ہے۔ یہ آپ بیتی ۱۹۹۵ء میں زیورطبع سے آراستہ ہوئی۔ ''یادش بخیر'' میں بشیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

> ''زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے'' میں راقم نے آج تک کی زندگی کے حالات و واقعات اور مشاہدات کو حتی المقدور اختصار کے ساتھ صداقت اور حقیقت کے روپ میں بیان کرنے کی سعی کی ہے''۔(۳۱)

پہلا باب جس کا عنوان ''پونچھ راجدھانی'' ہے، مصنف کے ابتدائی حالات، خاندان، تعلیم اور دیگر تفصیلات سے متعلق ہے۔ بشیر صدیقی ۲/جون ۱۹۳۴ء کو درہ دولیاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد پونچھ ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ اس دوران ۱۹۴۷ء کے سال تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا، بعد میں مزید تعلیم حاصل کی اور شعبہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔ دوسرے باب میں ''جنگ آزادی کشمیر'' کے عنوان سے بشیر احمد صدیقی نے کشمیر کی تاریخ، تحریکِ آزادی اور سیاسی حالات کا واقعاتی منظر نامہ بیان کیا ہے۔ یہ بات تاریخی اعتبار سے اہم ہے لیکن مصنف نے اسے آپ بیتی میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک مؤرخ کی طرح غیر جانب انداز میں واقعات کو بیان کیا ہے:۔

> ''تحریکِ آزادی کشمیر ملک بھر میں تیز ہو رہی تھی۔ عوام بیدار ہو چکے تھے اور اب وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ وقت پڑنے پر ڈوگرہ بربریت اور انگریزی سامراج کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس دوران شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس نے اپنے ساتھیوں اور تحریکِ آزادی کے اوّلین ورکروں سے مل کر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی اور اس طرح مسلمان ایک سیاسی پلیٹ فارم کے تحت ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر کام کرنے لگے''۔(۳۲)

اگلا باب ''مہاجرت اور دربدری'' کے نام سے ہے۔ اس باب میں مصنف نے پہلے دو ابواب کی طرح اپنی زندگی کے مناظر اور سرگرمیوں کو سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔ پونچھ سے ہجرت کر کے آزاد علاقے میں آنا، ملازمتوں کے سلسلہ میں مختلف اداروں میں مصروف عمل ہونا، سیاسی سرگرمیاں وغیرہ اس باب میں بیان ہوئی ہیں۔

مصنف کی زندگی کے بیان میں اچانک باب نمبر ۴ ''زندگی یا طوفان'' میں ایک ڈرامائی تبدیلی آتی ہے۔ ایک ناول کی طرح مصنف ایک دوست کو جو مقبوضہ علاقہ میں قید ہو گیا تھا، کی رہائی کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے، جس کے لیے وہ رات کے

اندھیرے میں حدمتارکہ عبور کر کے پونچھ شہر پہنچتا ہے اور بہت سی مشکلات کا سامنا کر کے اپنی مہم میں کامیابی کے بعد واپس لوٹتا ہے۔اس کہانی کا انداز افسانوی اور ڈرامائی ہے۔ چوں کہ مصنف ناول نگار اور ڈرامہ نگار بھی ہے لہٰذا آپ بیتی کو بھی ایک ناول، افسانے یا ڈرامے کی طرح پُر تجسس بنانے کے لیے اس نے وہی افسانوی انداز اختیار کیا، جس میں بہت سی باتیں مصنوعی اور بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں۔اس سے مصنف کی آپ بیتی میں ایک ہلچل اور دلچسپی ضروری پیدا کی ہے۔

اگلے ابواب میں مصنف اپنی ادارت میں شائع ہونے والے دو جرائد ''چمن'' اور ''باغبان'' کا احوال، مختلف علمی، ادبی اور قبیلائی انجمنوں، شادی، اولاد اور خاندان، ملازمت کے دوران ہونے والے واقعات اور تاثرات بیان کرتے ہیں۔ اپنے احباب دوستوں کا تذکرہ بھی شامل ہے، بطور صدر معلم کیے گئے اقدامات، ملازمت سے فارغ ہو کر شروع کیے جانے والے مشاغل اور آخر میں پند و نصائح اور زندگی کے بارے میں تاثرات بھی بیان کیے گئے ہیں۔

''زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت کی ایک ایسی آپ بیتی ہے، جو ایک گاؤں کے فرد کی رودادِ حیات ہے۔اس میں ایک عام فرد کی داستان اور اس سے جڑے واقعات سے ایک کشمیری دیہات میں ہونے والے واقعات اور معاملات سے آگہی ہوتی ہے۔مشاہیر اور زندگی کے اہم شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد، حکمرانوں اور بیوروکریٹ سے ہٹ کر زندگی کس رخ پر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ایسے لوگوں کی دلچسپیاں، خواہشات اور معاملات کس نہج پر پروان چڑھتے ہیں سے یہ آپ بیتی آگاہ کرتی ہے۔

''زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے'' آپ بیتی کے فن کے حوالے سے کسی بلند مقام کی حامل نہیں ہے۔اس کے واقعات میں یکسانیت اور اسلوب بیان میں سادگی اور صحافتی طرز نمایاں ہے۔مصنف اگرچہ فکشن لکھتا ہے مگر اس کی آپ بیتی میں اسلوب بیان کی کوئی ندرت اور خوبصورتی موجود نہیں ہے۔واقعات کی یکسانیت اور تجربے اور مشاہدے کے محدود ہونے کے باعث اور مصنف کے ناصحانہ اندازِ تحریر نے اس کی ادبی اور فنی حیثیت کو بھی محدود کر دیا ہے۔تاہم کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے اس منظر سے آگہی اور جدید عہد کی آپ بیتی میں اپنے محدود ہی سہی، مگر ایک نئے کینوس سے روشناس کرانے کی بنا پر قابل مطالعہ اور اہم ہے۔

چلمن سے چمن تک (شملہ مفتی)

''چلمن سے چمن تک''، کشمیر کے ایک معزز علمی اور دینی گھرانے کی خاتون شملہ مفتی کی آپ بیتی ہے۔شملہ مفتی سری نگر میں چستی کوچہ کے محلّہ میں پیدا ہوئیں۔ یہ انیسویں صدی کی دوسری دہائی کا زمانہ تھا۔اس عہد میں خواتین کی تعلیم اور دوسرے اجتماعی امور میں شرکت تصور نہیں کی جاسکتی تھی۔عورت کی دنیا گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود تھی،مگر شملہ مفتی کو نسبتاً بہتر گھریلو حالات کے باعث تعلیم کی اجازت مل گئی۔ پھر شادی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوا مگر پھر حالات تعلیم حاصل کرنے کے لیے موافق ہوگئے۔ چناں چہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔کتاب کے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:۔

> ''میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے تقریباً سات سال تک پڑھائی کو بالکل خیر باد کہا لیکن رفتہ رفتہ کچھ ذاتی مسئلوں اور نجی تقاضوں نے میرے لیے کچھ ایسے حالات پیدا کردیے کہ میں نے تہیہ کیا کہ مجھے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا چاہیے۔میں نے محکمہ تعلیم میں ملازمت کی تلاش کی اور ساتھ ساتھ پڑھائی کو بھی جاری رکھا۔گھر میں پرانی قدروں اور قدیم روایتوں کو نئی سوچ میں تبدیل کرنے میں مجھے جن تلخیوں، دشواریوں اور ناخوشگوار تجربوں کا سامنا ہوا، اس کا ذکر تفصیلاً نہ سہی اختصار کے ساتھ ضبطِ تحریر کیا ہے''۔(۳۳)

''چلمن سے چمن تک'' ۱۹۹۸ء میں سری نگر سے شائع ہوئی۔کتاب میں چودہ عنوانات کے تحت شملہ مفتی نے اپنی زندگی کی داستان مختلف ادوار میں تقسیم کرکے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔اس داستان سے اس عہد کی ایک مکمل تصویر بالخصوص خواتین کے مسائل اور معاملات کی جامع صورت بھی سامنے آ گئی ہے۔کشمیر میں آپ بیتی کی صنف پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔یوسف ٹینگ کے مطابق:۔

> ''اس زبان (اُردو) کی اُن آپ بیتیوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، جن کی کوئی پذیرائی ہوئی ہے۔کشمیر میں یہ کم یاب شے نایاب میں بدلنے لگتی ہے۔ چند سیاسی شخصیات نے ضرور آپ بیتیاں لکھی ہیں، لیکن اُن کی تلاش کا ماحصل اور مرکز اُن کے شغل سے بندھا رہتا ہے''۔(۳۴)

اس صورت حال میں شملہ مفتی کی آپ بیتی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ یہ اُردو زبان میں ایک ایسی آپ بیتی ہے، جو حکمرانوں کے شاہی دربار اور سیاست کی خارزار وادی کے معاملات سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بیسویں صدی کے کشمیر کے وسطی دورانیے کی ایک عام زندگی، تہذیب وتمدن اور روایات اور رسوم کی جھلک ملتی ہے۔شملہ مفتی ایک بدلتے ہوئے

زمانے میں دم توڑتی زندگی اور ماضی کی روایات کو ختم ہوتے دیکھ کر انھیں نسل نو تک پہنچانا چاہتی ہیں۔ وہ بھی کسی بلند مقام سے ہو کر نہیں بلکہ اس زندگی کا ایک اہم کردار اور ماضی کی اُن روایات کا حصہ ہوتے ہوئے اپنی ذات کے آئینے میں دکھاتی ہیں:۔

''کشمیر پچھلی صدی بھر میں کس قدر بگڑا اور بنا، اُس کا اندازہ ساٹھ سال سے زیادہ عمر والی نسل کو تو ہے، لیکن کئی نئی نسلیں اس سے بے خبر ہیں۔ ایسے نوجوانوں کے لیے یہ کتاب چشم کشا ہے۔ شملہ جی نے اسے واقعات کی کھتونی یا روز نامچہ نہیں بنایا لیکن اس نے ڈھلتی پگھلتی پرچھائیوں کو اچھے انداز میں عکس بند کیا ہے۔ وہ ایک عام شہری ہوتے ہوئے بھی امتیازی شہری ہیں''۔(۳۵)

''چلمن سے چمن تک'' کی زبان رواں، سبک اور سہل ہے۔ انھوں نے کشمیر کے اس عہد کے نا قابلِ بیان اور مشکل حقائق کو اپنی شستہ اور مہذب زبان میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شملہ مفتی کی آپ بیتی کی خاص بات اس عہد کی رسوم و رواج کا خوبصورت بیان ہے۔ انھوں نے شادی بیاہ اور دوسری رسوم، جو ایک فرد کی ذات سی جڑی ہوئی ہیں کے بیان میں اپنی ذات کے حوالے سے، اس تفصیل اور باریک بینی سے اظہار خیال کیا ہے کہ اس عہد کی ایک مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ اپنی رخصتی کی تیاریوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''تین چار گھنٹے قبل دلہن کو سسرال جانے کے لیے سجایا گیا۔ مجھے اس وقت زربفت کا پھیرن پہنایا گیا، جس کے اوپر جالی لگائی گئی تھی۔ سر پر زری دار ٹوپی، طاقین جس میں تعویذ اور ٹکے لگائے گئے تھے۔ ہالہ ہورو، کنہ وس، حلقہ بند، جگنی، ترٹو گلے میں پہنائے گئے۔ چوڑیاں اور انگوٹھیاں بھی پہنائی گئیں۔ انگوٹھے میں خاص قسم کی انگوٹھی ہوا کرتی تھی، جسے مینٹھو کہا جاتا تھا۔ فیرن کے نیچے قمیص اور واسکٹ بھی پہنائے گئے۔ وہ بھی طلے دار تھے۔ ال خلدہ بھی پہنایا گیا، جس میں الائچیاں رکھی جاتی تھیں اور گلے میں ریشمی غلاف میں بندھا ہوا ایک قرآن شریف پہنایا گیا۔ ڈولی میں ایک نبات سے بھری ہوئی تھالی رکھی گئی تا کہ شگونِ نیک کے لیے سب منہ میٹھا کریں''۔(۳۶)

اس طرح سماجی زندگی کی مختلف جہتیں، ثقافتی اور تمدّنی مناظر کی جھلکیاں بڑی تفصیل کے ساتھ کتاب میں موجود ہیں۔ شملہ مفتی اگر چہ سیاسی واقعات سے زیادہ تر دور رہی ہیں، مگر کتاب میں کئی مقامات پر بعض اہم سیاسی واقعات کا بیان ایک چشم دید گواہ کے طور پر بیان ہوا ہے:۔

''۱۷رجون ۱۹۴۴ء کو مسلم پارک جامع مسجد میں زیرِ صدارت چودھری غلام عباس مسلم

کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس میں خطبہ صدارت مولوی محمد امین نے
پڑھا۔محمد علی جناح خصوصی دعوت پر جلسے میں شرکت کے لیے مدعو تھے۔مسلم باغ میں
کوئی ایک لاکھ کے قریب لوگ تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ریاستی مسلمانوں نے جس سیاسی
تحریک کوا جاگر کیا تھا یہ جلسہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھا''۔(۳۷)

شملہ مفتی نے کشمیر کے قدامت پسند معاشرے کو دیکھا۔انھوں نے کشمیر میں عورتوں کی جہالت سے تعلیم تک کی منزل کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ چناں چہ اس سفر کی روداد انھوں نے ''چلمن سے چمن تک'' میں تفصیل سے عمدہ پیرائے میں بیان کی ہے۔ شملہ مفتی کے اسلوب بیان میں شگفتہ نگاری کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ آسان، رواں دواں اور فصاحت سے بھرپور نثر میں داستان زندگی بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔موضوع کے اعتبار سے بھی ''چلمن سے چمن تک'' میں مصنفہ زندگی کی راہگزار میں واقعات کا عمدہ انتخاب اور آپ بیتی سے جڑے حالات سے باہر نہیں گئیں۔لہٰذا کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت میں ایک عمدہ اضافہ اور اپنے اسلوب اور موضوع کے لحاظ سے اہم آپ بیتی ہے۔اپنی انھی خوبیوں کی بنا پر کشمیری اُردو ادب کے ممتاز ادیب،نقاد لکھتے ہیں:۔

''میں شملہ مفتی صاحبہ کی اس تحریر کو کشمیر کے اُردو ادب اور خود کشمیر سے متعلق دستاویزی
ادب میں ایک خوبصورت اضافہ سمجھتا ہوں''۔(۳۸)

کاروانِ یوسف (چودھری محمد یوسف)

چودھری محمد یوسف آزاد کشمیر کے ممتاز صنعت کار اور سیاسی رہنما ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی انتہائی مشکل اور نامساعد حالات میں شروع کی۔ چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے سفر کا آغاز کر کے اہلِ ثروت میں شمار ہوئے۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھ کر سینئر وزیر اور قائم مقام وزیرِ اعظم تک بنے۔ یوں انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ چودھری محمد یوسف کی اس بھرپور زندگی کی داستان ''کاروانِ یوسف'' ہے۔ زاہد ملک کتاب کے فلیپ میں لکھتے ہیں:۔

> ''کاروانِ یوسف'' محنت کی عظمت کی داستان ہے۔ یہ اُس جفاکش کی آپ بیتی ہے، جو تمام تر مشکلات کے باوجود اپنی دنیا آپ پیدا کرنے میں کامیاب رہا ہے''۔(۳۹)

کتاب کے ابتدائیہ میں چودھری یوسف ''کاروانِ یوسف'' کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے سیدھے سادے الفاظ میں رودادِ زندگی بیان کی ہے۔ اس داستان میں مانگے ہوئے رنگ نہیں ہیں، بس میں نے شاہراہِ حیات میں چلتے چلتے جو کچھ دیکھا اور انسانوں کے انبوہ میں جو کچھ سنا اور برتا قلم بند کر دیا ہے''۔(۴۰)

چودھری محمد یوسف نے اپنی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۸۲ء کے دورانیہ پر محیط ہے۔ یہ ان کی زندگی کے ابتدائی زمانے اور جوانی کے ایام پر مشتمل ہے۔ اس دوران میں انھوں نے اپنی محنت اور مشقت سے اپنی اور اپنے خاندان کی مشکلات کو دور کرنے کی سعی کی اور پھر مشکل حالات سے نکال کر اپنے پورے خاندان کو آسودہ حال زندگی کی شاہراہ پر لانے میں کامیاب ہوئے۔

دوسرا دور ۱۹۸۳ء سے شروع ہوتا ہے، جب وہ سیاست کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ چودھری یوسف شروع سے ہی فلاحی اور سماجی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ چناں چہ اسی جذبے کے تحت سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ اس میدان میں بھی وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ سیاست میں وہ شرافت، دیانت داری، نرم روی، تحمل، بردباری جیسی اقدار کے امین رہے۔ سیاست کی خارداروادی میں رہ کر اس کی آلودگیوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھا۔ سید ضمیر جعفری کے مطابق:۔

> ''چودھری صاحب کا شمار ملک کے ایسے ممتاز صنعت کاروں اور سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے تجارت میں سیاست تو کی لیکن سیاست میں تجارت نہیں کی''۔(۴۱)

''کاروانِ یوسف'' میں آزاد کشمیر کے سیاسی مدوجذر پر بھی ایک بھرپور جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کی معروضی صورت حال پر کتاب کے بے لاگ تبصرے اور تجزیے کئی حوالوں سے اہم ہیں۔ آزاد کشمیر کی سیاست کی اندورنی کہانیاں، وزارت امور کشمیر کی کارستانیاں اور حکومتوں کے ٹوٹنے بننے کے پیچھے کارفرما عناصر کی نشاندھی جیسے امور قابلِ توجہ اور قابل مطالعہ

ہیں۔سید ضمیر جعفری کتاب کی خوبیاں بیاں کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

''میرے نزدیک اس کتاب کی منفرد خوبیاں دو ہیں۔ایک یہ کہ یہ کتاب قلم سے لکھی ہوئی نہیں زمین سے اُگی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دوسری یہ کہ ایک کروڑ پتی کی داستان حیات میں ایک مزدور کا دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے''۔(۴۲)

''کاروانِ یوسف میں چودھری محمد یوسف کی زندگی کے ادوار کے ساتھ ساتھ مسئلہ کشمیر کے حل کی تجاویز، پاکستان کا ایٹمی پروگرام، آزاد کشمیر کا مستقبل، تاریخِ کشمیر، مسلم کانفرنس کی سیاست، مصنف کے احباب اور دوستوں کا تذکرہ بھی موجود ہیں۔ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر جیسا کہ انھوں نے خود اظہار کیا ہے کہ میں شاعر ہوں نہ ادیب، عالم ہوں نہ فاضل، مؤرخ ہوں نہ تجزیہ کار، بس سیدھا ''پدرا'' ایک انسان ہوں۔لہٰذا انھوں نے سیدھے ''پدرے'' انداز میں اپنے احباب اور سیاسی صورت حال پر جو بیان جاری کیے ہیں وہ آزاد کشمیر کے سیاست دانوں کے حوالے سے بہت اہم اور چشم کشا ہیں۔اس حوالے سے محمود ہاشمی کی رائے ہے کہ:۔

''چودھری محمد یوسف جیسا شخص جینئس تو ہوسکتا ہے مگر ناخواندہ نہیں کیوں کہ ''کاروانِ یوسف'' کی بصیرت افروز معلومات اور صداقت کے سامنے بڑے بڑے علامے اپنی کم مائیگی کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں''۔(۴۳)

مجموعی طور پر اگر چہ یہ کتاب کشمیر کی اُردو آپ بیتی میں کسی بلند مقام پر فائز نہیں کی جا سکتی، مگر اپنے لوازمے، سادگی بیان ،صداقت پر مبنی اسلوب، چودھری محمد یوسف کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرنے ،سلیقے ،قرینے سے ابواب بندی اور اشاعت کے باعث کشمیری مشاہیر کی آپ بیتی کی روایت کا اہم حصہ ہے۔عطاالحق قاسمی لکھتے ہیں:۔

''چودھری محمد یوسف سیلف میڈ انسان ہیں اور سیلف میڈ لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں لیکن چودھری محمد یوسف نے معاشرے سے اپنی محرومیوں کا انتقام نہیں لیا۔ بلکہ نئی نسل کو مشکلات اور زندگی کے ان خاردار راستوں سے آگاہ کیا ہے''۔(۴۴)

حوالہ جات

۱۔ پنڈت کلہن: راج ترنگنی، ترجمہ ٹھاکراچھر چند شاہپوریہ۔ میر پور: ویری ناگ پبلشرز (جلد اوّل) سنہ ندارد، ص ۸

۲۔ ابراراحمد: مزاحمتی ادب، مشمولہ مزاحمتی ادب اُردو، مرتب، رشید امجد، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۵ء، ص ۴۹

۳۔ محمد اقبال، ڈاکٹر: یہ قطعہ پہلی بار محمد دین فوق کے کشمیری میگزین میں چھپا، شیخ عبداللہ اپنی آپ بیتی ''آتش چنار'' میں لکھتے ہیں کہ اقبال نے ایک اجلاس میں سنایا۔ آتش چنار، ص ۶۲

۴۔ خورشید احمد، پروفیسر: مقدمہ، روداد قفس۔ اسلام آباد: انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹

۵۔ نصر اللہ خان، نواب زادہ: فلیپ روداد زنداں، جلد دوم

۶۔ کے ایم عارف: فلیپ، روداد زنداں، جلد دوم

۷۔ خورشید احمد، پروفیسر: مقدمہ روداد قفس، جلد اوّل، ص ۲۱

۸۔ خواجہ غلام احمد، پنڈت: فلیپ، روداد قفس، جلد دوم

۹۔ علی گیلانی، سید: روداد قفس، جلد اوّل۔ ص ۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۱۔ خورشید احمد، پروفیسر: روداد قفس، ص ۲۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۱۶۔ ایضاً، (جلد دوم)، ص ۲۸۹

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۰۹

۱۸۔ خورشید احمد، پروفیسر: مقدمہ، روداد قفس، جلد اوّل، ص ۲۲

۱۹۔ عطاالحق قاسمی: فلیپ روداد قفس، جلد دوم

۲۰۔ امان اللہ: جہد مسلسل۔ راولپنڈی: ٹی ایس پرنٹرز، ص ۲۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۲۔ صغیر خان، ڈاکٹر: کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اُردو ادب (غیر مطبوعہ مقالہ)، ص ۲۱۰

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۲۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر: تمنائے بے تاب۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم، ۲۰۰۷ء، ص ۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۷۔ محمد حسن، ڈاکٹر: فلیپ ''تمنا بے تاب''

۲۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر: تمنائے بے تاب، ص ۱۱۹

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۰۷

۳۰۔ شمس الرحمان فاروقی، فلیپ، ''تمنا بے تاب''

۳۱۔ بشیر احمد صدیقی، سردار: زندگی ہے یا کوئی طوفان۔ راولپنڈی: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۵ء، ص ۵

۳۲۔ ایضاً، ص ۳۰

۳۳۔ شملہ مفتی: چلمن سے چمن تک۔ سری نگر: خانیار، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰

۳۴۔ محمد یوسف ٹینگ: میری نظر میں، چلمن سے چمن تک۔ ص ۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۳

۳۶۔ شملہ مفتی: چلمن سے چمن تک۔ ص ۶۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۹۷

۳۸۔ یوسف ٹینگ: چلمن سے چمن تک۔ ص ۷

۳۹۔ زاہد ملک: فلیپ کاروانِ یوسف۔ اسلام آباد: شہر یار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۴۰۔ محمد یوسف، چودھری: کاروانِ یوسف۔ ص ۱۳

۴۱۔ ضمیر جعفری، سید: زمین سے اُگی ہوئی کتاب، کاروانِ یوسف۔ ص ۱۸

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۳۔ محمود ہاشمی: فلیپ ''کاروانِ یوسف''

۴۴۔ عطاالحق قاسمی: فلیپ ''کاروانِ یوسف''

فصل دوم

اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ

(۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۰ء)

اکیسویں صدی کا سورج پوری دنیا میں خوف، دہشت اور آفاتِ سماوی سمیت طلوع ہوا۔ پہلا واقعہ ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء کو ہوا، جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے نتیجہ میں پوری دنیا دہشت گردی کے خلاف متحد اور منظّم جدوجہد کے لیے جمع ہونے لگی۔ دہشت گردی کے نام پر آزادی کے لیے سرگرم اقوام اور افراد کے لیے مشکلات کا نیا دور شروع ہوا۔ بھارت نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بندوقوں کا رُخ پاکستان کی طرف کر دیا اور کشمیر میں جاری تحریکِ آزادی کو دہشت گردی کے ساتھ جوڑنے کی منظّم منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اکتوبر میں سری نگر اسمبلی اور دسمبر میں بھارتی پارلیمنٹ میں ہونے والے حملوں نے بھارت کے لیے مزید آسانیاں پیدا کر دیں۔ چناں چہ وہ امریکہ اور مغرب کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ پاکستان کو کشمیریوں کی مدد کے سلسلے سے روکا جائے۔ پاکستان عالمی دباؤ کی وجہ سے دفاعی پوزیشن میں آ گیا اور اس کے نتیجے میں پاکستان کھلے اور چھپے ہر انداز سے اس تحریک سے دست بردار ہو گیا۔ یوں کشمیر میں جاری تحریکِ آزادی وقتی طور پر رُک گئی۔

ابھی ''دہشت گردی'' کی یہ فضا برقرار رہی تھی کہ کشمیر کے افق پر ایک اور افتاد، آفت سماوی کے روپ میں نمودار ہوئی۔ یہ ۸راکتوبر ۲۰۰۵ء کو قیامت صغریٰ کا منظر پیش کرنے والا زلزلہ تھا۔

> ''آٹھ اکتوبر کے زلزلے کا مرکز کشمیر تھا اور اس سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا علاقہ بھی کشمیر ہی تھا۔ امریکی جیالوجیکل سروے کے مطابق ریکٹر سکیل پر زلزلے کی شدت ۶ء۷ ریکارڈ کی گئی۔ اس کا مرکز مظفر آباد کے نواح میں ۱۸ کلومیٹر کی مسافت پر پہاڑیوں میں ۱۰ کلومیٹر گہرائی میں تھا۔ اس زلزلے کو ۱۹۰۶ء کے سان فرانسسکو، ۱۹۳۵ء کے کوئٹہ اور ۲۰۰۱ء کے بھارتی ریاست گجرات کے ہم پلہ قرار دیا گیا۔(۱)

اس خوف ناک زلزلے سے سیاسی، معاشی، معاشرتی غرض ہر طرح کے حالات کی کایا پلٹ گئی۔ آزاد کشمیر کا دارالحکومت مظفر آباد سب سے زیادہ متاثر ہوا، جب کہ بالاکوٹ کے بعد باغ اور راولاکوٹ کے اضلاع بھی بُری طرح متاثر ہوئے۔ زلزلے کے اثرات پورے آزاد کشمیر، پاکستان کے صوبہ سرحد کے ساتھ ساتھ مقبوضہ کشمیر کے کئی علاقوں تک پہنچے۔ لاکھوں افراد لقمہ اجل بنے، لاکھوں بے گھر، معذور اور مجبور ہو گئے اور نقصانات کا تخمینہ ۳۰۰ بلین روپے سے تجاوز کر گیا۔ عمارتیں ملبے کا ڈھیر، سڑکیں تباہ، فون، بجلی اور دوسرے ذرائع برباد ہو گئے۔ آبادیاں ویران اور قبرستان آباد ہو گئے۔ آزاد کشمیر کی حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس صورت حال میں پاکستانی عوام، حکومت اور فوج نے آگے بڑھ کر جس طرح مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ پوری مسلم دنیا اور عالمی اداروں نے بھرپور امدادی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ مکمل ہونے تک ''دہشت گردی'' کے نام پر عالمی جنگ اور زلزلے کے اثرات کافی حد تک ختم ہوئے اور زندگی معمول پر آنے لگی، مگر ان واقعات نے بین الاقوامی سیاست، تعلقات، معاملات اور حالات کا رُخ بھی مکمل طور پر بدل

دیا۔اس صورت حال کے اثرات کشمیراورتحریکِ آزاد کشمیر پر بھی پوری طرح پڑے کیوں کہ کشمیران دونوں حادثات کا اہم میدان تھا۔

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں خطہ کشمیر میں تخلیق ہونے والے شعروادب میں ان واقعات کی گونج پوری طرح سنائی دیتی ہے۔آزاد کشمیراور پاکستان میں متعدد کتب تصنیف ہوئیں،جن میں ممتاز مزاح نگار کبیر خان کی ''شاکس آفٹر شاکس''، ''صبح اکتوبر کےانمٹ نقوش'' از صیاد احمد خان اور ''زمین پھٹ گئی'' از چودھری محمد لقمان قابلِ ذکر ہیں۔شاعروں اور ادیبوں نے اس درد کو اپنے اپنے انداز میں محسوس کیا۔مجید اصغر کی ایک نظم ''ابھی تم نہ آنا'' میں اسی کرب کا خوب صورت اظہار ہے:۔

چناروں کی اجڑی ہوئی ایک بستی
کے خیمے سے
اس نے یہ پیغام بھیجا ہے
ابھی تم نہ آنا
ابھی پیار کا جان! موسم نہیں ہے
ابھی اپنے حالات اچھے نہیں ہیں
پہاڑوں کی جنت نشاں وادیوں میں
ابھی درد کے سائے پھیلے ہوئے ہیں
ابھی کوہساروں میں لاشیں دبی ہیں
ابھی مرغزاروں میں ماتم بپا ہے
ابھی سبزہ زاروں میں خاک اڑ رہی ہے
ابھی شاخساروں پر مٹی جمی ہے
ابھی ماؤں بیواؤں کے ہوش گم ہیں
ابھی سارے چوپال خالی پڑے ہیں
ابھی موت نے رقص روکا نہیں ہے
دلوں میں ابھی زلزلہ آ رہا ہے
ابھی اپنے چشموں سے آنسو رواں ہیں
ابھی ندیوں میں لہو بہہ رہا ہے
ابھی حسن کے چاند گہنا رہے ہیں
ابھی عشق کے ولولے سو رہے ہیں
فروزاں نہیں ہیں ابھی اپنی صبحیں
ابھی اپنی شامیں سہانی نہیں ہیں
ابھی زندگی سے تہی ہیں فضائیں
ہواؤں کے نوحے جگر کاٹتے ہیں
جہاں اپنے گھر تھے وہاں اب کھنڈر ہیں
کہیں میتیں ہیں، کہیں زندہ لاشیں
کوئی ہے کہیں، اور کوئی کہیں ہے
کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے!
وہ برگد جو صدیوں سے سینہ سپر تھا
جڑوں سے اکھڑ کر وہ اوندھا پڑا ہے
درختوں کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں میں
پرندے ابھی اپنے گھر ڈھونڈتے ہیں
بہت برف اس بار بھی پڑ رہی ہے
مگر کھیلنے والے بچے نہیں ہیں!
ابھی تم نہ آنا
ابھی تم جو آئے بہت دل دکھے گا
ابھی پیار کا جان! موسم نہیں ہے (۲)

اس کے علاوہ علمی وادبی جرائد، باغ، مظفر آباد اور راولاکوٹ کے کالجز کے ادبی رسائل نے خصوصی شمارے نکالے اور شاعری میں عمدہ تخلیقات سامنے آئیں۔

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں، جن میں بشیر حسین جعفری کی ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد''، غوث چوہان ''جموں کی یادیں''، یعقوب ہاشمی کی ''حاصل عمرِ رائیگاں''، محمد یوسف چودھری کی ''نقش برآب''، عبدالقیوم راجا کی ''داستان عزم''، جنرل محمد حیات خان کی ''داستانِ حیات''، مسز مقبول حمید کی ''یادوں کے شیریں نقوش''، شریف طارق کی ''زندگی جبرِ مسلسل''، محمد فضل شوق کی ''میری یادیں''، عبداللطیف انصاری کی ''نقوش حیات''، جسٹس عبدالغفور کی ''سفر مسلسل''، چودھری لعل حسین کی ''آوازحق''، ثریا خورشید کی ''یادوں کی کہکشاں''، چودھری محمد صادق کی ''یادوں کی سوغات''، چودھری رحیم داد کی ''نقوش رحیم''، چودھری علی شان کی ''نقش علی شان''، پروفیسر یعقوب شاہق کی ''عمرِ عزیز رفت''، چودھری محمد یوسف کی ''کاروانِ یوسف''، ایم سلیم کی ''باغ شیری سے بریڈفورڈ تک''، پروفیسر محمد اکرم طاہر کی ''دعا کر چلے'' اور سید علی گیلانی کی ''وُلر کنارے'' شامل ہیں۔

اس عرصے میں ڈاکٹر صابر آفاقی کی ''نایاب ہیں ہم'' اور راعنا راجوری کی ''یادوں کے ڈھلتے سائے'' بھی تصنیف ہوئی، جو غیر مطبوعہ ہیں۔

زندہ باد، پائندہ باد(سید بشیر حسین جعفری)

سید بشیر حسین جعفری آزاد کشمیر کے معروف صحافی اور ادیب ہیں۔ تاریخ آپ کا پسندیدہ موضوع ہے، جس کا اظہار ان کی تصانیف ''تذکرہ جنگ آزادی کشمیر''، "Kashmir Fight for Pakstan"، ''ممالک اسلامیہ''، ''بیسویں صدی میں کشمیری مسلمانوں کی جدو جہد آزادی''، ''کشمیر سٹڈیز''، ''تاریخ سدھن قبیلہ''، ''تاریخ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس''، ''ہمارے غازی، ہمارے شہید'' سے ہوتا ہے۔ صحافی کی حیثیت سے آپ نے بیس سال تک علمی و ادبی میگزین ''بصیرت'' نکالا۔ پاکستان کے تمام بڑے بڑے اخبارات میں پچیس سال سے آپ کے کالم اور مضامین چھپ رہے ہیں۔ آپ کے مشاغل میں سیر وسیاحت بھی شامل ہے۔ اُن کی اس دل چسپی نے انھیں پوری دنیا میں گھمایا ہے اور اس کا اظہار سفرناموں ''سورج میرے پیچھے''، ''ممالک اسلامیہ'' اور ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' کے صفحات میں جگہ جگہ موجود ہے۔ جعفری نے بے شمار سائنسی انشائیے بھی تخلیق کیے۔ چھے سو سے زائد اہلِ علم کے خطوط کا ذخیرہ محفوظ رکھتے ہیں جسے ''میری مراسلت'' کے عنوان سے منظر عام پر لا رہے ہیں۔ ''حُرمتِ لفظ'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ سید بشیر حسین جعفری نے ذاتی طور پر ایک آرکائیو بھی تیار کیا ہے، جس میں تاریخی، معاشی، معاشرتی اور ادبی حوالے سے عمدہ لوازمہ اور تاریخی دستاویزات موجود ہیں۔ سوانح میں ''مائی ڈائری'' اور آپ بیتی میں ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' کے بعد تیسری جلد ''تابندہ باد'' کی اشاعت کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ آپ نہ صرف علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہیں بلکہ سیاسی وسماجی حیثیت سے بھی ممتاز ہیں۔

سید بشیر حسین جعفری ۳۴-۱۹۳۳ء میں ضلع باغ کے گاؤں سوہاوہ شریف کے ایک معروف علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول دھیرکوٹ سے مڈل کا امتحان نمایاں حیثیت میں پاس کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول پونچھ میں داخلہ لیا، لیکن ۱۹۴۷ء کے واقعات کے باعث واپس چلے آئے اور ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ ہائی سکول راولاکوٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے ۱۹۵۶ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے اور ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد پنجاب میں سول سروس کو جوائن کیا۔ مختلف شعبہ جات میں ملازمت مکمل کرنے کے بعد ۱۹۹۴ء میں ساٹھ برس پورے ہونے پر سائنس فاؤنڈیشن سے ریٹائر ہوئے۔ بعدازاں الخیر یونی ورسٹی میں ڈائریکٹر ریسرچ اور پھر ایڈوائزر چودھری غلام عباس چیئر آزاد کشمیر یونی ورسٹی تعینات ہوئے۔ اس کے علاوہ درجنوں علمی و ادبی اور سماجی تنظیموں کے اعزازی رکن اور مختلف عہدوں پر متمکن ہیں۔ سید بشیر حسین جعفری کو انجمن ترقی اُردو، پنجاب یونی ورسٹی، امریکی ریاست کیرولینا سمیت چالیس ایوارڈز، انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

''زندہ باد''، ''پائندہ باد'' اور ''تابندہ باد'' سید بشیر حسین جعفری کی آپ بیتی کے عنوانات ہیں، جو تین جلدوں میں ہے۔ ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں اور ''پائندہ باد'' کے انتساب میں ہی تیسری

جلد ''تابندہ باد'' کی نوید سنائی گئی تھی، جواب جلد منظرِ عام پہ آئے گی۔اس طرح تقریباً اڑھائی ہزار صفحات پر محیط یہ اُردو کی سب سے ضخیم آپ بیتی ہے۔جعفری کی آپ بیتی کو علمی حلقوں میں پذیرائی ملی:۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایڈیٹر ''اوراق''، ممتاز محقق، نقاد: ''خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کرہ ارض میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو بات کی تہہ تک پہنچنے پر قادر ہیں اور جن کو قدرت نے اچھے ذوقِ نظر سے بھی مالا مال کیا ہے''۔(فلیپ ''زندہ باد'')

فتح محمد ملک، صدر نشیں مقتدرہ قومی زبان: ''زندہ باد'' کے مطالعے اور ''پائندہ باد'' کے سرسری جائزے سے سید بشیر حسین جعفری کی بھرپور زندگی، ان کی ان تھک محنت، علم و فن سے گہرے لگاؤ، ان کے ادبی ذوق اور اُردو زبان سے ان کی محبت کا اندازہ ہوتا ہے''۔(فلیپ ''پائندہ باد'')

محمد کبیر خان: ''اُن (بشیر حسین جعفری) کا اصل میدان صحافت اور تحقیق ہے۔وہ تاریخ کی طرح بے رحم اور کھرے قلم کار ہیں''۔(پائندہ باد، ص۲۲)

صغیر قمر: ''کشمیر کے زعفران زاروں سے کشمیر کے مرغزاروں تک، کشمیر کے معرکوں سے کشمیر کے وفا شعاروں تک، ایک پوری تاریخ کا نام بشیر حسین جعفری ہے۔وہ خود تاریخ بھی ہیں اور تاریخ ساز بھی''۔(پائندہ باد، ص۲۸)

پروفیسر رفیق بھٹی: ''زندہ باد'' قارئین کے لیے چشم کشا بھی ہے اور مشکل کشا بھی، مسرت افروز بھی ہے اور سبق آموز بھی۔یہ سرزمین کشمیر کے مرغزاروں کے چہکتے ہوئے ایک بلبل کی ایسی نغمہ سرائی ہے، جس کی بازگشت مدتوں دل و دماغ کی تازگی کا وسیلہ بنی رہے گی''۔(پائندہ باد، ص۲۷)

آپ بیتی کی اشاعت کی ضرورت اور اہمیت کے حوالے سے بشیر حسین جعفری آغاز میں لکھتے ہیں:۔

> ''اللہ تعالیٰ کے اس جہاں کی ہر شے خوب صورت اور کارآمد ہے۔فطرت کے بیرونی مظاہر تو رہے ایک طرف..................ایک خوب صورتی اندرونی بھی ہوتی ہے۔مثلاً کسی کی بات خوب صورت، کسی کی سوچ خوب صورت، کسی کا عمل خوب صورت............کسی کا معصومانہ پن، کسی کی سادگی، کسی کی صاف گوئی، کسی کی خاموشی، کسی کی تحریر، کسی کی تقریر۔ایسی ہی خوب صورتیوں کو تلاش کر کر کے میں نے اپنی کہانی میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے''۔(۳)

یہی وہ بنیادی سوچ ہے، جس نے بشیر حسین جعفری کی آپ بیتی کو آپ بیتی نہیں بننے دیا ہے، بلکہ وہ بیک وقت سفر نامہ بھی ہے، خاکوں کی کتاب بھی، مکتوبات اور تاریخ نگاری بھی۔انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:۔

> ''میں نے سوانح میں روایت اور تقلید کا خیال نہیں رکھا۔موضوعات اور بیان کو اس نہج

پر لے گیا ہوں کہ یہ ایک مرقع بشیر حسین جعفری بن گیا ہے۔.......................
میں سمجھتا ہوں کہ کسی کی سوانح اس لیے نہیں لکھی یا پڑھی جاتی کہ وہ کب، کہاں پیدا ہوا؟ کہاں پلا بڑھا؟ کہاں تعلیم حاصل کی؟ کیا ذریعہ معاش رہا؟ یہ تو ذاتی کوائف ہوئے۔ اصل بات تو کسی کے خیالات، کسی کا علم، کسی کا عمل اور دائرہ کار ہوتا ہے۔ چناں چہ میں نے اپنی سوانح میں خاصے موضوعات پر اپنے ذہن اور سوچ کی عکاسی کی ہے''۔(۴)

بشیر حسین جعفری نے جن موضوعات کو اپنی آپ بیتی کی ذیل میں موضوع بحث بنایا ہے، اُن میں سے اکثر الگ تصنیف کا تقاضا کرتے تھے، مگر انھوں نے زبردستی اپنی آپ بیتی میں ڈال کر اس کی ضخامت غیر ضروری حد تک بڑھائی ہے اور آپ بیتی کے دائرہ کار اور اسے دوسرے اصناف میں گھلا ملا کر ایک میگزین یا جریدہ کی سی چیز بنا دی ہے۔ بشیر جعفری کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ آپ بیتی کسی فرد کی سوانح اور کارناموں سے الگ کوئی چیز ہوتی ہے۔ خیالات اور علم کی نمائش کا ذریعہ یقیناً آپ بیتی کا دائرہ کار نہیں ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے اکثر موضوعات آپ بیتی کی صنف میں شامل نہیں ہوتے۔ مثلاً ان موضوعات کا آپ بیتی سے دور کا واسطہ نہیں۔ ''انگریزوں کی گالیاں''، ''کھیل ہی کھیل میں تعلیم''، ''وفاقی حکومت کا راولپنڈی منتقل ہونا''، ''دور استحکام و استقلال''، ''تذکرہ جنگ آزادی کشمیر''، ''پاکستان سائنس فاؤنڈیشن اسلام آباد''۔ یہ عنوانات پہلے بارہ ابواب میں سے ہیں۔ جب کہ پہلی جلد کے ابواب کی تعداد پچیس اور دوسری جلد کی تیس ہے اور ہر باب میں ایسے ہی عنوانات (یعنی آپ بیتی سے غیر متعلق) پر لکھا گیا ہے۔

جعفری کی آپ بیتی میں سفر نامے کے عناصر بہت زیادہ ہیں۔ اپنے بچپن کے چھوٹے چھوٹے اسفار سے لے کر بیرون ممالک تک کے متعدد اسفار کی تفصیل اور تذکرہ موجود ہے۔ بلاشبہ ایک پوری جلد سفر و سیاحت کی روداد ہے، جسے الگ ایک یا زیادہ سفر ناموں کی صورت مرتب کیا جا سکتا تھا۔ اکثر سفر نامے بے ربط اور غیر دلچسپ ہیں، جو محض روداد نویسی یا تذکرہ نویسی کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ''میرے بچپن کے دیسی سفر'' کے عنوان سے پورا باب ہے، جس میں اپنے علاقے کے قریب مختلف شہروں اور علاقوں کے اسفار کا تذکرہ ہے:۔

''یہ اس دور کی بات ہے، جب میں نے پہلی بار راولاکوٹ دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ کلّر نام کے گاؤں کے رہنے والے محمد اکبر خان (بعد میں ایس پی) پیر صاحب سے ملاقات کے لیے ارجہ آئے''۔(۵)

یہاں سے بات چل کر ''جب میں نے لاہور دیکھا''، ''راولپنڈی میں دو سال''، ''فیصل آباد میں گزرے سال''، ''سفر نامہ سورج میرے پیچھے''، ''برطانیہ میں سودن''، ''نیویارک کی گلیاں''، ''جب میں نے ہالی ووڈ دیکھا''، ''ٹورنٹو سے نیاگرا فال تک''، ''امریکہ میں نئی جہت''، ''برطانیہ کا میرا چھٹا سفر'' جیسے عنوانات کے تحت (صرف پہلی جلد میں) ملکی اور بیرون ملک اسفار کی روداد بالتفصیل بیان کی گئی ہیں۔

مصنف نے ''زندہ باد'' کے ''کلمات اوّلین'' میں اظہار کیا ہے:۔

> ''خودنوشت میں صیغہ واحد متکلم کا بار بار استعمال ہوتا ہے۔ میں نے کہا، میں نے پوچھا، میں نے سوچا وغیرہ۔اس بار بار کی ''میں'' کو لوگ تکبر یا تعلیّ قرار دیتے ہیں۔ خودنوشت سوانح حیات کسی اور انداز میں لکھی بھی نہیں جا سکتی.................. چناں چہ میری اس ''میں، میں'' کو بھیڑ بکری کی ''میں میں'' سے مختلف قرار دیجیے گا''۔(۲)

اُردو میں اگرچہ اکثر آپ بیتیاں صیغہ واحد متکلم میں ہی تحریر کی گئی ہیں لیکن بہت سی آپ بیتیوں میں صیغہ واحد غائب، ناول کی طرز پر اور دوسرے اندازِ تکلم کو بھی اختیار کیا گیا ہے۔ چناں چہ یہ درست نہ ہے کہ خودنوشت سوانح حیات کسی اور انداز میں نہیں لکھی جا سکتی۔ آسانی اور سہولت تو صیغہ واحد متکلم میں ہی ہے۔مگر ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' کے مصنف نے اس کا اس قدر زیادہ اور غیر ضروری استعمال کیا ہے کہ انھوں نے نہ صرف ٹیکسٹ میں بلکہ جا بہ جا عنوانات بھی ''میں''، ''مجھے''، ''میرے'' وغیرہ جیسے صیغے استعمال کر کے ''میں میں'' کی غیر مناسب اور غیر ضروری کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ انداز جہاں مصنف کی اظہار ذات اور اعلان ذات کی غمازی کرتا ہے وہاں خودستائی اور خود کشائی کے غیر ضروری رویے کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔اس انداز بیان سے نہ صرف اسلوب بیان کی خوب صورتی متاثر ہوتی ہے، وہاں محض روداد یا واقعہ نگاری کی کیفیت کے باعث واقعات محض اخباری بیان نظر آتے ہیں۔کئی مقامات پر مصنف محض کسی پروگرام کی جھلکیوں کی صورت تاریخی واقعات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں، جن سے نہ صرف قاری اکتاہٹ محسوس کرتا ہے بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ محض کسی اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے۔

مصنف کی زود نویسی کی وجہ سے اس کے اسلوب بیان کی کوئی خاص خوبی نمایاں نہیں ہوتی۔ ہر صنف کے اپنے تقاضے ہیں اور اسلوب بیان ہوتا ہے۔''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' میں مصنف نے سفر نامہ، مکتوب نگاری، خاکہ نگاری، کالم نویسی اور کئی طرح کی اصناف کا بیک وقت تجربہ کر کے اپنا کوئی خاص اسلوب بیان پروان نہیں چڑھنے دیا۔''زندہ باد'' کے آخری باب میں ''جنت کے پتہ پر اپنی والدہ (مرحومہ) کے نام چند خطوط درج کیے ہیں، جن میں البتہ مصنف نے کسی قدر تخیل آفرینی، ادبی اور تخلیقی اسلوب بیان کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ کتاب کا غالب حصہ اس شگفتہ بیانی اور عمدہ اسلوب بیان سے عاری ہے، مگر اس باب کے انداز کو مصنف کے اسلوب کی ایک خوبی قرار دیا جا سکتا ہے:۔

''جب اداس ہوتا ہوں، کوئی مشکل پیش آتی ہے، خوشی یا غم سے گزرتا ہوں، عید، شب برأت آتی ہے یا خواب میں آپ سے ملتا ہوں تو آپ کے لیے ایک خط لکھ کر، حوصلہ اور سکون پاتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اہلِ جنت بھی خواب دیکھتے ہیں یا نہیں؟ آیا وہ اہل ارض کی طرح سوچتے، باتیں یاد رکھتے، دوستیاں پالتے ہیں یا گم سم، اپنے بنگلوں میں بیٹھے حوض کوثر سے لطف اندوز ہوتے، پھل کھاتے اور زربفت یا کمخواب کی رضائیاں اوڑھ کر سو جاتے ہیں''۔(۷)

آپ بیتی کا ایک اہم حصہ تذکرہ رجال ہوتا ہے، مگر اس بیان میں بھی اعتدال اور توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''مصنف جن لوگوں کے ساتھ رہا، جن سے اس نے زندگی کرنا سکھا یا جن کے ساتھ زندگی گزاری وہ اس کی شخصیت کو جاننے اور سمجھنے میں بہت ممد ثابت ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ مصنف کی زندگی میں کتنے دخیل رہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رجال ہی رجال سامنے رہ گئے خود مصنف کی شخصیت درمیان سے نکل گئی''۔(۸)

بشیر حسین جعفری کی آپ بیتی کی دونوں جلدوں میں سیکڑوں احباب اور رجال کا تذکرہ آیا ہے۔''زندہ باد'' کے پندرھویں باب میں ''شخصیات جن کے نام آئے''، سولھویں باب میں ''وہ جن سے میں ملا''، ''وہ جن کو میں نے قریب سے دیکھا''، اسی طرح ''پائندہ باد'' کا نواں، دسویں، گیارھواں اور بارھواں باب تذکرہ احباب اور رجال پر محیط ہیں۔ ان احباب میں علمی وادبی، سیاسی وسماجی غرض ہر طرح کی شخصیات ہیں، جن پر مکمل مضامین اور خاکے بھی لکھے گئے ہیں۔ بعض کا مختصر اور بعض کا طویل تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کثیر الاحباب شخصیت ہیں۔ اپنی مراسلت کے ضمن میں بشیر حسین جعفری نے جن افراد کا تذکرہ کیا ہے اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مصنف نے پندرھواں باب ''میری مراسلت'' میں کئی صفحات پر ان افراد اور شہروں کے نام لکھے ہیں، جہاں وہ گئے اور جن افراد سے ملے یا اُن سے روابط اور مراسلت رہی۔ اُن میں آزاد کشمیر اور پاکستان کے حکمران، فوجی اور سول افسران، یونی ورسٹیوں اور کالجز کے اساتذہ، ماہرین تعلیم، سائنس دان، علمائے کرام، صحافی، محققین، ادیب، شعرا غرض زندگی کے ہر شعبے اور پہلو کے افراد شامل ہیں۔ مصنف کی اطلاع کے مطابق اُن کے پاس ملک کے عظیم الشان افراد کے سیکڑوں خطوط موجود ہیں۔ اس مراسلت اور خطوط کو الگ سے کتاب کی صورت دی جاتی تو زیادہ مناسب تھا۔ آپ بیتی میں مختصر تذکرہ ہی کافی تھا۔

مجموعی طور پر بشیر حسین جعفری کی آپ بیتی ''زندہ باد''، ''پائندہ باد'' اپنی نوعیت کی ایک منفرد آپ بیتی ہے، جو اکیسویں

صدی میں کشمیری مشاہیر کی آپ بیتیوں میں اپنے انداز، رنگ ڈھنگ، ضخامت اور لوازمہ کے اعتبار سے نئی طرح کی مثال سامنے لاتی ہے۔ یہ آپ بیتی کے نام پر ایک انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں کشمیر کی تاریخ بھی ہے اور تحریکِ آزادی بھی، پاکستان اور دنیا بھر کے پچاس سالوں کے اہم واقعات کی جھلک بھی ہے اور سیاست حاضرہ کا منظر نامہ بھی، سیکڑوں افراد کا تذکرہ بھی ہے اور ہزاروں مقامات اور علاقوں کا بیان بھی۔ یہ آپ بیتی کے نام پر سفر نامہ بھی ہے، تاریخی کتاب بھی، اس میں خاکہ نگاری بھی ہے، مکتوب نگاری بھی۔ یہ کتاب سب کچھ ہے مگر آپ بیتی کم کم ہی ہے۔

اس کے اسلوب بیان میں بھی کئی رنگ ہیں مگر اپنا کوئی اسلوب نہیں۔ کہیں کہیں مصنف صحافی ہیں تو کہیں واقعہ نگار۔ اس میں سفر کے بیان بھی ہیں سیدھے سپاٹ انداز میں اور تاریخ کی کہانی بھی ہے محض روداد نگار کی حیثیت سے۔ سوائے چند مقامات کے، اس ضخیم آپ بیتی میں کہیں ادبیت ہے اور نہ تحریر کی خوش آہنگی۔ ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' کے مصنف نے ذاتی حالات ایک خشک اور بے رنگ انداز میں بیان کیے ہیں، جن میں تکرار ہے۔ تاریخ کا بیان ہے مگر محض ایک روداد کے انداز میں کسی انکشاف اور نئی بات کے بغیر۔ کئی ملکوں اور علاقوں کا ''سفر نامہ'' ہے مگر علاقوں اور مقامات کی اہمیت و افادیت کے بغیر، کسی غیر اہم مقام کے لیے درجنوں صفحات اور کسی اہم ترین جگہ کے حوالے سے محض ایک پیراگراف۔ بشیر جعفری کی آپ بیتی دراصل ایک ایسی مرقع تحریر ہے، جس میں ایک عہد کی اُن کے آئینے میں کھینچی گئی تصویر ہے۔ ایک طویل داستان، جس میں جعفری کے گرد ہونے والے واقعات کا بیان موجود ہے۔ آپ بیتی کسی فرد کی زندگی کے پیدائش سے تا دمِ تحریر گزرے لمحوں کا احوال ہوتا ہے، مگر یہ احوال اس وقت دلکش اور دلنشین بنتا ہے، جب اس میں زندگی کے پے در پے واقعات میں سے عمدہ کا انتخاب، بہترین پیرائے میں بیان کیا گیا ہو۔ اگرچہ ''زندہ باد'' اور ''پائندہ باد'' کسی انتخاب کے بغیر ہر طرح کے واقعات کا محض بیان ہے اور تکرار اور طوالت کے باعث بے رنگ اور بے اثر بھی ہے، لیکن تاریخی اہمیت کی حامل ضرور ہے اور تاریخ بھی محدود علاقہ کے حوالے سے ہے۔

حاصلِ عمرِ رائیگاں (حافظ محمد یعقوب ہاشمی)

حافظ محمد یعقوب ہاشمی ۵ رجنوری ۱۹۲۰ء کو شہر پونچھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد پیر محمد ابراہیم ہاشمی نے روحانی منازل کے ساتھ ساتھ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔محمد ابراہیم ریاست پونچھ میں انسپکٹر آف سکولز تھے۔ انھوں نے پونچھ کے پسماندہ علاقے میں ۱۱۴ نئے سکول کھولے۔علم وادب کے ساتھ ساتھ تصوف اور سلوک سے بھی وابستہ تھے۔ اسی علمی، ادبی اور دینی ماحول میں حافظ محمد یعقوب ہاشمی نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔بچپن میں ہی قرآن پاک حفظ کیا۔۱۹۳۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے ایم اے او کالج امرتسر میں داخل ہوئے۔ یہاں انھیں ایم ڈی تاثیر،سید کرامت حسین جعفری اور فیض احمد فیض جیسے اساتذہ ملے۔اسی دوران سیاست کے میدان میں طلبہ کے قائد کی حیثیت سے اُترے۔۱۹۴۰ء کے تاریخ ساز اجلاس، جس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی شریک ہوئے۔۱۹۴۲ء میں فیصل آباد سے بی اے کرنے کے بعد اسلامیہ کالج پشاور سے بی ٹی کیا۔ ۱۹۴۶ء میں یعقوب ہاشمی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں آل جموں وکشمیر سٹوڈنٹس یونین کے صدر منتخب ہوئے۔علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم اے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کیں۔بعدازاں آزاد کشمیر میں مختلف سرکاری اعلیٰ ملازمتوں سے وابستہ رہے۔انھوں نے کشمیری مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کئی عالمی فورمز پر شرکت کی اور متعدد بین الاقوامی تنظیموں کے رکن اور عہدیدار رہے۔''حاصلِ عمرِ رائیگاں'' حافظ یعقوب ہاشمی کی آپ بیتی ہے۔کتاب کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:۔

> ''یہ کتاب بنیادی طور پر اُن اکابرین ، جو برصغیر ہندو پاکستان کے عظیم محسنین میں شامل تھے، کی خدمت میں حاضریوں اور ان کے ارشادات حسنہ سے مستفید ہونے کے تذکروں پر مشتمل ہے''۔(۹)

مصنف تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم کارکن تھے۔وہ طالبِ علمی کے زمانے سے ہی اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔حضرت قائدِ اعظم سے متعدد مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کے ارشادات کی روشنی میں برعظیم کے کونے کونے میں تحریک پاکستان کے لیے سرگرم رہے۔اس دوران برعظیم کی عظیم المرتبت شخصیات جن میں قائدِ اعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، چودھری رحمت علی، حضرت علامہ اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی، خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، نواب بہادر یار جنگ، سید امین الحسینی، یاسر عرفات، راجا صاحب محمود آباد، چودھری خلیق الزماں، نواب سر حمید اللہ خان آف بھوپال، حمید نظامی، رستم زماں پہلوان، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق، چودھری محمد علی، سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر احمد عثمانی شامل ہیں، سے شرف بازیابی حاصل ہوا۔

حافظ ہاشمی کو عظیم شخصیات دیکھنے، اُن سے مصافحہ کرنے اور ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا شوق تھا۔ چناں چہ اپنے دورِ طالبِ علمی سے ہی وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہے اور اس سے مستفید ہوتے رہے۔ان کی پہلی ملاقات اس دور میں قائدِ

اعظم محمد علی جناح سے ہوئی۔اس کے بعد متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔حضرت قائدِ اعظم کے بارے میں ان ملاقاتوں کا حاصل وہ پروفیسر سٹینلے والبرٹ کے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

''ایسے افراد کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں،جنھوں نے واقعات عالم کا رُخ موڑ دیا، پھر ایسی ہستیاں تو بہت تھوڑی ہیں،جنھوں نے اپنے عزم بالجزم سے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔اگر ایک قدم اور آگے بڑھیں اور ایسے افراد کی جستجو کریں،جنھوں نے اپنی مضبوط قوت ارادی اور اٹل قوت فیصلہ کی بنا پر ایک قومی ریاست قائم کر کے دنیا میں اپنی قیادت کا لوہا منوایا تو ہمیں صرف اور صرف ایک ہی نام ملتا ہے کہ یہ اعزاز فقط بانی پاکستان محمد علی جناح کے حصے میں آیا،جنھوں نے بیک وقت تینوں کارنامے سرانجام دے کر تاریخ عالم میں منفرد اور یکتا مقام حاصل کیا۔انھوں نے ایک قلیل مدت میں پاکستان حاصل کر کے ناممکن کو ممکن بنادیا اور دنیا کی تاریخ ہی نہیں جغرافیہ بھی بدل دیا''۔(۱۰)

''حاصل عمر رائیگاں'' دراصل قائدِ اعظم اور دوسری عظیم شخصیات سے ملاقاتوں کی صورت، جو لمحے ان کو میسر آئے ہیں انھیں اپنی عمرِ رائیگاں کے ''حاصل'' کے طور پر یادگار بنانے کا تذکرہ ہے۔حضرت علامہ اقبال سے پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''میری عمر اس وقت دس برس تھی۔ میں چھٹی جماعت کا طالبِ علم تھا۔ اتنے میں حضرت علامہ اقبال تشریف لائے۔وہ کالے رنگ کی اونچی گول ٹوپی اور کالے رنگ کے ہی تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھے اور ہاتھ میں چھڑی تھی''۔(۱۱)

چناں چہ یہ اور دوسری ملاقاتوں کا تاثر تھا کہ یعقوب ہاشمی کے بقول ۱۹۳۸ء میں میٹرک تک انھوں نے علامہ کا سارا اُردو کلام حفظ کر لیا تھا اور اسی اعتبار سے وہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ''حافظ کلامِ اقبال'' بھی کہلاتے تھے۔سید ابوالاعلیٰ مودودی کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''علامہ اقبال کا سید مودودی کو حیدرآباد سے بلانے کا پس منظر یہ ہے کہ علامہ اسلامی فقہ کی تدوینِ نو کے بہت متمنی تھے اور انھیں اس کام کے لیے مولانا مودودی سے زیادہ موزوں شخصیت اور کوئی نظر نہیں آتی تھی۔حالاں کہ مولانا کی عمر اس وقت تیس برس بھی نہیں تھی''۔(۱۲)

''حاصل عمرِ رائیگاں'' میں حافظ یعقوب ہاشمی نے اس طرح کی سیاسی،علمی اور فکری شخصیات سے استفادے پر مشتمل

اپنی یاداشتوں کومرتب کیا ہے۔ان یاداشتوں سے کئی تاریخی،علمی اورفکری واقعات پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں،جن کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت اہم ہے۔البتہ بعض واقعات مزید تحقیق کے متقاضی ہیں۔''حاصل عمرِ رائیگاں'' میں کچھ ایسے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں،جن کا کوئی دوسرا حوالہ نہیں،اس لیے ان کی صداقت اور سچائی تحقیق طلب ہے۔مولانا ظفر علی خان کے حوالے سے یاداشتوں میں لکھتے ہیں:۔

> ''علامہ اقبال نے بیان کیا تھا کہ انار کلی کے ایک بالا خانے پر جہاں میں رہائش پذیر تھا مجھ پر شعر لکھنے کی کیفیت طاری ہوئی۔ چناں چہ میں نے نظم لکھنی شروع کی جو بعد میں ''بانگِ درا'' میں ''طلوعِ اسلام'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ وہ کہتے ہیں جب میں یہ نظم لکھ رہا تھا تو مولانا ظفر علی خان آ گئے اور مجھے شعر لکھتے دیکھ کر کہا جو آپ لکھ چکے ہیں وہ اشعار سنائیں۔ میں نے جب اشعار سنائے تو مولانا نے کہا میرا یہ شعر بھی شامل کریں۔ اس کے بعد میں شعر کہتا تھا تو مولانا بھی ایک شعر نظم میں شامل کرنے کو کہتے۔ اس طرح نظم کے ختم ہونے تک ہم دونوں باری باری شعر کہتے رہے۔ اس طرح اب میں کہہ نہیں سکتا اس نظم میں مولانا کے شعر کون سے ہیں اور میرے کون سے؟''۔(۱۳)

حضرت علامہ محمد اقبال کی شخصیت اور کلام پر سیکڑوں کتب موجود ہیں۔ان میں سوانحی،تحقیقی،تنقیدی اورمختلف جامعات سے ایم۔فل،پی ایچ۔ڈی کے مقالے بھی ہیں،مگر''طلوعِ اسلام'' کے حوالے سے ایسی کوئی بات کسی محقق یا مصنف نے تحریر نہیں کی۔

''حاصل عمرِ رائیگاں'' کا بڑا حصہ مختلف تاریخی شخصیات سے ملاقاتوں اور یاداشتوں پر مشتمل ہے،جس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ان شخصیات میں مصنف نے اپنی اہلیہ،والدین اوراپنے قریبی تعلق داروں کو بھی شامل کیا ہے،جن کی وجہ سے مصنف کے ذاتی حالات بھی سامنے آتے ہیں۔ایک مضمون''سری نگر میں قرار دادِ الحاق پاکستان کا اجلاس'' میں مسلم کانفرنس کے اس تاریخ ساز اجلاس کی تفصیل موجود ہے،جو سردار محمد ابراہیم خان،بانی صدر آزاد کشمیر کی سربراہی میں ۱۹؍جولائی ۱۹۴۷ء کو ہوا تھا اور جس میں تاریخی قرار دادِ الحاق پاکستان منظور ہوئی تھی۔

مجموعی طور پر یہ کتاب اپنے لوازمے کے اعتبار سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ایک آپ بیتی کے اعتبار سے کئی فنی خامیوں کا شکار ہے۔اس میں ابواب بندی ہے نہ کسی ترتیب سے عنوانات ہیں۔ یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے،جو مختلف تاریخی شخصیات کے حوالے سے حافظ یعقوب ہاشمی کی یاداشتوں پر مبنی ہے۔اس میں مصنف کی ذاتی زندگی کا احوال بھی ہے اور اُن کے قریبی اعزا و اقربا کا بیان بھی۔ یوں ادھوری ہی سہی،صاحب تصنیف کی زندگی کو بھی کسی قدر بیان کرتی ہے۔

مصنف ایک صاحب مطالعہ اور مقتدر شخصیت رہے ہیں۔ وہ حافظ قرآن اور حافظ کلامِ اقبال بھی ہیں۔ آزاد کشمیر میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے ہیں۔ پاکستان کی کئی بڑی شخصیات اور مسلم ممالک کے حکمرانوں سے بھی ملے ہیں۔ چھبیس قومی اور بین الاقوامی تنظیموں کے عہدیدار اور ممبر رہے۔ اپنی انھی خدمات کے باعث انھیں حکومت پاکستان کی جانب سے تحریک پاکستان گولڈ میڈل عطا کیا گیا۔ چناں چہ ''حاصل عمرِ رائیگاں'' میں ایسا لوازمہ موجود ہے، جو تاریخی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کے فلیپ پر پروفیسر ڈاکٹر صابر حسین لکھتے ہیں:۔

> ''آپ نے (حافظ محمد یعقوب ہاشمی) اس کتاب میں ذاتی تجربات اور مشاہدات کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ یہ ایک ذاتی روداد ہوتے ہوئے مستند تاریخی اور ادبی شہ پارہ بن گئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے عالمی معیار کی ان عظیم ہستیوں کے فکر و فن تک رسائی ہوتی ہے، جو گذشتہ ایک صدی تک دنیا کے سیاسی افق پر چھائی رہیں اور جن کی فکری و عملی اثرات نے دنیا میں تغیر برپا کیا۔ ادبی اعتبار سے بھی یہ بلند پایہ کتاب ہے''۔(۱۴)

''حاصل عمرِ رائیگاں'' نہ صرف ایک بھرپور زندگی کی داستان ہے بلکہ کشمیر کی بیسویں صدی کے علمی، ادبی، سیاسی اور ثقافتی سرمائے کی ایک مستند دستاویز بھی ہے اور کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا اہم حصہ بھی۔

نقش برآب (محمد یوسف چودھری)

''نقش برآب'' آزاد کشمیر کے ایک محنتی، دیانت دار اور قابل آفیسر محمد یوسف چودھری کی داستانِ حیات ہے۔ محمد یوسف چودھری ۱۷ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو اسلام گڑھ میر پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسلام گڑھ سے ہی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول میر پور سے پاس کیا۔ ایف اے میر پور سے اور بی اے گارڈن کالج راولپنڈی سے کیا۔ پنجاب یونی ورسٹی لا کالج سے قانون اور پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج سے عربی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۵۴ء میں چودھری محمد یوسف نے اپنے کیریئر کا آغاز بطور لیکچرر کیا۔ بعدازاں چیئر مین انٹرمیڈیٹ و ثانوی تعلیمی بورڈ میر پور، ناظم اعلیٰ تعلیمات، سیکرٹری تعلیم اور مشیر تعلیم کے مناصب پر فائز رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ''کشمیر ماڈل کالج'' کے نام سے ایک پرائیویٹ تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ محمد یوسف چودھری پیش لفظ میں اپنی آپ بیتی کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''انسان فانی ہے، اس کی کسی شے کو دوام حاصل نہیں۔ یہاں کے سب نقش، نقش بر آب ہیں، جنھیں وقت کی لہریں ہر آن مٹاتی رہتی ہیں۔ دوام صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے''۔(۱۵)

''نقش برآب'' طاہر پبلی کیشنز میر پور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی۔ پہلا باب زندگی کے ابتدائی اور حصولِ تعلیم کے حالات پر محیط ہے۔ دوسرے باب میں محمد یوسف چودھری نے اپنی ملازمت کے آغاز اور بطور لیکچرر مختلف اداروں میں اپنی ملازمت کے احوال بیان کیے ہیں۔ تیسرے باب سے ساتویں، گیارھویں اور سترہویں باب میں بطور پرنسپل، ڈپٹی ڈائریکٹر کالجز، چیئرمین تعلیمی بورڈ، ناظم اعلیٰ تعلیمات، سیکرٹری تعلیم، مشیر تعلیم اور دوسری انتظامی ذمہ داریوں پر رہتے ہوئے کیے جانے والے اقدامات اور انتظامات کی تفاصیل موجود ہیں۔ باقی ابواب میں بیرون ملک دوروں، حج کی سعادتوں اور ریٹائرمنٹ کے بعد کے ایام کی داستان بالخصوص کشمیر ماڈل کالج کا قیام اور اسے بہتر بنانے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی تفاصیل بیان کی ہیں۔ ''نقش برآب'' کے حوالے سے جسٹس (ر) قاضی عبدالغفور لکھتے ہیں:۔

> ''ملازمین سرکار کی جب بھی اصول پسندی، دیانت داری اور بحیثیت افسر جرأت اور استقامت کی بات ہوتی ہے تو چودھری صاحب کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ چودھری صاحب سے اختلاف رکھنے والے بھی ان کی صلاحیتوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ چودھری صاحب کی اس آپ بیتی کا لب لباب کچھ اس طرح ہے کہ انسان اس دنیا میں مثلِ نقش برآب ہے''۔(۱۶)

دراصل یہ آپ بیتی ایک سرکاری ملازم اور اعلیٰ انتظامی عہدوں پر تعینات ایک آفیسر کی دیانت داری، فرض شناسی اور

محنت ولگن کی داستان ہی ہے، جس میں معاملات اور حالات کا واقعاتی بیان ایک سرکاری رپورٹ کی طرز پر کیا گیا ہے:۔

''جناب وزیرِ اعظم نے صدر صاحب کو یقین دلایا کہ آفیسر کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے، مگر وہ مطمئن نہ ہوئے اور یہی بات جناب وزیرِ تعلیم سے کہی۔ انھوں نے بھی یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن ان باتوں سے وہ مطمئن نہ ہوئے''۔(۱۷)

اسی لب و لہجے میں پوری آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔ لہٰذا ''نقش بر آب'' اسلوب بیان کی کسی انفرادیت، لوازمے کی کوئی تاریخی اہمیت یا فن آپ بیتی میں کسی منفرد اضافے کی حامل آپ بیتیوں کی صف میں شامل نہیں ہے۔ مجموعی طور پر یہ ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد کشمیر میں سول سروس اور بالخصوص شعبہ تعلیم میں ہونے والی پیش رفت، خامیوں اور خرابیوں کی تفصیلی رپورٹ ہے:۔

''شعبہ کالجز میں اکثر، زنانہ اور کچھ مردانہ ادارے بہتر چل رہے تھے۔ مگر اکثر مردانہ اور کچھ زنانہ اداروں میں ڈسپلن نام کی کوئی شے نظر نہ آئی۔ طالب علم اور استاد مرضی سے کالج جاتے اور مرضی سے واپس ہو آتے تھے۔ طلبہ پر کنٹرول ختم ہونے کی وجہ تو یہ تھی کہ ان سے ڈیوز سال بھر کے یکمشت لے لیے جاتے تھے، پھر وہ کالج جائیں یا نہ جائیں ان کا نام خارج نہیں ہو سکتا تھا۔ طلبہ چوں کہ اکثر غائب رہتے تھے۔ لہٰذا اساتذہ کالج جاتے اور گھوم پھر کر نکل جاتے اور اپنے اپنے پرائیویٹ کاموں میں لگ جاتے''۔(۱۸)

اسی سپاٹ پن اور بے رس انداز تحریر میں اور ایک خشک رپورٹ کی طرح محکمہ تعلیم آزاد کشمیر کی ''کارکردگی'' بیان کی گئی ہے۔ البتہ اس بیان میں کافی حد تک حقائق بیان ہوئے ہیں۔ اجتماعی معاملات کے بیان کی طرح ذاتی احوال بھی انکشافِ ذات اور اظہارِ ذات کی خوبیوں سے خالی محض روداد زندگی پر محیط ہے۔ تذکرہ رجال میں حکومتی ذمہ داران اور سربراہان ریاست سے لے کر اپنے عزیز و اقارب تک بڑی تعداد میں شخصیات کا ذکر آیا ہے، مگر یہاں بھی کسی کردار نگاری، شخصیات کے درونِ خانہ جھانکنے کی کوشش اور خاکہ نگاری کا التزام نہیں ملتا، بلکہ محض واقعات کے بیان کے دوران جناب صدر، جناب وزیر اعظم اور صاحب کے التزام کے ساتھ سرکاری رپورٹ میں آئی شخصیات کی طرح ان کا تذکرہ ہے۔

لہٰذا ''نقش بر آب''، کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت میں کسی منفرد اضافے یا آپ بیتی کے فن بیتی میں کوئی دیرپا نقوش چھوڑنے والی آپ بیتی نہیں ہے۔ البتہ ایک عہد کے ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی ذاتی زندگی اور محکمہ تعلیم کے حالات اور واقعات کے بیان کے باعث اپنی اہمیت رکھتی ہے، جس سے اس اہم شعبہ میں اصلاح کے لیے رہنمائی میسر آ سکتی ہے۔

جموں کی یادیں (محمد غوث چوہان)

''جموں کی یادیں'' محمد غوث چوہان کی یاداشتوں پر مبنی آپ بیتی ہے۔ محمد غوث چوہان جمّوں میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں اپنا بچپن اور جوانی گزاری اور مراحل تعلیم سے گزرے۔ ۱۹۴۷ء میں برعظیم دو الگ الگ مملکتوں میں بٹ رہا تھا، مگر جمّوں و کشمیر کے افق پر آزادی کی روشن صبح نمودار ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ اس مرحلے پر اُن کا اپنا شہر جمّوں آگ و خون کے دریاؤں میں ڈبویا جا رہا تھا۔ محمد غوث چوہان نے اپنے خوابوں کے نگر، اس شہر جمّوں کو لٹتے پٹتے اور جلتے بجھتے دیکھا۔ چناں چہ اپنی یاداشتیں ''جمّوں کی یادیں'' کے عنوان سے مرتّب کیں۔

محمد غوث چوہان ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان پہنچے۔ سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ اس دوران پورے پاکستان میں اور افغانستان تک اپنی سرکاری ذمہ داری کے باعث مصروف کار رہے۔ یوں ایک بھرپور زندگی گزار کر پشاور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

''جمّوں کی یادیں'' نہ صرف غوث چوہان کے بچپن اور جوانی کے ان ایّام کا تذکرہ ہے، جب وہ جمّوں میں تھے اور فسادات کی آگ میں جلتے اور ایک خوب صورت شہر کو خاک آلود ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا، بلکہ پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں غوث چوہان کے گرد ہونے والے اہم واقعات کے بیان پر بھی مشتمل ہے۔۔عبدالہادی احمد کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:۔

> ''جمّوں کی یادیں'' ایسی آپ بیتی ہے جو خود ستائی سے پاک ہے اور ایسی جگ بیتی ہے، جو دوسروں کی جھوٹی تعریف سے مبرّا ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک پورے دور کا تذکرہ ہے۔ ایک شہر کے آشوب اور ایک فرد کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اس میں پوری سرزمینِ کشمیر کے ماضی اور حال کے مختصر خاکے بھی ملتے ہیں اور پاکستان کے احوال بھی دکھائی دیتے ہیں''۔ (۱۹)

''جمّوں کی یادیں''، جمّوں کی خونچکاں داستانوں سے شروع ہوتی ہے۔ تقسیمِ برعظیم کے موقع پر ہندوؤں کے ہاتھوں جس طرح جمّوں کو لوٹا اور پیٹا گیا، مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کے مال اسباب لوٹے، ان کا ذکر تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ غوث چوہان ان سب حالات کے عینی شاہد ہیں۔ لہٰذا کتاب کے پہلے دو عنوانات ''جمّوں کی خونچکاں داستانیں'' اور ''جلتے جمّوں پر کیا بیتی'' کے تحت انھوں نے اس المناک داستان کو بیان کیا ہے۔ ان دونوں ابواب میں انھوں نے درجنوں شہدا کا تذکرہ کیا ہے، جو ان سانحات میں اللہ کو پیارے ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ ان حالات کی بھی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب غوث چوہان جوان تھے۔ چناں چہ انھی عنوانات کے تحت وہ اپنی زندگی کے ابتدائی حالات، تعلیم، جماعت اسلامی سے وابستگی اور سرگرمیوں کا بیان بھی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جمّوں شہر، اس کی مساجد، عمارات اور مقامات کا تذکرہ بھی موجود

ہے۔ایک باب میں اس عہد میں کیے جانے والے ہندوستان کے اسفار ہیں،جن میں بڑے شہروں اور تاریخی مقامات کی سیر، بالخصوص ٹیپو سلطان شہید کا خوب صورت الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

''وادی کشمیر......نصف صدی قبل'' کے عنوان سے نہ صرف کشمیر کا جغرافیہ،خوب صورت مقامات اور تاریخی حیثیت بیان کی گئی ہے بلکہ کشمیری روایات اور تہذیب وثقافت کے مظاہر کے ساتھ ساتھ اہم معلومات بھی بیان کی گئی ہیں، جو تاریخ کی کتب میں مرقوم نہ ہیں۔

> ''کشمیر کو سیاحوں کی جنت کہا جاتا ہے۔اس لیے یہاں بڑی تعداد میں ہوٹل اور لاریوں کے اڈے ہیں۔سب سے بڑا ہوٹل انگریزوں کا نیڈو ہوٹل تھا،جس کی دنیا بھر میں شاخیں ہیں۔اس کی ایک شاخ لاہور میں بھی ہے۔اس کا مالک بھی انگریز تھا۔ اس نے ہوٹل کو دودھ سپلائی کرنے والی گجری سے شادی کر لی۔اس کے بطن سے ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہوئے۔بیٹی جناب شیخ عبداللہ سے بیاہ دی اور اس کو جہیز میں گلمرگ کا نیڈو ہوٹل دے دیا۔ بیٹا جس کا نام ہیری تھا،فقیر منش ہو گیا اور پیروں،فقیروں کی صحبت اختیار کر لی''۔(۲۰)

شادی بیاہ کی رسوم ورواج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''کشمیر میں دولہے کو مہاراجہ کہتے ہیں۔شادی اکثر رات کے وقت ہوتی ہے۔ برات کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو سہاگ کے گیت گاتی جاتی ہیں۔مرد پیچھے ہوتے ہیں،آگے آگے مشعل بردار ہوتے ہیں، جو جلوس کو پُر رونق اور خوش نما بنادیتے ہیں۔ کشمیر میں دلہن کو جو برقع پہنایا جاتا ہے اس کے نقاب پر کلمہ کڑھا ہوتا ہے۔شادی کے بعد لڑکی والے اپنے داماد کو اپنے گھر رکھ کر اس کی خاطر مدارت کرتے ہیں۔لڑکی والے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے داماد کو سال بھر یا اس سے زائد عرصہ اپنے پاس رکھا۔زیادہ عرصہ رکھنا قابل عزت اور قابل فخر شمار کیا جاتا ہے''۔(۲۱)

محمد غوث چوہان کی زندگی میں سفر ہی سفر ہیں۔اپنے آبائی وطن کشمیر میں تھے،تو ہندوستان بھر میں گھومتے رہے۔پھر ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تو سیالکوٹ، لاہور اور پشاور میں تو قیام پذیر رہے،مگر سارے پاکستان میں گھومتے رہے۔پھر افغانستان اور ریٹائرمنٹ کے بعد امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک میں گھومنا پھرنا ان کا مشغلہ ٹھہرا۔ چناں چہ ان اسفار کی جھلکیاں بھی اسی آپ بیتی میں موجود ہیں:۔

''میوزیم سے فارغ ہوئے تو صدر امریکہ کی قیام گاہ White House دیکھنے گئے۔
یہ عمارت واشنگٹن ڈی سی میں 118 ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ جب کہ گورنر ہاؤس
لاہور 185 ایکڑ اور گورنر ہاؤس پشاور 138 ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کہاں پاکستان
کے گورنر اور کہاں امریکہ کا صدر، لیکن قیام گاہیں الٹا منظر پیش کر رہی ہیں''۔(۲۲)

''جموں کی یادیں'' غوث چوہان کی آپ بیتی ہے، مگر کسی منصوبہ بندی کے بغیر مختلف عنوانات کے تحت مضامین کی صورت میں۔ اگر آپ بیتی کے فنی لوازم کو مدنظر رکھ کر اور منصوبہ بندی سے لکھی جاتی تو غوث چوہان کی زندگی میں وہ ہمہ ہمی اور رنگا رنگی موجود ہے کہ ایک خوب صورت آپ بیتی وجود میں آ سکتی تھی۔ تب اس کے نام سمیت ابواب بندی اور اسلوب بیان میں بھی تبدیلی کی جاتی۔ زیرِ بحث کتاب میں اسلوب بیان کی کوئی ندرت اور انفرادیت نہ ہے۔ ہر مضمون میں الگ الگ انداز بیان اپنایا گیا ہے۔ بہر حال بقول عبدالہادی احمد:۔

''جموں کی یادیں'' پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ایک سچے اور مخلص شخص نے جو کچھ دیکھا، سنا اور محسوس کیا بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ ان کی تحریر میں ادبی چاشنی نہ سہی، مگر سچائی کا حسن ضرور ہے۔ کتاب کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ نصف صدی پہلے کا کشمیر کیسا تھا۔ اس دور کے حالات کا چوہان صاحب جیسا چشم دید گواہ کم ہی کوئی بچا ہوگا۔ عام لوگوں سے لے کر کشمیر کے خواص اور قائدین تک کے حالات بے لاگ انداز میں لکھے گئے ہیں''۔(۲۳)

داستانِ عزم (عبدالقیوم راجا)

''داستانِ عزم'' بھارتی سفارت کار مہارترے کے قتل کے الزام میں برطانوی جیلوں میں بائیس سال کی قید کاٹنے والے عبدالقیوم راجا کی داستان اسیری ہے۔عبدالقیوم راجا آزاد کشمیر کے شہر کھوئی رٹہ کے معروف خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ کشمیر کی آزادی دوسرے کئی کشمیریوں کی طرح ان کا بھی دیرینہ خواب تھا۔ چناں چہ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد اُن کی زندگی کا اوّلین مقصد ہے۔ جوانی میں وہ یورپ میں تلاشِ رزق کے ساتھ ساتھ آزادی کے خواب اپنے ذہن میں سجائے مصروف عمل تھے۔ اس دوران کشمیر کی تحریکِ آزادی کے اہم رہنما مقبول بٹ بھارت کی تہاڑ جیل میں پھانسی کے منتظر تھے:۔

> ''میں نے ۱۹۸۱ء میں جے کے ایل ایف (جمّوں و کشمیر لبریشن فرنٹ) میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کی وجہ مقبول بٹ شہید کی صاحبزادی لبنٰی بٹ کا اخباری انٹرویو میں سوال تھا کہ اس کے والد کی جان بچانے کے لیے کشمیری کیا کر رہے ہیں؟ چودہ سالہ لبنٰی کی فریاد نے میری قومی غیرت کو بیدار کر دیا''۔(۲۴)

چناں چہ مقبول بٹ کی رہائی کے لیے بھارتی سفارت کار مہارترے کو اغوا کیا گیا۔اغوا کے بعد عبدالقیوم راجا کے مطابق اُن کی رائے اور مرضی کے خلاف اُسے قتل کر دیا گیا، جس کے الزام میں راجا عبدالقیوم گرفتار ہو گئے۔ ''داستانِ عزم'' کا بڑا حصہ اسی اسیری کی روداد پر مشتمل ہے۔ ۱۶ ابواب پر مشتمل اس ''آپ بیتی'' کا پہلا باب ''تحریک کی طرف پہلا قدم'' میں مصنف نے تحریک آزادیِ کشمیر میں شمولیت، تحریک آزادی کے نام پر برسرِ پیکار تنظیموں کی اندرونی صورت حال، رہنماؤں کی خود غرضی، ذاتی تشہیر، ادنٰی مقاصد اور دیگر خامیوں کے باعث تحریک کی ناکامیوں کے اسباب پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ دوسرے باب میں گرفتاری، مہارترے قتل کیس کے حقائق اور لبریشن فرنٹ کی قیادت کی غلطیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی اور ان پر تنقید کی ہے۔ تیسرے باب میں برطانوی عدالتوں اور جیلوں کی اصل صورتِ حال کو سامنے لایا ہے۔ برطانیہ اور دوسری مغربی اقوام کے ناشائستہ رویّے اور انسانی حقوق کے علمبردار بننے کے دعووں کی قلعی کھولتے ہوئے اصل حقائق سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ اگلے ابواب میں دوستوں کی مہربانیوں اور مدد، اپنی حکومت کی بے حسی، اپنی تعلیمی سرگرمیوں، جو انھوں نے اسیری کے دوران شروع کی اور ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ نیز قانونی جنگ، برطانوی حکومت کی انصاف پسندی کا اصل چہرہ اور دیگر واقعات بیان کیے ہیں۔

''داستانِ عزم'' میں مصنف نے اسیری کی داستان کے ساتھ ساتھ مصنف نے مختلف ابواب میں اپنے ذاتی حالات، جن میں اپنی والدہ اور بھائی سے ملاقات، خاندانی اموات، بچپن کی زندگی، عزیز و اقارب اور دوسرے خاندانی حالات کے تذکرے کیے ہیں۔ آخری چند ابواب میں اپنی پسندیدہ عادات، عورتوں کے پسندیدہ مرد، رہائی اور اس کے بعد کے واقعات،

جماعت اسلامی میں شمولیت، اس کا پس منظر، محرکات اور دیگر حوالوں سے مباحث شامل کیے ہیں۔

''داستانِ عزم'' فن آپ بیتی میں کسی بڑے ادبی فن پارے کا اضافہ اگرچہ نہیں ہے، مگر ایک عام فرد کی داستان کے اہم واقعات کا صاف گوئی، سچے اور کھرے انداز میں بیان کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادی کشمیر کی ناکامی کے بین السطور اسباب بیان کرنے والی اہم تاریخی کتاب ہے۔ برطانیہ میں مقیم صحافی اور مصنف خالد محمود جانوی ''داستانِ عزم'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''کسی شخصیت کی خودنوشت جہاں کسی شخصیت کی حیات کا احاطہ کرتی ہے، وہاں قدم قدم پر خودنمائی یا خودستائی کے مواقع بھی آتے ہیں۔ مگر قیوم راجا نے غیر جانب داری سے اپنے سینے میں محفوظ یہ امانتیں قوم کے سپرد کی ہیں اور ان کے ہر لفظ میں تاریخ کی ایک گونج ہے''۔(۲۵)

فنی اعتبار سے یہ آپ بیتی جزوی بھی ہے اور ربط وتسلسل کی کمی کا شکار بھی۔ ابواب بندی میں بھی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا لیکن کسی فرد کی زندگی میں چند واقعات ہی اُسے دوسروں سے منفرد کرتے ہیں۔ چناں چہ عبدالقیوم راجا کی زندگی میں اسیری نے جس عزم، حوصلے اور حقائق زندگی کے انکشافات کا ساماں کیا ہے اس کا بیان انھوں نے صداقت اور سچائی سے ''داستانِ عزم'' میں کر دیا ہے۔ انوار حسین چشتی لکھتے ہیں:۔

> ''مصنف نے اس کتاب میں گزرے واقعات کا خونچکاں تذکرہ انتہائی صاف گوئی سے کیا۔ لگی لپٹی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی ملمع سازی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ خوشیوں کی باراتوں میں بعض اوقات حقائق چھپ جاتے ہیں، لیکن غم سب سے بڑا مدرک ہے، سودکھ کے گھنے بادلوں نے مصنف پر ہر قسم کی حقیقتوں کو وا کر دیا ہے''۔(۲۶)

انھی حقیقتوں کا کھرا بیان اس آپ بیتی کی اہم خوبی ہے۔

یادوں کے شیریں نقوش (مسز مقبول حمید)

آپ بیتی کا ایک خوب صورت انداز ناول کی طرز پر اپنی زندگی کی داستان کا بیان ہے۔ایک کہانی کی طرح ایک فرد اپنی روداد زندگی بیان کرتے ہوئے گردوپیش کے حالات، واقعات اور افراد کا تذکرہ کرتا چلا جاتا ہے۔سچائی، خلوص اور حقیقت اس داستانِ زندگی کی خوب صورتی ہوتی ہے۔''یادوں کے شیریں نقوش''اسی طرز بیان میں لکھی ہوئی ایک آپ بیتی ہے۔مسز مقبول حمید کی یاداشتوں پر مبنی یہ کہانی دلچسپ اور خوب صورت ہے، جو نہ صرف ایک فرد اور اس کے خاندان کی داستان ہے بلکہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے اختتام صدی تک کے ایک دور افتادہ گاؤں کے پسماندہ علاقے کی تہذیب وثقافت، رسوم ورواج اور سیاسی وسماجی حالات کا عمدہ بیان بھی ہے۔''حرفِ آغاز''میں مسز مقبول حمید لکھتی ہیں:۔

> ''اس کہانی میں، میں نے کسی کردار کے فرضی نام نہیں رکھے۔نہ کسی سچ وجھوٹ کر بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔کیوں کہ سچ اکثر فکشن سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔آپ اسے فکشن سے زیادہ دلچسپ پائیں گے۔یہ میری اور میرے متعلق لوگوں کی سچی کہانی ہے''۔(۲۷)

کتاب کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے مصنفہ رقم طراز ہیں:۔

> ''میری یہ یادیں خاص طور پر اُن خواتین اور لڑکیوں کے لیے ہیں، جنھیں قسمت نے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس دنیا کے بحرِ بے کراں میں چھوڑ دیا۔جنھیں اپنے مردوں کی ہمدردی حاصل نہیں ہوئی۔جن کی زندگی مشکلات کے بھنور میں غوطہ زن ہوتی ہے۔لیکن ان تمام مشکلات اور پابندیوں کے باوجود زندگی کی ہموار راہ تلاش کر کے اس پر چلتے ہوئے ایسے نقش پا چھوڑ جاتی ہیں، جو آنے والوں کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوتی ہیں''۔(۲۸)

مسز مقبول حمید ۱۹۳۸ء میں راولاکوٹ کے ایک قریبی گاؤں ہورنہ میرہ میں پیدا ہوئیں۔اُن کے والد بگا خان علاقے کے معزز اور خوش حال لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔وادی پرل راولاکوٹ کے اس عہد کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> ''جدیدیت کی رسائی سے پہلے یہاں کا ماحول بہتے پانی کی طرح شفاف تھا۔گرمیوں کا موسم نہایت خوش گوار ہوتا تھا۔تیرتے بادلوں کے ساتھ اڑنے کو جی چاہتا تھا۔ہری بھری سرسبز زمین دل کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو تراوت پہنچاتی تھی۔جنگلی پھول، پودے و بیلی کو مہکائے رکھتے تھے۔سردی کا موسم بے حد سرد تھا۔چاروں طرف پہاڑ برف کا لبادہ اوڑھے سر بفلک نظر آتے۔گھروں کی چھتوں کو برف کے ڈھیر چھپا لیتے۔گھروں کی

چاروں طرف برف کے ڈھیروں پر ہم بچے آسانی سے نیچے کود جاتے تھے''۔(۲۹)

اپنے عہد کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

''سردیوں میں انسان اور جانور ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔بعض اوقات دونوں حصوں کے درمیان پوری دیوار ہوتی تھی،اکثر آدھی دیوار کے آر پار رہتے تھے۔گھر کو موٹی موٹی لکڑیاں جلا کر گرم کیا جاتا تھا۔جانوروں کے کمرے کو مقامی زبان میں گوال کہتے تھے۔اس کے اندر ایک کھرلی ہوتی تھی،جس میں جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا تھا۔ جب کسی عورت کو دردِ زہ شروع ہوتا،اسی گھاس پھوس والی کھرلی کا رُخ کیا جاتا۔وہی گھاس کی کھرلی ہم میں پہلے تین چار بہن بھائیوں کی لینڈنگ پلیس (Landing Place) ہے،اسی میں ہم نے آنکھ کھولی اور دنیا سے متعارف ہوئے''۔(۳۰)

علاقے کی خوبصورتی،اس عہد کے حالات،مشکلات،پسماندگی کے ساتھ ساتھ مصنفہ اپنے بچپن،ابتدائی تعلیم اور اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے تعارف بھی کراتی ہیں۔وہ اپنی کمسنی کی شادی،ابتدائی تعلیم،ایم اے انگریزی،اعلیٰ تعلیم اور پاکستان کے بہترین اداروں میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے ریٹائرمنٹ تک کے واقعات بیان کرتی ہیں۔دوسو صفحات کی اس کتاب میں مصنفہ نے تسلسل سے اپنی زندگی کی داستان خوب صورت اسلوب بیان میں تحریر کی ہے۔مصنفہ زندگی کے نرم گرم واقعات اور خوش کن حالات پر مشتمل ان کی زندگی کا سفر''بڑے بڑھے سے شیکسپیئر تک''مکمل ہوتا ہے۔

''یادوں کے شیریں نقوش''ایک دور کی خوب صورت زندگی کا خوب صورت بیان ہے۔اس میں بیسویں صدی کے وسط کی کشمیری اور بالخصوص پونچھ کے گاؤں کی ایک عورت کو دیکھا جا سکتا ہے،جو پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو منواتی ہے اور اکیسویں صدی کی دہلیز میں پورے قد کے ساتھ کھڑی ہے۔اس پس منظر میں''یادوں کے شیریں نقوش''اُردو آپ بیتی کی روایت کی ایک اہم اور منفرد آپ بیتی ہے،جو عہد حاضر کی خواتین کو یہ پیغام دیتے ہوئے اختتام پذیر ہوتی ہے:۔

To know thyself is the greatest knowledge.

''خواتین میں جسمانی قوت کے علاوہ دیگر تمام دلی و دماغی قوتیں مردوں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ان سے کام لے کر اپنے مقاصد حاصل کریں اور اپنے عمل سے دوسروں کے لیے مشعل راہ بنیں''۔(۳۱)

داستانِ حیات (میجر جنرل (ر) محمد حیات خان)

میجر جنرل (ر) محمد حیات خان نے ضلع پونچھ آزاد کشمیر کے ایک گاؤں چھوٹا گلہ میں آنکھ کھولی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں یہ علاقے انتہائی پسماندہ تھے۔ اس علاقے کے عوام زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم، تعلیم، صحت، ذرائع آمدورفت سے بے نیاز مشکل زندگی گزار رہے تھے۔ ایسے حالات میں جنم لینے والے محمد حیات فوج اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں (جنرل، چیف ایگزیکٹو) تک پہنچے۔ یوں انھوں نے ایک ہمہ پہلو اور سرگرم زندگی گزاری اور بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کامیابیوں کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے بالکل معصوم عمر سے تسلسل کے ساتھ بے انتہا محنت کی، جو اللہ تعالیٰ کو شاید پسند آگئی اور اُس نے میری رہنمائی جاری فرمائی۔ نتیجتاً میں اپنے نیک مقاصد میں کامیاب رہا۔ مجھے فوج میں جو عہدے ملے اور آزاد کشمیر میں قومی اور حکومتی سطحوں پر خدمات کے مواقع ملے۔ ان سب کو ملک اور قوم کی خدمت کے لیے استعمال کیا''۔ (۳۲)

''داستانِ حیات''، میجر جنرل (ر) محمد حیات خان کی انھی کامیابیوں کی داستان ہے۔ محمد حیات خان نے اپنی عملی زندگی کا آغاز فوج میں ریکروٹ کلرک کی حیثیت سے کیا۔ تقسیم برعظیم تک انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ ۱۹۴۷ء میں وطن واپس آکر جہادِ آزادی کشمیر میں شامل ہو گئے۔ جہادِ کشمیر میں عمدہ کارکردگی دکھانے والے جوانوں کو فوج میں کمیشن آفیسر بھرتی کیے جانے کے فیصلے کے مطابق محمد حیات خان سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے پاک فوج میں شامل ہوئے۔ جہاں اپنی محنت، دیانت داری، فرض شناسی کے باعث جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ محمد حیات خان لکھتے ہیں:۔

> ''میں اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے عملی زندگی کے آغاز سے ہی شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کے شعر:
>
> خدا کے عاشق تو ہزاروں ہیں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
> میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
>
> سے متاثر ہو کر خدمت کا جذبہ عطا فرمایا اور اس کے لیے مواقع بھی فراہم کیے اور میری مخلصانہ، دیانت دارانہ اور ایمان دارانہ محنتوں کو شرف قبولیت بخش کر مجھے ہمیشہ کامیابیوں سے نوازا''۔ (۳۳)

چناں چہ وقت اور حالات نے انھیں آزاد کشمیر کا اقتدار اعلیٰ دیا۔ اس دوران انھوں نے عوامی خدمت اور ریاست میں تعمیر و ترقی کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ انھوں نے انتہائی محنت سے کام کیا، اعلیٰ عہدے پر ہونے کے باوجود کئی کئی میل تک

پیدل چل کر دور افتادہ دیہاتوں تک پہنچے اور تعمیر و ترقی کے کاموں میں عوام کو شریک کیا۔ اپنے عہد میں اُنھوں نے سڑکوں کے جال بچھائے اور اس طرح آزاد کشمیر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ ''داستانِ حیات'' میں محمد حیات خان نے اپنے عہدِ حکومت میں کیے جانے والے کاموں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اُنھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد سیاسی جماعت تشکیل دی اور اس سفر میں بھی ابتداً کامیابیوں سے ہم کنار ہوئے۔

جنرل محمد حیات کی آپ بیتی پانچ سو سے زائد صفحات پر محیط ہے۔ ''داستانِ حیات'' میں انھوں نے اپنی ذاتی زندگی، خاندان اور عہد کے حالات اور تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر کی سیاست اور اُن کے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کو آسان اور سہل زبان میں بیان کر دیا ہے۔ ادبی حوالے سے اگرچہ آپ بیتی زیادہ اہم نہیں ہے مگر ایک محنت پسند، غریب فرد کی کامیابیوں کی اس داستان میں دوسروں کے لیے کئی سبق پوشیدہ ہیں۔ بشیر حسین جعفری کتاب کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:۔

> ''میجر جنرل (ر) محمد حیات خان نے پاکستان اور آزاد کشمیر کی بیسویں صدی کی ایک حد تک سیاسی، سماجی اور عمومی تاریخ رقم کر دی ہے۔ خودنوشت سوانح عمریوں کے جہان میں یہ کتاب ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے والوں کے علم میں جہاں اضافہ ہوگا وہاں اُن کی سوچ میں ایک دل آویز تبدیلی بھی آئے گی''۔(۳۴)

وُلر کنارے (سید علی گیلانی)

سید علی گیلانی خطہ کشمیر کے ایک ممتاز سیاست دان اور مجاہد ہیں۔ وہ نظام اسلام کے غلبے کی جدوجہد کرنے والی اسلامی تحریک کے سرگرم کارکن، رہنما اور تحریکِ آزادی کشمیر کے پُرجوش ترجمان کے طور پر بھی معروف ہیں۔ مدرس، مقرر، ادیب اور دوسری کئی جہتیں سید علی گیلانی کا امتیاز ہیں۔ اپنی انھی ہمہ جہت اور ہنگامہ خیز سرگرمیوں کے باعث وہ قید و بند کی صعوبتوں کا شکار بھی رہے اور دشمنوں کی آنکھوں میں کانٹا بھی بن کر کھٹکتے رہے، مگر وہ چٹان کی طرح اسلام اور تحریک آزادی کے دشمنوں کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ علی گیلانی کو یہ مقام بلند کسی حادثے یا واقعے کی بنیاد پر حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ نصف صدی سے زائد عرصہ کی محنت، کاوش اور جدوجہد کے نتیجہ میں وہ اس تحریک آزادی کا اہم حوالہ اور داعی اسلام کے منصب پر پہنچے ہیں۔

سید علی گیلانی نے غربت اور تنگ دستی میں آنکھ کھولی۔ مشکل حالات سے دوچار ہوئے۔ چھوٹی چھوٹی ملازمتوں سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر اسلام کے آفاقی پیغام کی اشاعت کے داعی بن گئے اور تحریک آزادی کے علمبردار اور ترجمان بن کر سامنے آئے۔ وہ ممبر اسمبلی، ایڈیٹر ماہنامہ ''اذان''، چیئرمین تحریک حریت بھی رہے۔ ''وُلر کنارے'' اسی ہمہ جہت شخصیت کی زندگی کی داستان اور آپ بیتی ہے۔ آپ بیتی کے نام کے حوالے سے علی گیلانی حرفِ اوّل میں لکھتے ہیں:۔

> ''وُلر پورے ایشیا میں میٹھے پانی کی بڑی جھیل ہے۔ کتاب کے مصنف نے بچپن، لڑکپن اور شباب میں قدرت کی اس عظیم نعمت کا استفادہ کیا۔ مصنف نے وُلر کے شفاف اور میٹھے پانی سے استفادہ کا حق ادا کرنے کے لیے اس نام کو ترجیح دی''۔ (۳۵)

سید علی گیلانی کی زندگی دار و رسن، قید و بند اور قفس یاترا کا دوسرا نام ہے۔ وہ اپنی زندگی کا بڑا حصہ جیلوں اور نظر بندیوں میں گزار آئے ہیں۔ جس کا تذکرہ ''رودادِ قفس'' کی دو جلدوں کی صورت میں منظر عام پر آ کر قارئین سے داد حاصل کر چکا ہے۔ مگر ''وُلر کنارے'' باضابطہ آپ بیتی کے روپ میں کئی نئی منزلیں اور گیلانی کی زندگی کے ساتھ ساتھ کشمیر کی تاریخ و تہذیب، تحریک آزادی اور ادب کے نئے حوالے سامنے لاتی ہے۔ کتاب کے دیباچے میں حسن زینہ گری رقم طراز ہیں:۔

> ''زُوری منز کے گم نام دیہات میں پیدا ہونے والے غریب اور نادار لڑکے کا رحمت آباد حیدر پورہ سری نگر کا سفر محض ایک فرد کی روداد نہیں، بلکہ شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد گیلانی صاحب نے جس طرح اعلائے کلمۃ الحق اور آزادی وطن کی جدوجہد اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا اور اس عظیم مقصد کے لیے اپنی زندگی کو تج دیا اور جملہ صلاحیتیں اس کے لیے وقف کیں اور اس حیثیت میں اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔ یہ چیز ان کی اس آپ بیتی کو ایک فرد کی سرگزشت سے اوپر اٹھا کر ایک دور کی کہانی کی زینت

بخش دیتی ہے۔ جہاں وہ کشمیر کے سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی اور صحافتی حلقوں میں ایک خاص پہچان چھوڑتے ہوئے آگے جارہے ہیں''۔(۳۶)

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر''وُلر کنارے'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''یہ ایک شخص کی داستان نہیں بلکہ ایک عہد کی زندہ و تابندہ تاریخ ہے۔اپنی ذات کے جلو میں کشمیر کی ستم رسیدہ اور درماندہ ملت کے لٹنے، سمٹنے، جھپٹنے اور پلٹنے کا تذکرہ اگر قاری کو حسرت و یاس میں مبتلا کرتا ہے تو ساتھ ساتھ قرآن حکیم کی آیات اور اقبال کے آفاقی اشعار سے امید اور رجائیت کا پیغام بھی''وُلر کنارے''میں موجود ہے۔

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک

خضر سوچتا ہے وُلر کنارے ''۔(۳۷)

سید علی گیلانی کی ذاتی زندگی اور اجتماعی معاملات حیران کرنے والے ہیں۔انھوں نے سری نگر کی گلیوں میں پتھر ڈھوئے، کپڑوں کے گٹھے کندھوں پر لے جا کر پھیری تک کی۔اُنھوں نے خانیار میں دکانوں کے تھڑوں پر سو کر راتیں گزاریں، جنۃ کاک میں سڑک کی تعمیر میں مزدوری کی۔ وہ علم کے حصول کے لیے لاہور پہنچے اور گھریلو ملازمت کی، اقبال شناسی کا حصول، عظیم نصب العین کی پہچان، سیاسی جماعتوں میں شمولیت، قید و بند کی صعوبتیں، بطور ممبر قانون ساز اسمبلی اعلیٰ کردار اور تحریک حریت کشمیر کے چیئر مین کی حیثیت میں منفرد مقام، یہ تمام حوالے پوری کتاب میں تفصیل سے آئے ہیں۔اپنی زندگی کے بارے میں علی گیلانی لکھتے ہیں:۔

''میری زندگی حادثات سے تعبیر ہے۔زندگی کے اوراق جتنے لکھے جائیں گے اور آپ کے پڑھنے میں آئیں گے آپ حادثات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ پائیں گے اور بسا اوقات آپ خود محسوس کریں گے کہ اس شخص کی زندگی کا اتنا سفر طے کرنا، کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہ صرف غیبی مدد اور دستگیری ہے کہ یہ شخص ان جانکاہ حادثات سے بچ نکلا''۔(۳۸)

حادثوں سے عبارت علی گیلانی کی زندگی اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل ایمان اور یقین ہی کی بنیاد پر ہر بار سرخروئی سے ہم کنار ہوئی ہے۔اسی طرح انفرادی اور ذاتی زندگی جب اجتماعی معاملات سے دوچار ہوئی تو یہاں کبھی تو نیشنل کانفرنس کے تنظیمی ہیڈ کوارٹر مجاہد منزل میں سکونت پذیر ہونا پڑا تو کبھی لاہور میں اقبالیات میں غوطہ زن۔ان کی زندگی کبھی تحریکِ آزادی کا حوالہ اور علامت بن جاتی ہے تو کہیں سرفروش مجاہدوں کی سرپرستی اور رہنمائی کا سامان اور بالآخر تحریکِ اسلامی کے لیے خطہ کشمیر میں رہنمائی اور اشاعت کا ذریعہ اور وسیلہ بنتی ہے:۔

''گیلانی صاحب کی آپ بیتی گیلانی صاحب کی آپ بیتی نہیں۔ یہ تحریکِ اسلامی سے وابستہ قافلہ سخت جاں کے ایثاروقربانی،صبرواستقلال،عزم وعزیمت کی داستان ہے۔ یہ دعوت دین کی اشاعت اور اسلامی لٹریچر سے خود کو مستفید کرنے اور Resourceful بنانے کے زمانے کی بازگشت ہے۔ یہ بستی بستی،قریہ قریہ،سعید روحوں کو ڈھونڈنے اور ان تک جماعت کا حیات آفریں پروگرام کتابوں، جرائد، خطبات، انفرادی ملاقوں، سیمیناروں، مباحثوں اور اجتماعات میں بلانے کی صورت میں پہچاننے کی ''دیوانگی'' کا تذکرہ ہے۔ یہ مخالفوں کی گالیوں کو اپنی جھولی میں بھر کی انھیں دعائیں دینے کی حسین یادوں کی کہانی ہے''۔(۳۹)

پونے چھے سوصفحات پر محیط لگ بھگ ایک صدعنوانات کی یہ آپ بیتی علی گیلانی کی زندگی کے ۱۹۷۰ءتک کے واقعات پر مشتمل ہےاور جلداوّل کےطور پراشاعت پذیر ہوئی ہے۔علی گیلانی کی زندگی کا اس کے بعدوالا دور پہلے دور سے زیادہ ہنگامہ خیز اور بھرپور ہے۔لہٰذا ''وُلر کنارے'' کا دوسرا حصہ جلداوّل سے بھی زیادہ بھرپوراورمنفرد ہوگا۔

''وُلر کنارے'' کا اسلوب بیان سادہ اور دلنشیں ہے۔علی گیلانی نے درجن سے زائد کتب تصنیف کی ہیں،جن میں ''رودادِ قفس''،''اقبال روح دین کا شناسا''اہم ہیں۔ماہنامہ''اذان'' کی ادارت اوراس میں چھپنے والے مضامین کے باعث وہ پہلے ہی اپنے ایک جدااسلوب کے حامل ادیب ہیں۔ان کے قلم میں اپنے خیالات کوخوب صورت الفاظ میں بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔''وُلر کنارے'' میں گیلانی نے اپنے سلجھے ہوئے انداز بیان میں حضرت علامہ اقبال اور دوسرے شعرا کے خوب صورت اشعار کے برمحل استعمال سے اپنے بیان میں زیادہ وسعت اوراثر پذیری پیدا کی ہے۔سچائی اورصداقت،واقعات اورحالات پر بےلاگ اظہاراور تاریخی واقعات کوحقیقت اورعینی شاہد کےطور پر بیان نے ان کی آپ بیتی کی قدروقیمت میں اضافہ کردیا ہے۔آپ بیتی کی دیگرخوبیوں تذکرہ رجال،انکشاف ذات اوراظہارذات کے متوازن بیان کےحوالے سے بھی یہ آپ بیتی بھرپور ہے۔البتہ علی گیلانی نے تاریخی واقعات اورتحریکِ اسلامی کےحوالے سےتفصیلات کے بیان میں آپ بیتی سے بڑھ کرمعلومات دینے کے باعث''وُلر کنارے'' نے غیرضروری حدتک طوالت اختیار کرلی ہے۔وہ واقعات سےمزید واقعات نکالتے چلے جاتے ہیں،جس سے یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا ہے،پھرحکایت ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔یہاں انھوں نےتحریکِ اسلامی جمّوں وکشمیرکی پوری تاریخ بھی بیان کردی ہے،یہ تفصیلات الگ ایک کتاب کی متقاضی ہیں۔اس حوالے سے بہت سی تفصیلات ان کی دوسری کتب میں بھی موجود ہیں۔

آپ بیتی کا بیشتر حصہ''رودادِ قفس'' کی دونوں جلدوں میں پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔عنوانات کی ترتیب اورابواب

بندی نہ ہونے اور پروف کی غلطیوں کے باعث بھی کتاب کی خوب صورتی متاثر ہوئی ہے۔ ذات کا بیان اگرچہ مناسب حد تک موجود ہے، مگر ابتدائی زندگی، تعلیمی سرگرمیوں اور ملازمتوں کے بعد جب علی گیلانی سیاست اور تحریکِ آزادی کشمیر کی جدوجہد کی تفصیلات بیان کرتے ہیں تو اُن کی زندگی کے ارتقائی مراحل اور معاملات کا بیان کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ آپ بیتی نگار کے بجائے کسی قدر تاریخ دان بن جاتے ہیں۔ بایں ہمہ ''وُلر کنارے'' اکیسویں صدی میں تصنیف ہونے والی اُردو زبان کی کشمیری آپ بیتیوں میں اپنے لوازمے اور اسلوب میں منفرد آپ بیتی ہے۔ ''وُلر کنارے'' کے دوسرے حصے کے بعد اس کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہوگا، جس کے بارے میں ''وُلر کنارے'' کی آخری سطور میں اطلاع دے دی گئی ہے:۔

> ''اگست ۱۹۷۰ء کے اس اجتماع کی کچھ جھلکیوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے ساتھ ہی میرے ذہنی خاکہ میں ''وُلر کنارے'' کے جو خدوخال محفوظ ہیں ان کا پہلا حصہ ترتیب پا چکا۔ الحمد للہ۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دوسرا حصہ ترتیب دینے کی مہلت بھی عطا کرے''۔(۴۰)

حوالہ جات:

۱۔ عارف بہار، سید: کشمیر تاریخ کے گرداب میں۔ کراچی: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۸۵

۲۔ مجید اصغر: ابھی تم نہ آنا، مشمولہ ''ارقم'' شمارہ نمبر ۲۔ راولاکوٹ: دارِارقم ماڈل کالج، ۲۰۱۰ء، ص ۳۹۴

۳۔ بشیر حسین جعفری، سید: زندہ باد۔ باغ آزاد کشمیر: کشمیر سٹڈی لیگ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶

۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۶۔ ایضاً، ص ۲۲

۷۔ ایضاً، ص ۷۰۹

۸۔ پرویز پروازی، ڈاکٹر: پس نوشت اور پس پس نوشت۔ لاہور: نیا زمانہ پبلی کیشنز، ص ۴۴

۹۔ محمد یعقوب ہاشمی، حافظ: حاصل عمرِ رائیگاں۔ نیئر فین پرنٹرز، ۲۰۰۹ء، ص ن

۱۰۔ ایضاً، ص ۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۶

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۴۔ پروفیسر صابر حسین، ڈاکٹر: فلیپ ''حاصل عمرِ رائیگاں''

۱۵۔ محمد یوسف، چودھری: نقش برآب۔ میرپور: طاہر پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص د

۱۶۔ قاضی عبدالغفور، (ر) جج عدالت عالیہ: تاثرات ''نقش برآب''

۱۷۔ محمد یوسف، چودھری: نقش برآب۔ ص ۲۱۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۱۹۔ عبدالہادی احمد: پیش لفظ، جموں کی یادیں۔ راولپنڈی: مرکز مطبوعات کشمیر ۲۰۰۴ء، ص ۲

۲۰۔ محمد غوث چوہان: جمّوں کی یادیں۔ راولپنڈی: مرکز مطبوعات کشمیر ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۱

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۲۳۔ ایضا!، ص ۸

۲۴۔ عبدالقیوم، راجا: داستانِ عزم۔ لاہور: علم وعرفان پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۴

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۲۷۔ مسز مقبول حمید: یادوں کے شیریں نقوش۔ راولاکوٹ: دھرتی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۸

۲۹۔ ایضاً، ۲۰

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۶

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۲۔ محمد حیات خان، جنرل (ر): داستانِ حیات۔ راولپنڈی: چکلالہ اسکیم نمبر ا، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۱

۳۵۔ علی گیلانی، سید: وُلر کنارے۔ سری نگر: مرکزی مکتبہ تحریک حریت حیدر پورہ، فروری ۲۰۱۱ء، ص

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۴

۳۷۔ ظفر حسین ظفر، ڈاکٹر: وُلر کنارے از علی گیلانی، مشمولہ ارقم، شمارہ ۳۔ راولاکوٹ: دارِ ارقم ماڈل کالج، ۲۰۱۲ء، ص

۳۸۔ علی گیلانی، سید: وُلر کنارے، ص ۵۹

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۵

۴۰۔ ایضاً، ص ۵۷۱

١٨٦

باب چہارم

دیگر اصنافِ سخن میں آپ بیتی کے نقوش

زندگی نشیب وفراز سے عبارت ہے۔اس میں سپاٹ رستے بھی ہیں اور پُر پیچ گھاٹیاں بھی۔تجربات اور حوادث بھی اور مشاہدات اور محسوسات بھی۔ جب کوئی فرد اپنی آپ بیتی مرتب کرتا ہے تو دراصل وہ ان واقعات و تجربات اور مشاہدات و محسوسات ہی کو بیان کرتا ہے، جو اُسے زندگی کے سفر میں پیش آئے۔انھی گوناگوں تجربات اور حوادث کو مختلف انداز میں بیان کرنے کے لیے انسان نے مختلف انداز اختیار وایجاد کیے۔وہی تجربات جو اسے پیش آئے اس نے فرضی ناموں اور کرداروں سے بیان کرنا شروع کیے تو بہت سی اصناف معرض وجود میں آئیں۔یہ افسانوی کردار دراصل ہماری ذات ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔ جنھیں کچھ مجبوریوں کے باعث فرضی نام دے کر ہم اصناف ادب میں سمو دیتے ہیں۔ہم کیسا بننا چاہتے ہیں؟ کچھ خواب کہ جو تعبیروں کی صورت میں ہماری زندگی میں ڈھل نہیں پاتے۔ہم اپنے افسانوں، ناولوں اور داستانوں کے کرداروں کے ذریعے پورے کرنے کی سعی کرتے ہیں۔اس طرح ان کرداروں کی بُنت، اُن کے کارنامے، ناکامیاں اور اس سب سے جو کچھ معرض وجود میں آیا ہے وہ ہماری آپ بیتی ہی کی ان کہی باتیں ہیں۔یوں ادب کی تمام قسمیں آپ بیتی ہی سے وجود میں آتی ہیں:۔

> ''ہمارا افسانوی ادب دراصل سوانحی ادب ہے، جو واردات ہمارے افسانوی کرداروں کو پیش آتے ہیں اگر ہمیں پیش نہ بھی آئے ہوں تب بھی ان کی صداقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔شاعرانہ صداقت اتنی تنگ اور سطحی نہیں ہوتی جتنی عام طور پر غیر شاعرانہ صداقت ہوتی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں ابتداً اصناف ادب خلط ملط صورت میں ہی وجود پذیر ہوئیں۔پھر رفتہ رفتہ اُن کی فنی اور فکری تفاوتیں تلاش کی گئیں۔تمام اصناف ادب کا مرکز اور محور چوں کہ انسانی ذات ہے اس لیے ہر صنف سخن میں آپ بیتی کا عنصر پایا جانا لازمی امر ہے اور ترقی کی کئی منازل طے کرنے کے بعد بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ کر پائیں گی۔

دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی ادب کا آغاز شاعری سے ہوا۔اُردو شاعری کے آغاز میں مثنوی سب سے اہم صنف شاعری تھی۔مثنوی بیانیہ ادب کی اہم شاخ ہے، جس کے ذریعے شاعر اپنا حال قاری تک پہنچاتا ہے۔فرضی قصوں کے ساتھ ساتھ شاعر آپ بیتی بھی بیان کرتا ہے۔اسی طرح نثری اصناف میں داستان، ناول، ڈرامہ، افسانہ، غیر افسانوی اصناف میں سفرنامہ، رپورتاژ، روزنامچہ، ڈائری، خطوط، تاریخی تصانیف اور دیگر اصناف میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہوتے ہیں۔یہی صورت حال کشمیر میں تخلیق ہونے والے اُردو ادب کی اصناف میں ہے۔کشمیر میں اُردو زبان وادب کے آغاز اور ارتقا کے ضمن میں پچھلے ابواب میں ادوار کے حوالے سے تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔اس باب میں اصناف ادب کے حوالے سے آپ بیتی کے نقوش کا مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

سفرنامہ

کشمیر میں سفرنامے کی روایت بہت پرانی ہے۔ یوں تو کشمیر کا تذکرہ اہم اور قدیم آماخذ پر مشتمل سفرناموں میں موجود ہے، جن میں عظیم فلسفی اور مؤرخ ہیروڈوٹس اور مارکو پولو کی تحریریں اور ابوریحان البیرونی کا سفرنامہ ''کتاب الہند'' اہم ہیں۔ پھر کشمیر کی باقاعدہ سیاحت کرنے والوں میں پہلا غیر ملکی سیاح فاہیاں، جس کا تعلق چین سے تھا، نے اپنے سفرنامے میں کشمیر کے حالات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ فاہیاں پانچویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے میں کشمیر آیا۔ فاہیاں کے بعد ہیون سانگ، اوکونگ، ابوریحان البیرونی، فرانکوئس برنیئر، ڈی سدری، جارج فاسٹر، ولیم مورکرافٹ وغیرہ نے سیاحت کشمیر کے بعد تفصیلی سفرنامے لکھ کر کشمیر کی تاریخ، تہذیب وتمدن، سیاست اور معیشت کے بارے میں نہ صرف اہم معلومات دنیا تک پہنچائی ہیں بلکہ کشمیر کی تاریخ کے اہم گوشے بھی منظرعام پر لائے۔ اس حوالے سے سید سلیم گردیزی اپنی کتاب ''غیر ملکی سیاحوں کی سیاحت کشمیر'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''اس جنت نظیر خطے کی ایک جھلک دیکھنے ہر دور میں سیاح آتے رہے۔ ان میں سے بعض نے باقاعدہ سفرنامے لکھے، جو دنیا کے مختلف ملکوں سے مختلف زبانوں میں شائع ہوئے اور دنیا بھر میں اس خوب صورت خطے کے تعارف کا باعث بنے''۔(۲)

کشمیر کے غیر ملکی سیاحوں میں مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہیں، صوفیا اور علما بھی اور سیر وسیاحت کے شوقین بھی۔ ان غیر ملکی سیاحوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے جن میں سے متعدد سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ اس حوالے سے کشمیر کلچرل اکیڈمی سری نگر کے جریدہ ''شیرازہ'' نے اپنے پانچ شماروں میں غیر ملکی سفرناموں کے نمبرز شائع کیے ہیں، جن میں غیر ملکی سیاحوں کے سفرناموں کے حوالے سے کشمیر کی تاریخ، تہذیب، جغرافیے اور دیگر حوالوں سے گراں قدر معلومات اور تحقیقات منظرعام پر آئی ہیں، مگر کشمیر میں آپ بیتی کے نقوش کے حامل سفرناموں کے حوالے سے ان سفرناموں کا تذکرہ مقصود ہے، جو ریاست جمّوں وکشمیر کے باشندوں نے اُردو میں تصنیف کیے ہیں۔ کشمیر میں ایسے سفرناموں کا آغاز مہتہ شیر سنگھ کی تصنیف ''سفرنامہ بخارا'' سے ہوتا ہے، جو مہاراجا رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں تحریر ہوا۔ اسی دور کا ایک اور سفرنامہ ''سفرنامہ عزت اللہ'' ہے۔ ڈاکٹر ضیاالدین اپنے مضمون ''کشمیر میں سفرنامے کی روایت'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ہماری ریاست (جمّوں وکشمیر) میں سفرنامے کے ابتدائی نقوش ہمیں پنڈت سالگرام سالک (۱۸۵۷ء۔۱۹۲۹ء) کے سفرنامے ''تحفہ سالک'' میں ملتے ہیں''۔(۳)

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق ریاست جمّوں وکشمیر (مقبوضہ) میں آٹھ سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ ان کے نام کچھ اس طرح ہیں:۔

''میری پاکستان یاترا'' از ملک راج صراف، ''پاکستان میں دودن'' از اوم پرکاش،
''پشکن کے دیس میں'' ازجگن ناتھ آزاد، ''کولمبس کے دیس میں'' ازجگن ناتھ آزاد،
''روس کا سفر'' ازصوفی غلام محمد، ''پاکستان کا سفر'' ازخواجہ ثنااللہ بٹ، ''پاکستان کا سفر''
ازحامدی کاشمیری، ''پاکستان کا سفر'' ازوجیہہ احمد اندرابی''۔(۴)

ان آٹھ سفر ناموں میں سے پہلے چار کتابی صورت میں شائع ہوئے، جب کہ باقی مختلف اخبارات میں چھپے ہیں۔آزاد کشمیراور پاکستان میں منظرعام پرآنے والے سفر ناموں میں محمد دین فوق کا سفر نامہ کشمیر، کرشن چندر کا ''صبح ہونے تک''، شورش کاشمیری کا ''چار ہفتے یورپ میں''، حامدی کاشمیری کا ''انجمن آرزو''، میجر طلا خان سدوزئی کا ''میرا سفر نامہ''، شمس کاشمیری کا ''جہلم سے عرفات تک''، جان کاشمیری کا ''سفر نامہ''، ثریا خورشید کا ''بانہال کے اس پار''، جسٹس خواجہ محمد شریف کا ''وادی جنت نظیر''، محمد کبیر خان کے ''اک ذرا افغانستان تک''، ''سفر مفر'' اور ''سفر بے سیار''، بشیر احمد صدیقی کا ''کشمیر سے سوات تک''، یعقوب نظامی کا ''پاکستان سے انگلستان تک''، ڈاکٹر صابر آفاقی کے ''سفر محبتوں کا'' اور ''کثرت نظارہ''، پروفیسر رفیق بھٹی کے ''ایران صغیر سے ایران کبیر تک'' اور ''دوستی کا سفر''، سید سلیم گردیزی کا ''میں نے کشمیر جلتے دیکھا''، ظفر حسین ظفر کا ''وادیٔ گل پوش میں'' اور ''کشمیر یاترا'' شامل ہیں۔

ان تمام سفر ناموں میں سفر نامہ نگاروں نے اپنے ذاتی مشاہدات، تاثرات اور تجربات کو اس طور بیان کیا ہے کہ وہ ان کی آپ بیتی کا حصہ بن گئے ہیں۔کشمیری سفر نامہ نگاروں نے وہی بیانیہ انداز اپنایا ہے، جو اردو سفر نامے کی بنیادی خوبی ہے۔البتہ مشاہدے، تجربے اور اشاعت کے زمانی فاصلوں کے باعث بعض محض خارجی عوامل کے بیان تک محدود ہیں۔اُردو سفر نامے کی ارتقائی منازل کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ''اُردو ادب میں سفر نامہ'' میں لکھتے ہیں:۔

> ''ابتداً سفر نامہ ایک سفر کی داستان اور کہانی کا حصہ تھا، لیکن جب سیاح کو بیرونی ملکوں اور اجنبی دیسوں اور تہذیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو کہانی کا داخلی عنصر سفر نامے کی خارجی صداقت میں سما گیا اور اس صنف کے انفرادی نقوش آہستہ آہستہ اجاگر ہونے لگے۔قدیم سفر نامہ زیادہ تر خارجی کوائف جمع کرتا تھا، لیکن جدید سفر نامے نے خارج اور داخل دونوں جہتوں کا احاطہ کیا ہے اور اب سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب کی صورت اختیار کر گیا ہے، جس میں داستان، کہانی اور آپ بیتی کے بیشتر عناصر شامل ہیں''۔(۵)

چناں چہ کشمیر کا سفر نامہ نگار بھی ان ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنے سفر ناموں میں خارج کے ساتھ ساتھ داخل کی دنیا

بھی دریافت کرنے پر مصر ہے۔ یوں ان سفرناموں میں سے اکثریت میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔ چند نمائندہ سفرنامہ نگاروں کی تصانیف کے نمایاں خدوخال کا مطالعہ پیش خدمت ہے۔

محمد دین فوق کے سفرنامے

محمد دین فوق مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، صحافی اور سفرنامہ نگار تھے۔ ڈاکٹر اجمل کی تحقیق کے مطابق: ''محمد دین فوق نے سو سے زائد کتابیں تحریر کیں'' (۶) وہ بنیادی طور پر مؤرخ تھے۔ ان کی تصنیف ''تاریخ اقوام کشمیر'' تین جلدوں پر محیط کشمیر کی مستند تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ ان کی آپ بیتی ''عمرِ رفتہ'' کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی اوّلین تصنیف ہے۔ شاعری اور ناول نگاری اور دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ محمد دین فوق نے چھے سفرنامے بھی مرتب اور تصنیف کیے ہیں، جن میں ''سفرنامہ کشمیر''، ''رہنمائے کشمیر''، ''شاہی سیر کشمیر''، ''دیہاتی و پنچایتی سفرنامہ''، ''نہرو کا سفرنامہ کشمیر'' اور ''سفرنامہ ڈھاکا'' شامل ہیں۔

''سفرنامہ کشمیر'' کشمیر میں اُردو کے ابتدائی سفرناموں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۰۷ء میں تصنیف ہوا۔ محمد دین فوق کشمیر کے سچے خیرخواہ اور پوری زندگی کشمیر کی تاریخ، تہذیب، سیاحت کے فروغ میں اپنی تصانیف اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے مصروف کار رہے۔ سیاحت ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں گھومتے رہتے تھے۔ کشمیر ان کا اپنا وطن تھا، اس لیے سیاحت کشمیر کی جھلکیاں ان کی جملہ تصانیف میں موجود ہیں۔ ''سیاحت کشمیر'' سمیت جملہ سفرناموں میں انھوں نے کشمیر ہی کو مختلف زاویوں سے بیان کیا ہے۔ حتیٰ کہ ''سفرنامہ ڈھاکا'' میں بھی انھوں نے ڈھاکا'' اور کشمیر کی مماثلتوں اور مشترکات پر روشنی ڈالی ہے۔

محمد دین فوق نے سفرناموں میں اپنے مشاہدات کو تاریخی معلومات کی بنیاد پر بیان کیا گیا ہے۔ ذاتی واردات کا بیان قدرے کم ہے، اپنے روایتی بیانیہ اسلوب میں انھوں نے خارجی عوامل اور مناظر کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ اُردو میں سفرناموں کا ابتدائی دور تھا، لہٰذا ان کے سفرنامے فنی اور فکری اعتبار سے اپنی کوئی منفرد شناخت نہ بنا سکے، مگر تاریخی اور دستاویزی اہمیت کے حامل ضرور ہیں۔ جب وہ واردات قلبی اور ذاتی مشاہدات کی عمدہ منظرکشی کرتے ہیں تو اُن کے سفرنامے آپ بیتی کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُردو کے ابتدائی سفرناموں میں شمار ہونے، تاریخی اور معلوماتی اہمیت اور کشمیر کے اس عہد کی جامع تصویرکشی کے باعث فوق کے سفرنامے اہم ہیں۔ ''رہنمائے کشمیر'' اور ''دیہاتی اور پنچایتی سفرنامہ'' کشمیر کی فلاح و بہبود اور کشمیر کے دیہی علاقوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ان کی مساعی کا ثبوت ہیں۔ اُن کا مرتب کیا ہوا ''پنڈت نہرو کا سفرنامہ کشمیر'' سیاسی نوعیت کی تحریر ہے، مگر کشمیر کی آزادی اور اس عہد کے سیاسی حالات کی ایک واضح تصویر سامنے لاتا ہے۔ بہرطور محمد دین فوق کی جملہ تصانیف سمیت ان کے سفرناموں میں بھی مرکزی اور بنیادی موضوع کے طور پر کشمیر پوری طرح موجود ہے۔ یہی فوق کے سفرناموں کی خاص انفرادیت، کشمیر سے ان کے والہانہ تعلق کا اظہار اور موضوع زیر بحث میں اہمیت ہے۔ ان سفرناموں میں کئی مقامات پر اُن کی آپ بیتی ''سرگزشت فوق'' کے کسی حصے کا گماں ہوتا ہے۔ لہٰذا اُن کے جملہ سفرنامے دراصل اُن کی آپ بیتی

ہی کا حصہ ہیں۔ ''سفر نامہ کشمیر'' سے چند اقتباسات پیش ہیں:۔

''اس سفر میں رات کو پسو بہت تنگ کرتے ہیں اور یہ تکلیف کشمیر کے تمام سفر میں پیچھا نہیں چھوڑتی''۔

''جو مال پنجاب سے یہاں آتا ہے یا کشمیر سے پنجاب جاتا ہے اس کی درآمد اور آڑھت کا صدر مقام بارہ مولا ہی ہے۔ یہاں کے قابل دید مقامات میں جامع مسجد اور دیوان خانہ خواجہ صمد جو کلگڑ قابل ذکر ہیں''۔(۷)

میرا سفر نامہ (میجر طلا خان سدوزئی)

میجر طلا خان سدوزئی کا سفر نامہ اُن کی سیاحت ہندوستان پر مشتمل ہے۔ انھیں ہندوستان کے تاریخی مقامات دیکھنے اور نامور شخصیات سے ملاقات کا شوق تھا۔ وہ اپنے تاریخی اور تہذیبی ورثے کے اہم نشانوں کو دیکھنے کے خواہاں تھے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے وہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر شفاعت احمد خان، مسز وجے لکشمی پنڈت اور دوسری نامور شخصیات سے ملے۔ انھوں نے اہم تاریخی شواہد، دستاویزات اور تصاویر حاصل کیں اور یہ سفر نامہ مرتب کیا۔ پشاور سے دہلی، علی گڑھ، آگرہ، اٹاوہ، لکھنؤ، متھرا، الہٰ آباد، بنارس، کلکتہ اور کشمیر کے تفصیلی حالات سفر نامہ میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور راستوں کے ساتھ ساتھ پونچھ کے سدوزئی قبائل، کشمیر کی تاریخ کے اہم اور چھپے ہوئے گوشوں کو منظر عام پر لایا ہے۔ کتاب میں ۱۸۵۷ء کے قومی غداروں کی طویل فہرست بھی مرتب کی گئی ہے اور جانباز اور سرفروش مجاہدوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کا حال لکھتے ہیں:۔

''اگلے دن میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے گیا۔ دوران گفتگو مولانا نے مجھ سے دریافت کیا کہ پٹھان قبائل آئے دن انگریزوں سے کیوں برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا پٹھان اس جنگ اور ان یلغاروں کو جہاد سمجھتے ہیں۔ انگریز نے اپنی مکاری، دھوکا بازی اور چالاکی سے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر پٹھان قبائل اُن کے خلاف برسرِ پیکار نہ ہوں تو وہ ان علاقوں پر بھی قبضہ کر کے اپنی عجیب وغریب ڈپلومیسی کے ذریعے جری اور شیر دل پٹھانوں کی آئندہ نسلوں کو گیدڑ بنا دے گا''۔(۸)

طلا خان ایک فوجی آفیسر تھے۔ ان کا لب ولہجہ بھی اس بات کا غماز ہے، اس لیے انھوں سچائی اور صداقت کے ساتھ حقائق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخی مقامات کے بیان، نصیحت آموز باتوں اور روداد نویسی کا اسلوب اپنایا ہے۔ ادبی حوالے سے کتاب کی اہمیت نہ ہے۔ البتہ تاریخی اور دستاویزی اہمیت موجود ہے۔ کشمیر کی تاریخ، یوسف زئی اور سدوزئی قبائل کی تاریخ کے

حوالے سے بھی اہم لوازمہ موجود ہے۔

میری پاکستان یاترا (ملک راج صراف)

''میری پاکستان یاترا'' جمّوں کے مشہور صحافی اور دانشور ملک راج صراف کا پاکستان کا سفر نامہ ہے۔ ملک راج ۱۹۷۹ء میں پندرہ دنوں کے لیے پاکستان آئے۔ ان کے اس سفر کا مقصد پاکستان میں مقیم اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات اور پاکستان کی سیر تھی۔ اسی دوران وہ پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں گئے اور سفر نامہ کے ذریعے اپنے اس سفر کے تاثرات بیان کیے ہیں۔ یہ سفر نامہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔

ملک صراف نے ایک صحافی کی نظر سے پاکستان کو دیکھا ہے اور یہاں کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کا بنظر غائر جائزہ لیا ہے۔ اُنھوں نے اپنے سفر نامہ میں پاکستان میں ہونے والی ترقی، عوام کا خلوص، ہمدردی اور مہمان نوازی، پاکستان کے دیہی علاقوں میں ہونے والی بیداری کی لہر، پاکستان میں چھپنے والے اخبارات اور رسائل کے عمدہ معیار اور ان کے اعزاز میں ہونے والے پروگرامات کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ملک صراف کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ صحافی ہیں اس لیے اُن کے اسلوب بیان میں صحافیانہ انداز کی جھلک نمایاں ہے۔

پاکستان میں دو دن (اوم پرکاش)

''پاکستان میں دو دن'' اوم پرکاش پنڈت کے دو روزہ دورہ پاکستان کی روداد ہے، جو انھوں نے شیخ عبداللہ کے ساتھ ۱۹۶۴ء میں کیا تھا۔ شیخ عبداللہ کو ۱۹۵۳ء میں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا تھا۔ گیارہ برس بعد جب شیخ عبداللہ کو رہا کیا گیا تو پاکستان اور ہندوستان کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے دورہ پاکستان پر بھیجا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی منصوبہ بندی کے تحت وہ پاکستان کے دورے پر آئے۔ اُن کے ہمراہ اس دورے میں اوم پرکاش بھی تھے۔

اوم پرکاش نے اپنے سفر کی روداد دلچسپ انداز میں تحریر کی ہے۔ سیاسی نوعیت کے اس سفر نامہ میں شیخ عبداللہ کے پاکستان میں پرتپاک استقبال اور سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ پاکستان کی روزمرہ زندگی کے بارے میں معلومات، صحافت کی صورت حال، پاکستان میں پریس، اخبارات اور دیگر حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے:۔

> ''اس سفر نامے کو پڑھتے ہوئے یہ تاثر ملتا ہے کہ اگر اچانک پنڈت نہرو کی موت واقع نہ ہوئی ہوتی تو یہ دورہ کامیاب رہتا اور دونوں ملکوں کے درمیان مسئلہ کشمیر کے حوالے سے جو کشیدگی اب ملتی ہے، شاید باقی نہ رہتی''۔(۹)

جگن ناتھ آزاد کے سفر نامے

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے قیام کشمیر کے دوران جموّں میں جو علمی و ادبی تصانیف منظرِ عام پر لائیں ان میں سے ان کے تین سفر نامے ''جنوبی ہند میں دو دن''، ''پشکن کے دیس میں'' اور ''کولمبس کے دیس میں'' بھی شامل ہیں۔اس حوالے سے انھیں کشمیر میں اُردو ادب کی روایت کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔جگن ناتھ آزاد عرصہ قیام کشمیر کے دوران مختلف علمی و ادبی تقاریب، مشاعروں اور دیگر حوالوں سے مختلف ممالک کے دورہ پر گئے۔ان ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد لکھے گئے یہ سفر نامے اُن کے تجربات، مشاہدات کا حاصل ہیں اور علمی و ادبی اور معلوماتی حوالوں سے بھی اہم ہیں۔''پشکن کے دیس میں'' انھوں نے روس کے سفر کی روداد لکھی ہے۔''کولمبس کے دیس میں'' امریکہ اور تیسرا جنوبی ہند کے رودادِ سفر پر مشتمل سفر نامہ ہے۔ڈاکٹر ضیاالدین ان سفر ناموں میں آپ بیتی کے نقوش کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

> ''جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفر کے تجربات کو نہ صرف تخلیقی عمل کا حصہ بنایا ہے بلکہ اس تجربے کو تخلیقات کی صورت دے کر آنے والی نسلوں کے لیے بصیرت اور آگاہی کا سامان بھی فراہم کیا ہے۔اس سے اُن کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے، جس سے ہم اُن کی شخصیت اور فکر و فن کا جائزہ لے سکتے ہیں''۔(۱۰)

بانہال کے اس پار (ثریا خورشید)

ثریا خورشید کشمیر کے ایک علمی و ادبی خانوادے سے ہیں۔وہ آزاد کشمیر کے سابق صدر کے ایچ خورشید کی اہلیہ ہیں۔کشمیر سے ہجرت کر کے آزاد کشمیر اور پاکستان آنے کے بعد وہ جب اپنے وطن کشمیر (مقبوضہ) گئیں تو اپنی ماضی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اس سفر کی روداد ''بانہال کے اس پار'' کی صورت میں قلمبند کی۔اس سفر میں انھوں نے دہلی اور آگرہ جیسے تاریخی شہروں کی سیاحت بھی کی اور وہاں کے حالات بھی اس سفر نامے میں لکھے ہیں۔

ثریا خورشید کا پسندیدہ موضوع تاریخ ہے۔اس لیے سفر نامہ سے قبل ریاست جموں و کشمیر کا تاریخی پس منظر، سیاسی اور سماجی حالات کو بھی بیان کر دیا ہے۔وہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''املتاس کے پیڑ'' اور یادداشتوں پر مشتمل آپ بیتی ''چناروں کے سائے'' بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔سفر نامہ زیرِ نظر میں بھی انھوں نے وہی افسانوی انداز اور تاریخی بیان کا لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ایک اقتباس پیش ہے:۔

> ''نشاط باغ کے سامنے ڈل کا نظارہ ہے اور پیچھے پہاڑ ہے۔باغ شالامار سے چھوٹا ہے، لیکن نظارہ دلکش اور دلفریب ہے۔یہ باغ جو جہانگیر نے بنوایا تھا، اس کی ساخت اور تعمیر شالامار سے بہت مختلف ہے''۔(۱۱)

ڈاکٹر صابر آفاقی کے سفرنامے

ڈاکٹر صابر آفاقی خطہ کشمیر کے ممتاز شاعر، محقق اور تاریخ دان تھے۔ اُردو، فارسی، کشمیری اور گوجری میں اُنھوں نے تحقیق اور تخلیقی ادب پر ۵۷ کتب تصنیف کی ہیں۔ جس میں آٹھ شعری مجموعے بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صابر آفاقی نے اُردو میں ''کثرتِ نظارہ''، ''سفر محبتوں کا'' اور ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا'' سفرنامے تصنیف کیے ہیں۔

''کثرت نظارہ'' پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء تخلیقات لاہور کے زیرِ انتظام شائع ہوا اور نظرِ ثانی کے بعد ۲۰۰۳ء میں اس کی دوسری اشاعت منظر عام پر آئی۔ یہ گیارہ ممالک کا سیاحت نامہ ہے، جس کا دیباچہ مستنصر حسین تارڑ نے لکھا ہے۔ ''کثرت نظارہ'' میں نیپال، ازبکستان، بھارت، بنگلہ دیش، برما، تھائی لینڈ، ملائشیا، ہانگ کانگ، میکاؤ، سنگاپور اور سری لنکا کی سیاحت کا احوال ہے۔ ''سفر محبتوں کا'' کے نام سے مقبوضہ کشمیر کا سفرنامہ ہے اور ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا'' ایران میں اُنھوں نے اپنے قیام کی یادداشتوں کو محفوظ کیا ہے۔ صابر آفاقی کا ایک گوجری سفرنامہ جمّوں و کشمیر آرٹ اینڈ کلچر اکیڈمی سری نگر کے زیرِ انتظام شائع ہونے والے جریدے ''شیرازہ'' میں شائع ہوا ہے۔ اس سفرنامے میں انھوں نے راولاکوٹ، پشاور اور ایران کے احوال بیان کیے ہیں۔

آفاقی کا انداز بیان سلجھا اور نکھرا ہوا ہے۔ البتہ متعدد اصناف اور کئی زبانوں میں لکھنے اور زودنویسی کے باعث وہ اپنی اکثر تصانیف سے انصاف نہیں کر پائے۔ اُن کی دیگر تصانیف کی طرح سفرناموں میں بھی مذہبیت اور بائی فرقے کی تعلیمات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ نیز ان کے یہ سفرنامے ادبی چاشنی سے بھی عاری ہیں۔

سفرنامہ (جان کاشمیری)

جان کاشمیری کا ''سفرنامہ'' گوجرانوالہ سے اسلام آباد تک کا سفرنامہ ہے، جہاں وہ تیسری اہل قلم کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ''اس مختصر سے، مگر دلچسپ سفرنامے کے تاثرات صرف لفظوں کی حد تک خاموش پیکر نہیں ہیں بلکہ چلتی پھرتی متحرک تصویریں ہیں، جو ہر ایک کو اپنی طرح متوجہ کر لیتی ہیں''۔ (۱۲)

روداد سفر کے ساتھ ساتھ ''سفرنامہ'' میں کانفرنس کے مباحث اور شرکائے کانفرنس کی خاکوں نے اس سفرنامے کو خاصے کی چیز بنادیا ہے۔ جان کاشمیری کے اسلوب بیان میں تخلیقی رعنائی ہے۔ وطن کی مٹی سے محبت اور علم و ادب سے شغف اس سفرنامے کے عنوانات ہیں:۔

> ''گوجرانوالہ سے اسلام آباد کا سفر بظاہر ایک سو انتیس میل کا ہے لیکن اگر یہ سفر تاریخ کی شاہراہ پر کیا جائے تو یہ صدیوں کے سفر در سفر کی داستانِ حیرت ہے۔ اور یوں یہ سفر اپنے اندر تاریخ کے بے پناہ ادوار، تہذیب کے بے شمار چہرے اور تمدّن کی ان گنت چھاؤں سمیٹے ہوئے ہے۔ راستوں کے پیچ و خم اور نشیب و فراز ان دفینوں

کے آئینہ دار ہیں''۔(۱۳)

جان کاشمیری کا ''سفرنامہ'' وطن کی محبت کے انھی تاریخی حوالوں کو کھوجنے اور ماضی کی محبتوں کو جگمگانے کی کاوش ہے۔

میں نے کشمیر جلتے دیکھا (سید سلیم گردیزی)

تحریکِ آزاد کشمیر کا تازہ ترین مرحلہ اسّی کی دہائی میں شروع ہوا۔تحریکِ آزادی کی اس جدوجہد کو دبانے کے لیے بھارتی حکومت نے مظالم کی انتہا کرتے ہوئے،انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔عین اس مرحلے پر جب یہ جہدآزادی،مقبوضہ کشمیر میں عروج پر تھی اور ساتھ ہی بھارتی ظلم وستم بھی،سید سلیم گردیزی وادی کشمیر میں داخل ہوئے:۔

''سفر کرنا آسان اور سفرنامہ لکھنا مشکل......لیکن جس علاقے کا سفر ہم کر رہے تھے وہ سفر دشوار تو تھا ہی مگر اس کی روداد لکھنا دشوار تر ہے۔ یہ سفر شعلوں میں گھری...... آنسوؤں سے تر اور خوں سے لتھڑی وادیٔ کشمیر کا تھا''۔(۱۴)

سید سلیم گردیزی کا سفرنامہ کشمیر کے جلتے بجھتے اور تاراج ہوتے حالات کی نقشہ کشی کا عنوان بھی ہے اور ثبوت بھی اور بھارتی ظلم واستبداد اور جبر کے خلاف عینی شہادتوں کی دستاویز بھی۔ یہ تحریکِ آزادی کی لازوال اور خونچکاں داستان کی سچی تصویر اور آنکھوں دیکھے حالات کی ایک خوب صورت تاریخی،علمی اور ادبی داستان ہے:۔

''کشمیر میرا گھر ہے۔ میں نے اسے نہ صرف جلتے دیکھا بلکہ میں خود بھی اس آگ میں جلا ہوں اور مسلسل جل رہا ہوں۔ میں اپنے جلتے ہوئے گھر کی تصویر دنیا کو دکھانا چاہتا ہوں۔کشمیر سے باہر بسنے والوں کو اس وادی گل رنگ کی تباہی و بربادی کا حال سنانے کے لیے میں نے آنسوؤں اور آہوں سے روداد قلم بند کی ہے''۔(۱۵)

خونِ دل میں ڈبو کر لکھی ہوئی گردیزی کی یہ روداد سفر آنکھیں بھی چھلکاتی ہے اور دلوں کو بھی تڑپاتی ہے۔سید سلیم گردیزی کے سفرنامے کی یہی سب سے نمایاں خوبی ہے۔سید سلیم گردیزی نے کشمیر کی سیاحت،افغانستان کے جہاد کا پس منظر اور دیگر حوالوں سے بھی متعدد تصانیف تحریر کی ہیں۔لہٰذا ان کا یہ سفرنامہ کشمیر میں اُردو ادب اور کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی حامل تصانیف کا اہم حوالہ ہے۔

وادی گل پوش میں (ڈاکٹر ظفر حسین ظفر)

''وادی گل پوش'' حال ہی میں منظر عام پر آنے والا ڈاکٹر ظفر حسین ظفر کا سفرنامہ ہے،جس میں کشمیر کی خوب صورتی، تاریخ،جغرافیہ،تہذیب وتمدن اور تحریکِ آزادی سمیت سبھی رنگ سمو دیئے گئے ہیں۔اس سفرنامے میں حسن فطرت کے رنگ بھی ہیں اور حسن انسان کے آہنگ بھی۔جذبوں کی خوش بو،بیانیے کا اسلوب،سیاست کی باتیں،ادب کی چاشنی،ماضی کا ذکر اور حال

کے مناظر بھی''۔(۱۶)

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر نے اس سفرنامے میں ماضی و حال کو یوں باہم مربوط کر دیا ہے کہ عہد موجود میں کشمیر کے تاریخی مقامات سے گزرتے ہوئے کئی ہزار سال کی تاریخ کشمیر بھی ذہنوں میں گھوم جاتی ہے:۔

''باغ میں چناروں کے دیو ہیکل درخت ہیں۔ چنار اور کشمیر لازم و ملزوم بلکہ اب مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ چنار نے کب کشمیر کے حسن کو ایک نئی جہت عطا کی؟ اس حوالے سے ایک روایت تو شاہ ہمدان سے متعلق ہے کہ وہ ایران سے یہ پودا بھی اپنے ساتھ لائے۔ مجھے اس روایت کی سند نہیں ملی۔ دوسری روایت ہے کہ چنار کا درخت مغل بادشاہ اکبر کی عطا ہے''۔(۱۷)

کشمیر کے سفرناموں میں اپنی زبان و بیان، علمی و ادبی اور تحقیقی لوازمے کے باعث یہ سفرنامہ ایک عمدہ اضافہ ہے، جس سے ''سیاحتِ کشمیر کے خواب دیکھنے والے قارئین جمّوں و سری نگر کے بارے میں بعض ایسے حقائق سے آشنا ہوں گے، جو کتابوں یا اخبارات اور رسائل میں نہیں ملتے''۔(۱۸)

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر بنیادی طور پر محقق ہیں۔ اقبالیات میں انھوں نے پی ایچ۔ ڈی کیا ہے۔ تحقیق اور تنقید کے علاوہ ''سفرنامہ نگاری'' کے میدان میں ان کی یہ کاوش سوانح ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔

رپورتاژ

سفر کے تاثرات، احساسات اور مشاہدات کو افسانوی انداز میں بیان کرنے کا طریقہ رپورتاژ ہے۔ رپورتاژ میں سفر کی نسبت اس تاثر کو بیان کرنا بنیادی طور پر اہم ہوتا ہے، جو لکھنے والا کسی منظر یا سفر سے ابھارنا چاہتا ہے۔ اپنی انھی قلبی کیفیات کے بیان، ذاتی تاثرات کے اظہار کے باعث رپورتاژ میں آپ بیتی کے عناصر واضح طور پر موجود ہوتے ہیں۔ کشمیر میں رپورتاژ کا ذخیرہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ یہ ایک مشکل صنف ہے کیوں کہ رپورتاژ اور سفرنامے میں بہت باریک فرق ہے، جس کو قائم رکھنا اور ادبی رنگ دینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ چناں چہ یہاں پر تخلیق ہونے والے سفرناموں میں سے چند ہی رپورتاژ کی منزل تک پہنچ پائے ہیں۔ یوں تو کشمیر کے پس منظر میں قراۃ العین حیدر کا رپورتاژ ''گل گشت'' سمیت کئی رپورتاژ لکھے گئے ہیں، مگر کشمیر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے رپورتاژ میں قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا''، کرشن چندر کا ''پودے'' اور ''صبح ہونے تک''، پریم ناتھی پردیسی کا ''پانچ دن''، محمود ہاشمی کا ''کشمیر اداس ہے''، کرن جیت لعل کا ''داستان ہزار دن''، مرزا یعقوب گورمانی کا ''معرکہ سرسالہ'' اہم ہیں۔

اُردو ادب میں رپورتاژ کا ذخیرہ بہت ثروت مند نہیں ہے۔ ''کرشن چندر کے رپورتاژ ''پودے'' کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اُردو کا پہلا رپورتاژ ہے''۔ (۱۹) یہ رپورتاژ ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد دکن میں منعقدہ ادیبوں کی کل ہند کانفرنس کے متعلق تاثرات اور خیالات کے اظہار پر مشتمل ہے۔ اس اہم کانفرنس میں اس عہد کے چھوٹے، بڑے تقریباً تمام ادیب شریک تھے۔ اس رپورتاژ میں کرشن چندر نے اس کانفرنس میں شریک ادیبوں کا تعارف اپنے سفر کی تفصیلات اور دوسرے امور کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اپنے عہد میں اس طرح سے کسی پروگرام، کانفرنس یا صورت حال کا بیان ایک نئی چیز تھی۔ اس لیے اسے ایک اہم تجربہ اور پہلا رپورتاژ سمجھا گیا اور اسی طرز پر رپورتاژ لکھے جانے لگے۔ ممتاز شیریں ''پودے'' کے حوالے سے بھرپور تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:۔

> ''کرشن چندر نے حقیقت کو سٹنٹ فلم میں تبدیل کر دیا ہے۔ کرشن چندر ادیبوں کا تعارف یوں کراتے ہیں کہ فلاں کی مسکراہٹ میں چاندنی ہے، کنول ہیں، فلاں کی مسکراہٹ میں دوشیزگی ہے۔ فلاں سرمئی کبوتر ہے اور فلاں مجسم تناہوا مکّا...... کانفرنس کا نقش اس میں کہیں کھینچا ہی نہیں۔ چوتھائی کراؤن سائز کے بائیس صفحات کے رپورتاژ میں آدھے سے زیادہ صفحات محض سفر اور واپسی کی روداد اور چند دوسری غیر ضروری تفصیلات ہیں۔ کانفرنس کے لیے صرف تین چار صفحے ہی کافی سمجھے گئے''۔ (۲۰)

کرشن چندر کے کشمیر سے اپنے بھرپور تعلق کی بنا پر ان کی تصانیف ہمارے مطالعے اور جائزے کا حصہ ہیں۔ اسی طرح

کشمیری ادب کی تاریخ میں قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' بھی اہم رپورتاژ ہے، جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے حوالے سے ایک اہم تحریر ہے۔لیکن تفصیلی مطالعے کے لیے محمود ہاشمی کے رپورتاژ ''کشمیر اداس ہے'' اور کرن جیت لعل کے ''داستان ہزار دن'' کو منتخب کیا گیا ہے۔

کشمیر اداس ہے (محمود ہاشمی)

محمود ہاشمی کا رپورتاژ ''کشمیر اداس ہے'' اپنے خوب صورت اور پُر تاثیر بیانیے، تاریخی اور دستاویزی لوازمے اور سچائی اور حقیقت کے خوب صورت بیان اور عمدہ اسلوب کے باعث اُردو کا بہترین رپورتاژ ہے۔''کشمیر اداس ہے'' تاریخ کشمیر کے ایک ہنگامی دور کے چند ایّام کی ایک ایسی داستان ہے، جس میں کشمیر کی تاریخ کی جھلکیاں بھی ہیں، آزادی کی تمنا، غلامی کے دکھ، سیاست دانوں کی شاطرانہ چالیں اور عوام کی بے بسی، مجبوریاں اور خاموشی سے دکھ سہنے کے المیے، سب ہی کچھ در آیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو رہے تھے، کشمیری غلامی کے ایک اور نہ ختم ہونے والے سلسلے میں دھکیلے جا رہے تھے۔اس المیے کا ذمہ دار کون ہے۔اس جُرم کے اصل مجرم اور اس کھیل کے ظاہر اور چھپے ہوئے کھلاڑی کون تھے، اس طرح کے سبھی تاریخی عوامل ''کشمیر اداس ہے'' میں موجود ہیں، مگر دستاویزی رپورٹ اور تاریخ بیان کی صورت میں نہیں۔ کرداروں، چھوٹے چھوٹے واقعات، عمدہ مکالموں اور شستہ اسلوب بیان میں ہاشمی گرفت میں لائے ہیں۔اس رپورتاژ کے ذریعے کشمیر کی تاریخ کے نازک لمحوں کا بیان، مستند تفاصیل، اہم شواہد اور حقائق کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔

> ''کشمیر اداس ہے'' داخلی اور خارجی رپورتاژ کا بڑا حسین امتزاج ہے۔اس میں یہ دونوں عناصر بڑی خوبی سے ملے ہوئے ہیں۔مصنف کے خیالات، محسوسات اور تاثرات کے بیان میں واقعات کی اہمیت کو کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ محض ذاتی تاثرات اور محسوسات کا اکتا دینے والا بیان نہیں۔''کشمیر اداس ہے'' میں اس وقت کے کشمیر کا موڈ کھنچ آیا ہے......اُردو میں جتنے رپورتاژ لکھے گئے ہیں اس کے پیش نظر یہ کہنا کہ ''کشمیر اداس ہے'' اُردو کا بہترین رپورتاژ ہے، اس کے لیے کوئی اعزاز نہیں۔''کشمیر اداس ہے'' کا مقام اُردو کی چند بہت اچھی تخلیقی تحریروں کے ساتھ ہے''۔(۲۱)

محمود ہاشمی افسانے، ڈرامے، رپورتاژ اور تنقید کے علاوہ صحافت کے میدان میں بھی برسر پیکار رہے ہیں۔ان کے افسانے ''اور شہنائیاں بجتی رہیں'' (مطبوعہ ساقی دہلی) کو اس سال کے بہترین افسانوں میں شمار کیا گیا (کشمیر اداد ہے، ص ۲۶۹)۔ڈرامہ ''انارکلی کی واپسی'' پاکستان، ہندوستان اور کشمیر کے متعدد شہروں میں سٹیج کیا گیا اور ان کی ادارت میں چھپنے والا ''مشرق'' یورپ میں اُردو صحافت کا نہ صرف آغاز کرنے والا بلکہ نئی روایات قائم کرنے والا اخبار ہے۔

''کشمیر اداس ہے'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں چھپا، جب کہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۶ء میں۔ دوسرے ایڈیشن میں مصنف نے ''کشمیر اداس ہے'' اور کشمیر سے متعلق اپنی یادداشتوں کو قلم بند کیا ہے، جو خاصے کی چیز ہے اور اُن کی آپ بیتی کا خوب صورت حصہ ہے۔ ان یادداشتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر محمود ہاشمی اپنی باقی یادداشتوں کو بھی قلم بند کریں تو اُردو زبان کو ''شہاب نامہ'' یا ''تمنا بے تاب'' جیسی ایک اور آپ بیتی مل سکتی ہے، جو تاریخ کشمیر کے ساتھ ساتھ سیاسیات کشمیر اور علم و ادب کے حوالے سے کئی دفینوں کو منظر عام پر لانے کا سبب بنے گی یا کم از ''میری یادوں کے چنار'' ایسا کوئی ناول پیش کرنے کی بہترین استطاعت محمود ہاشمی میں ہے۔ بہر حال ''کشمیر اداس ہے'' اُردو کا ایک بہترین رپورتاژ ہے، جسے کشمیر کے سوانح اور دستاویزی ادب کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا رہے گا۔ ''کشمیر اداس ہے'' ان چار ابواب پر مشتمل ہے: ''چناروں کی آگ''، ''پیر پنجال کے قیدی''، ''نفرت کے درمیان'' اور ''اک شہر تھا عالم میں انتخاب''۔ ''چناروں کی آگ'' سے ایک اقتباس برائے ملاحظہ پیش ہے:۔

> ''اڑھائی لاکھ شہریوں سے دور جھیل ڈل کے کنارے اپنے عظیم الشان محل میں مہاراجہ ہری سنگھ اداس بیٹھا تھا۔ اگر چہ اس شام اس نے نذر دربار رچایا تھا اور اس دوران اپنے آپ کو پورے طور یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ اب بھی اپنی پرجا کا معبود ہے۔ اب بھی اس کی پرجا اس کی غلام ہے۔ وہ اسے اپنے سامنے جھکا سکتا ہے۔ اس سے اپنی پوجا کروا سکتا ہے۔ باغی عبداللہ اب اس کا بن چکا ہے۔ عبداللہ (شیخ) کی نیشنل کانفرنس اب ''عہد نامہ امرتسر توڑ دو۔ کشمیر چھوڑ دو'' کے نعرے بلند نہیں کر رہی اور ''آزاد کشمیر زندہ باد'' کہتے ہوئے کشمیر کے دارالحکومت سری نگر کی طرف آنے والوں کو حملہ آور کہنے لگی ہے لیکن پھر بھی اسے اطمینان میسر نہ آ سکا''۔ (۲۲)

داستان ہزار دن (چرن جیت لعل سہگل)

چرن جیت لعل سہگل ۲۲ر اپریل ۱۹۲۶ء کو مظفر آباد کے قصبے شاہدرہ میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم مظفر آباد میں حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ مظفر آباد ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ تقسیم کے بعد وہ فسادات کی وجہ سے ۱۹۵۱ء تک مظفر آباد میں ہی تھے۔ آپ بیتی کی طرز پر لکھی ہوئی یہ ہزار دنوں کی داستان سہگل کے ان احساسات، جذبات اور واقعات کا اظہار یہ ہے، جو اس عرصہ کے دوران انھیں پیش آئے۔ چرن جیت کوئی بڑے ادیب نہیں ہیں لہٰذا ان کے اس رپورتاژ میں زیادہ تر خارجی واقعات کا خشک بیان ہے۔ بقول بلراج پوری: ''نظاروں میں حسن دیکھنے کی توفیق ہو، حساس دل ہو اور بیان میں خلوص ہو تو تصویر میں رنگ بھرنے کی ضرورت کیا؟'' (۲۳)

فسادات کے اس دور میں سہگل نے زندگی اور موت کی آنکھ مچولی کو قریب سے دیکھا۔ گرتے پڑتے لاشے، گھروں میں

پناہ ڈھونڈتے انسان، تشدد اور نفرت مگر اس سب میں انسانی عظمت سے بھرے کرداروں کا سامنا بھی کیا۔ اُسے محبت، اعتماد اور دوسروں کے لیے قربانی دینے والے بھی ملے:۔

''اُسے ایک ایسی عورت بھی ملی، جس نے اُسے کئی ماؤں کا پیار دیا، اسے ایک باپ مل گیا، جس نے اپنے سگے بیٹے کی قربانی دے کر اس کی جان بچائی۔ اُس نے جواں حسن کا ایسا جلوہ دیکھا، جس نے اس میں جوانی کی روح بیدار کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک پریم نگری بس گئی، جس میں اس کا کوئی دشمن نہ تھا''۔(۲۴)

کرن جیت نے پوری سچائی کے ساتھ ''داستان ہزار دن'' میں ان ایام کے دوران ان پر بیتنے والے واقعات کو بیان کیا ہے۔ جہاں اگر چہ کئی طرح کی مشکلات تھیں، مگر انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اک عرصہ انھیں پناہ میں رکھا گیا اور بسلامت اُن کی خواہش کے مطابق اُن کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے پاس مقبوضہ کشمیر پہنچانے کا اہتمام کیا گیا۔ مقبوضہ کشمیر پہنچنے کے بعد وہ سماجی خدمت کے کاموں میں مصروف رہے اور اعلیٰ عہدوں پر ملازمت کے بعد ریٹائر ہوئے۔ جب اپنا یہ رپورتاژ تحریر کرتے ہیں تو اس کے اختتام پر لکھتے ہیں:۔

''اب میں آزاد ہندوستان کا ایک آزاد شہری ہوں۔ کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ کسی قسم کا خوف اور پریشانی نہیں...... یہ سب ہونے کے باوجود جو امتیاز مجھے اپنے گاؤں شاہدرہ، اپنے سکول مظفر آباد میں حاصل تھا، وہ یہاں نہیں تھا۔ میں ایک ہندو تھا اور سارے گاؤں والے میری دیکھ بھال کرتے تھے۔ موت ہر وقت سامنے دکھائی دیتی تھی لیکن پھر بھی مجھے کسی نے نفرت یا حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا''۔(۲۵)

''داستان ہزار دن'' اگر چہ اپنے اسلوب بیان میں کسی انفرادیت کا حامل رپورتاژ نہ ہے مگر اس کی خاص بات یہ ہے کہ سہگل نے مستقبل کے محققین کے لیے ایسے حقائق یکجا کیے ہیں، جو انسانی اعمال، نفسیات، سماجیات اور تاریخ کے لیے کئی حوالوں سے اہم ہوں گے اور یہ ٹھوس شواہد ایک عینی شاہد کے تجربات ہیں جن کو اس نے معصومیت اور سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہی اس کا حسن ہے۔

خاکہ

خاکہ اُردو ادب کی ایک مستند صنف ہے، جس میں کسی شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کیا جاتا ہے۔ خاکے میں کسی شخصیت کے مزاج، اس کی شخصیت، انداز فکر اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اختصار اور جامعیت سے بیان کیا جاتا ہے۔ خاکے میں شخصیت کے تفصیلی حالات بیان کرنا پیشِ نظر نہیں ہوتا بلکہ مختصر تذکرے میں شخصیت کے کسی خاص پہلو کو سامنے لایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی خاکے کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''خاکہ کا انداز قدرے غیر رسمی ہوتا ہے۔ خاکہ نویسی کا بے ساختہ اور شگفتہ قلم نکتہ افرینیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ شخصیت کی ہلکی ہلکی چٹکیاں بھی لیتا ہے، مگر بڑے سلیقہ کے ساتھ''۔(۲۶)

خاکہ نگاری، سوانح کی ایک قسم ہے، مگر فنی اعتبار سے کئی حوالوں سے مختلف ہے۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ اس میں سوانح نگاری کی طرح کوئی متعین اصول اور ضابطہ نہیں ہوتا، اس کا انداز غیر رسمی اور شخصی ہوتا ہے۔ سوانح کی نسبت اس میں اختصار سے شخصیت کے چند پہلو اجاگر کیے جاتے ہیں۔ اس میں زندگی کے سفر کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

اُردو ادب کے کئی بڑے ادیبوں نے خاکہ نگاری کی صنف میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ دوسروں کے خاکوں کے ساتھ ساتھ بہت سے ادیبوں نے اپنا خاکہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس طرح خاکہ آپ بیتی کے نقوش رکھنے والی ایک اہم صنف ہے۔ کشمیر میں چراغ حسن حسرت کی ''مردم دیدہ''، شورش کاشمیری کی ''چہرے'' اور محمد کبیر خان کی ''چاند چہرے''، ہمہ یاراں دشت'' اور ''پہاڑ لوگ''، جیسی تصانیف موجود ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کا ''ماں جی'' بھی اس حوالے سے اہم ہے۔

محمد کبیر خان کی ''چہرے'' اور دوسری تصانیف

محمد کبیر خان کا تعلق راولاکوٹ سے ہے۔ ان کی تصانیف میں ''ہمہ یاراں دشت'' (خاکہ)، ''چاند چہرے'' (خاکہ)، ''پہاڑ لوگ'' (خاکے)، سفر مفر (سفر نامہ)، ''سفرِ بے مہار (سفرنامہ)، ''اک ذرا افغانستان تک'' (سفرنامہ)، ''کشمیر کا تاریک جغرافیہ''، ''وزٹنگ فادر (ناول)، ''تمھارے رستے میں روشنی ہو''، ''منہ شگافیاں'' (مجموعہ مضامین) وغیرہ شامل ہیں۔

محمد کبیر خان بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں۔ مزاح چوں کہ خاکے کا ایک اہم لازمہ ہے۔ اس لیے خاکہ نگاری میں محمد کبیر خان کے جوہر سب سے زیادہ کھلتے ہیں۔ اُن کی دوسری اصناف جیسے سفر نامہ، تاریخ اور ناول وغیرہ میں بھی بنیادی طور پر خاکہ اور مزاح ہی کا چلن ہے۔ کشمیری ادب میں خاکہ نگاری اور مزاح کے حوالے سے وہ اہم ترین مصنف ہیں، اُن کی تصانیف اس حوالے سے اُردو ادب کے بڑے مزاح نگاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ اُردو کے ممتاز ادیبوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ''ہمہ یاراں دشت'' کے بلیپ میں لکھتے ہیں:۔

''مزاح کی جس مہذب چاشنی کا تجربہ ان (کبیر خان) کی تحریروں کے مطالعے سے حاصل ہوا وہ دورِ رواں کے گنتی کے چار پانچ مزاح نویسوں کے سوا شاذ ہی کہیں ہو سکے گی۔(۲۷)

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:۔

''ہمہ یاراں دشت تذکرہ احباب بھی ہے، آپ بیتی بھی اور سفر نامہ بھی۔ گویا کتاب کو تھری ان ون سمجھنا چاہیے، لیکن محمد کبیر خان کا اسلوب ان تینوں رنگوں کو یک رنگ کر دیتا ہے''۔(۲۸)

محمد کبیر خان کی دوسری کتابوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اُن کی ''چاند چہرے''، ''پہاڑ لوگ'' اور ''ہمہ یاراں دشت'' کے حوالے سے اُن کی خاکہ نگاری میں آپ بیتی کے نقوش کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔ محمد کبیر خان کی کتاب ''چاند چہرے'' میں تیس خاکے شامل ہیں، جب کہ ''ہمہ یاراں دشت'' میں سفر نامے اور حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ متعدد شخصیات کے خاکے بھی موجود ہیں۔ عطاالحق قاسمی ''ھمہ یاراں دشت'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''یہ کتاب بنیادی طور پر شخصی خاکوں کی کتاب ہے۔ چناں چہ ان سفر ناموں، ڈیروں اور فوجی بیرکوں میں جو کردار ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ کبیر خان نے ان کرداروں کو جس طرح ''پینٹ'' کیا ہے وہ کوئی بڑا تخلیق کار ہی کر سکتا ہے''۔(۲۹)

کتاب کے اکثر خاکے، مضامین اور سفر کی کہانی میں آپ بیتی کی طرز اختیار کی گئی ہے، جو مصنف کی آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ محمد کبیر خان کی ''چاند چہرے'' اور ''پہاڑ لوگ'' خالصتاً خاکوں پر مشتمل تصانیف ہیں۔ ''پہاڑ لوگ'' میں تاریخ کشمیر کی بڑی شخصیات (جن کا تعلق پونچھ سے ہے) کے خاکے ہیں۔ جب کہ ''چاند چہرے'' میں مصنف کی محبوب ہستیاں شامل ہیں۔ ''پہاڑ لوگ'' اور ''چاند چہرے'' میں یوں تو سبھی خاکوں میں محمد کبیر خان موجود ہیں مگر ''چاند چہرے'' کے اس حوالے سے دو خاکے زیادہ اہم ہیں۔ ''برعکس نہند نام'' کے عنوان سے کبیر خان نے اپنا خاکہ تحریر کیا ہے، جو نہایت عمدہ اور بھرپور خاکہ ہے۔ اپنی ذات کے حوالے سے بھی تیرونشتر داغنے میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس خاکے کا اختتام ان سطور پر ہوتا ہے:۔

''وہ غربا میں سے ہے۔ اس لیے سرکاری شرفا اس سے مل کر خوش نہیں ہوتے۔ وہ غربا میں سے ہے اسی لیے غیر سرکاری شرفا سے مل کو خوش ہوتا ہے۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے اسے خوش کرنا ایفورڈ کر سکتے ہیں۔ اگر ہاں تو اپنی ماں کے چاند محمد کبیر خان سے مل

لیجیے کہ ع ملتے ہیں کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ''۔(۳۰)

اپنی ماں کا خاکہ ''نکی بے جی'' کے نام سے ''چاند چہرے'' کا پہلا خاکہ ہے۔اس خاکے کے حوالے سے امجد اسلام امجد لکھتے ہیں:۔

''اس کتاب میں جو خاکے ہیں ان میں سے بہترین محمد کبیر خان کا اپنی والدہ کا خاکہ ہے، جو اتنا مکمل ،مؤثر اور جان دار ہے کہ اسے قدرت اللہ شہاب کے''ماں جی'' کے برابر بڑے اعتماد سے رکھا جاسکتا ہے۔یہ ایک ایسی سادہ، بھرپور اور زندہ تحریر ہے کہ اسے کسی قسم کی فنی پختہ کاری اور چابک دستی کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہر جملہ اور ہر سطر ایک مضبوط اور جان دار لکیر کی طرح گویا کینوس پر نقش ہوتی چلی جاتی ہے اور ہم محمد کبیر کی آنکھوں سے اس کی والدہ کو چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے دیکھنے لگتے ہیں''۔(۳۱)

''نکی بے جی'' کی آخری سطریں اس طرح ہیں:۔

''امی کے سر میں اکثر درد رہتا ہے۔ایک دن مالش کرتے اور دباتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ان کے سر میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گھومڑ سے ہیں۔پوچھا تو ٹال گئیں۔ زیادہ اصرار کیا تو کہنے لگیں بیٹا جب تک جان تھی کبھی پروانہیں کی۔اب جان ہاری تو بندوق بھاری۔یہ کانٹے ہیں جو بالن کاٹ لانے میں کبھی سر میں کھب کر ٹوٹ گئے تھے۔ میری کوشش ہے کہ جتنے خار ماں کے سر میں ہیں اتنے گلزار ان کے قدموں میں کھلا دوں مگر (الحمدللہ کسی حد تک آسودہ حال ہونے کے باوجود) نکی بے جی کو ابھی تک چھٹی نہیں ملی۔وہ بے خوابی میں مبتلا ہیں۔رات رات بھر میرے لیے جاگتی رہتی ہیں:۔

ایک مدّت سے میری ماں نہیں سوئی تابش

میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے'' (۳۲)

خطوط

خطوط نویسی ادب کی ایک قدیم صنف ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں خطوط موجود ہیں۔ یہ آپ بیتی کی ایک قسم اور سوانحی ادب میں اہم مقام کے حامل ہیں۔ کسی فرد کی سوانح عمری کی ترتیب و تالیف میں خطوط ایک مستند اور معتبر مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خطوط سے لکھنے والے کی سیرت کے کئی چھپے ہوئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مطابق خطوط کی حیثیت آپ بیتی کی سی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''خطوط، ایک صنف نثر کی حیثیت سے کئی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی مکتوب نگار کے خطوط، اس کے میلانات، رجحانات، پسند و ناپسند، عادات و اخلاق، جذباتی اور نفسیاتی کیفیتوں، ذہنی و قلبی احساسات اور اس کی شخصیت کی مختلف سطحوں کو سامنے لاتے ہیں''۔(۳۳)

اُردو کے نثری ادب میں خطوط نویسی بالکل آغاز سے موجود ہے، مرزا غالب کے خُطوط اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ غالب سے مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد سے علامہ اقبال تک اور عہد جدید کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے خطوط اُردو نثر کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

کشمیر کے اُردو ادب میں یہ روایت بھی قدیم ہے، مگر باضابطہ مکاتیب کو کتابی صورت میں مرتب کرنے کی روایت زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ اس حوالے سے تنہا انصاری اور سید بشیر حسین جعفری کی خطوط نگاری کا مختصر مطالعہ پیش ہے۔

تنہا انصاری کے خطوط کا مجموعہ ''خاطر احباب''

تنہا انصاری اُردو، کشمیری کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ علمی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر آپ نے متعدد مضامین لکھے جو کشمیر کے بڑے بڑے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ جان محمد آزاد تنہا انصاری کی مکتوب نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''تنہا انصاری نے جتنے خطوط لکھے ہیں، شاید ہی کشمیر کے کسی اور مفکر یا ادیب نے لکھے ہوں۔ آپ کے خطوط مکتوب نگاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان میں ذاتی تعلق کا لمس بھی ہے اور جذبات کی حرارت بھی۔ ان میں ان گنت مسائل پر بے لاگ انتقاد ہے، جس کی بنیاد تحقیق اور تفکر پر ہے۔ ان خطوط میں آپ نے جو تمدنی مباحث ابھارے ہیں وہ ان کی تازگی پر اب بھی کہنگی کا سایہ نہیں''۔(۳۴)

آپ کے خطوط علمی مباحث سے بھرے ہیں۔ حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی کرتے ہیں اور آپ بیتی کے رنگ بھی لیے ہوئے ہیں۔ اپنا تعارف کرواتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

''ہری سنگھ کے دور کی پیداوار ہوں۔مطلب یہ کہ شخصی راج میں بحیثیت استاد ملازم ہو گیا۔کوالیفکیشن کچھ زیادہ نہیں،بس یوں سمجھ لیجیے بی اے، بی ٹی، منشی فاضل، ادیب فاضل، جے وی، بی ای سی۔ریاست کا بہترین استاد ہونے کی بنا پر راشٹر پتی کے ہاتھوں ۱۹۶۰ء میں نیشنل ایوارڈ بھی دگیان بھون نئی دہلی میں حاصل کیا۔تقریباً سات سال سے ٹیچرز ٹریننگ سکول سوپور میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہوں۔ریاست کی ٹیکسٹ بک ایڈوائزری بورڈ کا ممبر بھی ہوں''۔

شگفتہ بیانی کا یہی انداز ان کے سبھی خطوط میں ہے۔شمیم احمد شمیم کو لکھتے ہیں:۔

''میں خوش تھا کہ آپ کھلے عام ایک معرکے میں پٹ گئے۔آپ معرکے کے آدمی تو ضرور ہیں۔اپنی زبان اور قلم کا لوہا ہر دوست اور دشمن سے منوا چکے ہیں،لیکن حکما کا قول ہے کہ تجربہ سب سے بڑا استاد ہے''۔

آپ کے خطوط کا مجموعہ ''خاطر احباب'' کے علاوہ کشمیری مجموعہ کلام ''فرات'' اور اُردو ''شبنمستان'' شائع ہوئے ہیں۔ آپ کے خطوط ان کی آپ بیتی کا ایک اہم حصہ ہیں۔

بشیر حسین جعفری کی خطوط نویسی

سید بشیر حسین جعفری نصف صدی سے تاریخ وصحافت کے میدان میں سرگرم ہیں۔اُن کی ضخیم آپ بیتی ''زندہ باد''،''پائندہ باد'' اور ''تابندہ باد'' کے ناموں سے تین جلدوں میں ہے۔آپ بیتی کے علاوہ سفرنامے، ڈائری، خطوط اور دوسری اصناف کے ساتھ ذاتی طور پر ایک تاریخی دستاویزات پر مبنی آرکائیو بھی تیار کر رکھا ہے۔وہ کثیر الاحباب شخصیت ہیں۔وہ اپنے ہر پہچان والے کے خطوط کا جواب دیتے ہیں اور پوری یک سوئی، چاہت اور محبت سے دیتے ہیں۔پروفیسر عبدالصبور کے مطابق:۔

''آپ کی مراسلت کا سفر سید سلیمان ندوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی، شورش کاشمیری، سید ابوالحسن ندوی، پروفیسر وقار عظیم، م ش، الطاف حسین قریشی، حکیم یوسف حسن، قدرت شہاب، ایم ایم عالم، افتخار عارف، عطاالحق قاسمی سے ہوڈاکٹر صغیر، ڈاکٹر ظفر حسین ظفر، ذوالفقار احمد ساحر، پروفیسر عبدالصبور شیدائی اور سید شبیر حسین شاہ تک پھیلا ہوا ہے''۔(۳۵)

اپنی آپ بیتی ''زندہ باد'' میں سید بشیر حسین جعفری نے سینکڑوں افراد کے نام لکھے ہیں، جن سے ان کی مراسلت رہی ہے یا اب بھی ہے۔بشیر حسین جعفری کے مطابق بارہ سو اہم شخصیات کے خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں۔خطوط کا یہ سلسلہ اس قدر دراز ہے کہ بشیر حسین جعفری نے زندہ شخصیات سے بڑھ کر اپنی مرحومہ والدہ محترمہ کے لیے بھی جنت کے پتے پر بھی خطوط لکھے

ہیں۔ بریگیڈیئر سید اختر حسین کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''برف باری مجھے بہت اچھی لگتی ہے، جب موٹی اور تیز برف باری ہو تو روئی کی دھنائی کا منظر ہوتا ہے اور میں پوری طرح کھو جاتا ہوں۔ میں اپنے بچپن میں راتوں کو جاگ جاگ کر جن منازل پر پہنچنے اور جن مناظر کو دیکھنے کا خواہاں ہوتا تھا ان سے برف باری بھی ایک ہے''۔(۳۶)

بشیر جعفری کی آپ بیتی کے علاوہ ان کے سفر نامے، روناچے اور مراسلت بھی آپ بیتی ہی کے ابواب ہیں۔

دیگر غیر افسانوی تصانیف

کشمیر میں تخلیق اور تالیف ہونے والے غیر افسانوی ادب میں ایسی بہت سی تصانیف ہیں، جو کسی خاص صنف میں شمار نہیں کی جاسکتی۔ان کی اہمیت موضوع کے اعتبار سے البتہ مسلم ہے۔ان میں زیادہ تر تاریخی کتب میں جو بعض سیاسی شخصیات اور صحافیوں اور ادیبوں کی تصنیف کردہ ہیں، جو کشمیر کی تاریخی حالات اور تحریکِ آزادی کشمیر کے پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ایسی تصانیف کی یوں تو بہت زیادہ تعداد ہے، مگر یہاں صرف ان کتب کا تذکرہ مقصود ہے، جس میں تاریخ یا حالات واقعات کے بیان میں مصنفین نے ذات اور ذاتی حالات کو بھی شامل کیا ہے۔ چناں چہ آپ بیتی کی حامل ان کتب میں پریم ناتھ بزاز کی ''تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر''، سردار عبدالقیوم کی تصانیف ''کشمیر بنے گا پاکستان''، ''مقدمہ کشمیر'' حبیب کیفوی کی ''میں اور میرا کشمیر''، غلام احمد پنڈت کی ''اوراق پارینہ''، ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر''، سردار مختار خان کی ''آزادی کا خوابِ پریشاں''، ''پاک کشمیر'' از خواجہ عبدالصمد، ''کشمیر کی جنگ آزادی'' از سردار ابراہیم خان، ''تاریخ حریت کشمیر'' از ڈاکٹر سلام الدین نیاز، ''کشمیر نوائے حریت'' از سید علی گیلانی، ''یادوں کی کہکشاں'' از ثریا خورشید، ''رودادِ زنداں'' از محمد سعید بخاری، ''آزادی کی تلاش میں'' از فاروق رحمانی، ''جانباز کی میراث'' از محمد سعید بخاری، ''تاریخِ جموں وکشمیر'' از غازی محمد امیر، ''آتش چنار'' از جی ایم لون، ''اب منزل دور نہیں'' از میر عبدالقیوم، ''سوئے دار چلے'' از اشرف قریشی، ''قول فیصل'' از عبدالخالق انصاری، ''جموں کہ اک شہر تھا'' از رحمت اللہ، پونچھ کی سیاسی تاریخ کے اوراق پارینہ از بدرناتھ پوری وغیرہ شامل ہیں۔

خواجہ غلام احمد پنڈت کی تصانیف

خواجہ غلام احمد پنڈت ۱۹۲۲ء میں مظفر آباد میں پیدا ہوئے۔انھوں نے عملی زندگی کا آغاز پرائمری مدرس کی حیثیت سے کیا، پھر سول سروس میں آ گئے۔ بانی پاکستان کے سٹاف میں شامل رہے۔ چودھری غلام عباس کے ساتھ بھی کام کیا۔آزاد کشمیر کے پہلے پبلسٹی آفیسر، مختلف محکموں میں سیکرٹری حکومت، آزاد کشمیر یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، ایوان صنعت وتجارت اور کشمیر کلچرل اکیڈمی کے چیئر مین رہے۔ یوں انھوں نے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری۔ وہ کشمیر کے ممتاز اہل قلم شمار ہوتے ہیں۔اُن کی دو کتب اپنے بیانیے اور لوازمے کے اعتبار سے آپ بیتی کے نقوش کی حامل تصانیف ہیں۔''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' اور ''اوراق پارینہ''۔''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' کا انداز، ابواب بندی اور اسلوب بیان اُسے ایک آپ بیتی کے بہت قریب لے جاتے ہیں، مگر خواجہ غلام احمد پنڈت کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:۔

> ''باب کا آغاز اپنی ذات سے کرنے پہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مجھے اپنے سوانحی کوائف کا بیان مقصود ہے، مگر چوں کہ یہ کتاب میری ذاتی یادداشتوں پر منحصر ہے لہٰذا فنی لحاظ سے صیغہ متکلم میں بات کیے بغیر اس کا کوئی سٹائل بن نہیں آیا اور اسے بھی محض علامت کے

طور پر اختیار کیا گیا ہے۔اس طرح سے بالواسطہ طور پر تحریک حریت ماقبل تقسیم ہند کے سیاسی، معاشی اور سماجی لیل ونہار کی چشم دید جھلکیاں پیش کی گئی ہیں''۔ (۳۷)

کتاب کے نام کے ساتھ قوسین میں ''یادوں کے چراغ'' بھی لکھا ہے، جو کتاب کا اصل نام لگتا ہے۔ بہر کیف خواجہ غلام احمد پنڈت نے اس تصنیف میں تقسیم سے قبل کشمیر کے سیاسی، سماجی حالات، تحریکِ آزادی کشمیر، آزاد کشمیر کی سیاسی اور عملی صورت حال کے ساتھ اپنی زندگی کو بھی تفصیل سے بیان کیا۔ جس میں مصنف کی مکمل آپ بیتی موجود ہے۔ لہٰذا کشمیر میں آپ بیتی کے عناصر اور نقوش کی حامل اہم تصنیف ہے۔ مصنف عمدہ اسلوب نگارش کے حامل ہیں۔ کتاب میں موجود لوازمہ بھی کئی حوالوں سے اہم ہے۔

سردار عبدالقیوم خان کی تصانیف

سردار محمد عبدالقیوم خان آزاد کشمیر صدر اور وزیرِ اعظم رہے ہیں۔ آزاد کشمیر کے سیاسی رہنماؤں میں اپنے وسیع مطالعے اور علمی وادبی ذوق کے حوالے سے معروف ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آئی ہیں، جن میں سے ''کشمیر بنے گا پاکستان''، ''مقدمہ کشمیر''، ''نظریاتی کشمکش'' اور ''مذاکرات سے مارشل لا تک'' میں آپ بیتی کے عناصر موجود ہیں۔

سردار عبدالقیوم خان ایک اچھے مقرر اور صاحب مطالعہ شخصیت ہونے کے باوجود حیرت ناک بات یہ ہے کہ ان کی تصانیف کا کوئی ادبی اسلوب بیان ہے اور نہ ہی مربوط بیانیہ۔ خیالات کی بے ترتیبی اور مضامین کا انتشار ہر ایک تصنیف میں واضح ہے۔ اسی انتشار کے باعث مصنف کا اسلوب کسی مربوط بیانیے میں نہیں ڈھل پاتا۔ مصنف کے خیالات مختلف قالبوں اور شکلوں میں ہونے کے باعث اکثر اوقات متضاد نظر آتے ہیں۔ مصنف کا خیال کسی جامع تصویر کو منضبط نہ کر سکنے کے باعث اُن کے تصورات نامکمل، غیر واضح ہوتے ہیں۔

سردار عبدالقیوم کی جن تصانیف میں سوانحی اور آپ بیتی کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کا بھی آپس میں ارتباط نہیں ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت اس بکھرے لوازمے کو اکٹھا کر کے ان کی زندگی کے کچھ حصوں کا خاکہ ترتیب دیا جا سکتا ہے اور وہ بھی زیادہ تر سیاسی زندگی کا۔ مصنف کی ذاتی زندگی، جذبات، احساسات، شخصیت کے ارتقائی مراحل، خامیوں، خوبیوں اور آپ بیتی میں شامل اس طرح کے دیگر عناصر کا سراغ نہیں ملتا۔ اکثر مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کی تحریروں یا تقریروں کو اکٹھا کر کے کسی دوسرے فرد نے انھیں غیر فطری طریقے سے باہم ملا دیا ہے اور ایک کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت رکھ کر مرتب کر دیا گیا ہے۔ بہر حال سردار عبدالقیوم خان کی بالا تصانیف میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔

آزادی کا خوابِ پریشاں (سردار مختار خان)

''آزادی کا خوابِ پریشاں'' پونچھ سے تعلق رکھنے والے تحریکِ آزادی کے رہنما، سیاسی، سماجی کارکن، قانون دان،

صحافی اور مصنف سردار مختار خان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں پاکستان کے معتبر اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہے:۔

''ان مضامین میں کسی قسم کی کانٹ چھانٹ نہیں کی گئی، جو مضمون جس طرح شائع ہوا تھا اسی طرح کتاب میں شامل کیا گیا ہے''۔(۳۸)

یوں یہ مضامین سردار مختار خان کے خود نوشت ہیں اور ان کی آپ بیتی کا اہم حصہ۔ سردار مختار خان تحریکِ آزادی کے ایک سرگرم کارکن تھے اور یہ مضامین نہ صرف ان کے جذبات اور احساسات پر محیط ہیں بلکہ ایک کردار اور گواہ کی حیثیت سے شریک کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا ان کی آپ بیتی کا اہم حصہ ہیں۔ ڈاکٹر صغیر کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:۔

''سردار مختار خان ایڈووکیٹ کشمیر کی جدوجہد آزادی کے تمام کرداروں سے شناسا و آگاہ بھی ہیں اور ان کی کہانی کا حصہ بھی۔ پونچھ کی تاریخ ساز دھرتی سے متعلق وہ ایسے تاریخ نگار بھی ہیں، جو تماشا بھی ہیں اور تماشائی بھی۔ جو عمل کی وادی سے گزرے ہیں اور قلم کی دولت سے بھی بہرہ مند ہوئے''۔(۳۹)

یوں ''آزادی کا خوابِ پریشاں'' کشمیر میں آپ بیتی کی روایت کی اہم کڑی ہے۔ یہ تصنیف اگرچہ مکمل آپ بیتی نہ ہے۔ اس کے مضامین ایک عہد کے کشمیر کے حالات کی تصویر کشی کرنے والے ہیں۔ اس طرح یہ ایک اہم تاریخی دستاویز ہے، مگر چوں کہ مصنف ان حالات اور واقعات میں شریک کار رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا اسلوب اور بیانیہ اسے آپ بیتی سے ملاتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

''۱۸/اپریل ۱۹۴۷ء کو راولاکوٹ میں نمازِ جمعہ کے بعد معلوم ہوا کہ مہاراجہ ہری سنگھ راولاکوٹ کے دورے پر آنے والے ہیں اور وہ اپنی فوجی چوکیوں کا معائنہ کرنے کی غرض سے پونچھ کا دورہ کریں گے۔ ردِّعمل کے طور پر کارکنان کی ایک مختصر میٹنگ ہوئی اور طے پایا کہ کل یعنی ۱۹/اپریل کو راولاکوٹ کی اس عمارت پر جھنڈا لہرایا جائے، جو مسلم کانفرنس کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتی تھی''۔(۴۰)

''ہمیں پولیس نے گرفتار کر کے ڈوگرہ فوج کے حوالے کر دیا۔ تحصیل سدھنوتی اور تحصیل باغ کا نظم و نسق ڈوگرہ فوج کو دے دیا گیا اور یہ دو تحصیلیں خون میں نہانے لگیں۔ گھر گھر تلاشی لے کر توڑے دار بندوقیں، چاقو، چھریاں، کلہاڑیاں غرض جو بھی تیز دھار آلہ ملا قبضے میں لے لیا گیا''۔(۴۱)

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے حالات اور واقعات، رہنماؤں، مجاہدوں اور سیاسی شخصیات کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ''آزادی کا خواب پریشاں'' میں ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد کشمیر کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کا بھی بھرپور جائزہ موجود ہے:۔

> ''آزاد کشمیر کے عوام کی زبوں حالی کی ذمہ داری پاکستان کے اربابِ اقتدار، وزارتِ امورِ کشمیر اور پاکستان کی افسر شاہی پر ہی عائد نہیں ہوتی، ہمارے اپنوں کا بھی اس میں بڑا ہاتھ ہے۔ مہاجرین جموں و کشمیر ہمارے قومی جسم کا حصہ ہیں، مگر ان میں ایک مخصوص اور بااثر طبقہ موجود ہے، جو آزاد کشمیر میں آئینی، دستوری اور سیاسی اصلاحات کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے میں ہی آزاد کشمیر پر ہمیشہ اپنی ساکھ اور برتری قائم رکھنے کی کامیابی دیکھتا رہا''۔(۴۲)

''آزادی کا خواب پریشاں'' اپنے لوازمے، اسلوب اور اندازِ بیان کے باعث کشمیر میں سوانحی ادب کی روایت کا حصہ اور آپ بیتی کے عناصر اور نقوش کی حامل اہم تصنیف ہے۔

تاریخ جموں و کشمیر (غازی محمد امیر)

غازی محمد امیر کی تصنیف ''تاریخ جمّوں و کشمیر'' آپ بیتی اور آنکھوں دیکھا حال ہے، جس میں غازی محمد امیر کی ذاتی زندگی کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ تحریکِ آزادیٔ کشمیر، مختلف شخصیات کے سوانحی خاکے اور دیگر رنگا رنگ موضوعات پر انتخاب شامل ہے۔ غازی محمد امیر کا اسلوب بیان سادہ اور روکھا پھیکا ہے۔ ایک خشک روداد کی طرح مصنف اپنی زندگی اور اپنے عہد کے حالات اور دیگر شخصیات کے بارے میں تاثرات بیان کرتا ہے۔ کتاب کی ترتیب و تہذیب، اندازِ بیان اور نام اس کے لوازمے سے میل نہیں کھاتا۔ بارہ سو صفحات کی اس کتاب میں مصنف کو زندگی میں جس قدر افراد ملے ہیں ان کا تعارف شامل کر کے غیر ضروری طور پر ضخیم بنایا ہے۔ البتہ اس کے ابتدائی چند ابواب، جن میں مصنف کے اپنی زندگی، شخصیت اور بیتے حالات کا بیان شامل کیا ہے کسی قدر اہمیت کے حامل ہیں اور اسی بنیاد پر آپ بیتی کے عناصر کی حامل تصانیف کی صف میں شامل ہوتی ہے:۔

> ''کمپنی باغ (لیاقت باغ) میں ایک شاندار جلسہ ہوا، راقم معہ ساتھیوں وہاں موجود تھا۔ سٹیج پر صرف ایک کرسی تھی، جس پر لیاقت علی خان (وزیرِ اعظم پاکستان) بیٹھے تھے۔ لیاقت علی خان نے خطاب کرتے ہوئے صرف یہ کیا کہا کہ برادران ملت! ایک آواز آئی پھر ہوائی فائر ہوئے۔ لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھگدڑ مچ گئی''۔(۴۳)

پاک کشمیر (خواجہ عبدالصمد)

''پاک کشمیر'' خواجہ عبدالصمد کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ خواجہ عبدالصمد نے علی گڑھ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آزاد کشمیر

کے مختلف تعلیمی اداروں میں بطور لیکچرر/ پروفیسر وابستہ رہے۔''پاک کشمیر'' کے پہلے باب'' کچھ اپنے بارے میں'' اور دیگر مضامین میں انھوں نے اپنی بھر پور زندگی کو بیان کیا ہے، جس میں ابتدائی تعلیم علی گڑھ کے حالات، قائدِ اعظم سے ملاقات اپنی ملازمتوں کی داستان، مہاجرت، اپنی دلچسپیوں اور تدریس کے تجربات وغیرہ شامل ہیں۔''پاک کشمیر'' آپ بیتی نہیں ہے۔ اپنے انداز اور اطوار میں اور نہ اسلوب بیان میں، مگر اس میں مصنف کی آپ بیتی کے واضح نقوش جا بجا موجود ہیں۔ انداز بیان سادہ، خشک اور روداد نگار کا سا ہے۔ لوازمے میں البتہ بعض اہم معلومات موجود ہیں:۔

> ''امریکی سینیٹروں کے ایک وفد نے دورے کے بعد لکھا کہ آزاد کشمیر کی حکومت ایک مذاق ہے۔ سیکرٹری صاحبان کو اصطبل میں کام کرتے دیکھا۔ میر واعظ یوسف شاہ منسٹر ایجوکیشن نے شہاب صاحب کو چٹھی لکھی کہ اس کا جواب دیا جائے۔ شہاب صاحب نے جواب دیا کہ سینیٹروں کو جواب دینے سے گریز کیا جائے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمیں اصطبل کام کرنے کے لیے ملا ہے''۔ (۴۴)

محمد سعید بخاری کی ''جانباز کی میراث'' اور ''رودادِ زنداں''

''جانباز کی میراث'' آزاد کشمیر کے سابق ناظم امور دینیہ، معلّم، شاعر اور ادیب محمد سعید بخاری کی نشری تقاریر، مضامین، شاعری کا مجموعہ ہے، جس کے پہلے باب میں ''حیات سعید'' کے عنوان سے اُن کے خود نوشت سوانحی خاکہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ قبل ازیں ''رودادِ زنداں'' کے نام سے ان کی اسیری کے دنوں کی روداد بھی ۱۹۹۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ دونوں کتب بالخصوص روداد زنداں میں ان کے ایک عہد کی داستان سمٹ آئی ہے۔ یہ داستان اُن کی آپ بیتی کا ایک اہم باب ہے۔ دو سال اکیس دنوں کی یہ قید جو انھوں نے جدو جہد آزادی کی پاداش میں مختلف جیلوں میں کاٹی، کی سرگزشت ہے۔ یہ روداد اگر چہ ادبی حوالے سے اور اسلوب بیان کی کسی ندرت سے عاری ہے، مگر ایک سرگرم مجاہد، ماہر تعلیم اور دانشور شخصیت کی آپ بیتی کا حصہ ہے۔ لہٰذا اس کا مطالعہ تاریخی حوالے سے اہم ہونے کے ساتھ کشمیری ادب میں آپ بیتی کی روایت کے سلسلے میں بھی قابل مطالعہ ہے۔

افسانوی ادب میں آپ بیتی

کشمیر میں اُردو افسانوی ادب کا آغاز انیسوی صدی کے آخر میں ہوا۔ جب سالگرام سالک اور محمد دین فوق نے مختلف تاریخی واقعات اور مافوق الفطرت عناصر کو کہانی کا روپ دینے کی کوشش کی۔ سالگرام سالک کی داستانوں اور محمد دین فوق کے ناولوں میں کہانی کی صورت اور قصے کے التزام نے انھیں کشمیر میں داستانوں اور ناول کی ابتدائی صورتیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں:۔

> ''سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگرام سالک اور مولوی محمد دین فوق نے کی۔ سالگرام سالک نے ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفہ سالک'' تصنیف کر کے نثر کے اس شعبے کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتیں لیکن ان میں قصے کی مہک ہے۔ ''داستان جگت روپ'' ناول سے زیادہ ایک داستان ہے۔ اس سے بہتر کوششیں محمد دین فوق کے ہاں ملتی ہیں۔ فوق کی تصانیف سو کے لگ بھگ ہیں۔ ان کے بعض قصوں پر ناول نگاری کا اطلاق کیا جاسکتا ہے''۔ (۴۵)

محمد دین فوق بنیادی طور پر مؤرخ تھے۔ انھوں نے تاریخی، سوانحی ادب کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب میں ناول، حکایات اور ڈرامے بھی تصنیف کیے۔ ''اکبر'' اور ''انارکلی'' فوق کے تاریخی ناول ہیں جب کہ گیارہ ناول معاشرتی مسائل کے حوالے سے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی نے فوق الکشمیر میں محمد دین فوق کی شخصیت اور علمی و ادبی کارناموں کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''ابتدائی دور کے اُردو ناولوں کے ساتھ فوق کے تقابلی جائزے میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فوق کے ناول بھی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر نہ جانے کیوں ناول کے محققوں کی نظر ان پر نہیں پڑتی''۔ (۴۶)

سالگرام سالک اور محمد دین فوق کے بعض ناولوں اور داستانوں میں آپ بیتی کے عناصر موجود ہیں۔

کشمیر میں افسانوی ادب کی ترویج اور تخلیق کے حوالے کے طور پر سب سے نمایاں نام چراغ حسن حسرت کا ہے، جو ایک طرف اُردو ادب میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں، تو دوسری طرف کشمیر میں صحافت اور ادب میں کئی حوالوں سے اوّلیت اور فوقیت کے حامل ہیں۔ چراغ حسن حسرت ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی گوناں گوں صلاحیتوں کے باعث کشمیر میں اُردو شاعری، تاریخ، دینیات، ادب اور صحافت کے میدانوں میں ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ جان محمد آزاد لکھتے ہیں:۔

''چراغ حسن حسرت کی ہمہ جہت ادبی شخصیت جب اپنے فنی شباب پر تھی تو کرشن چندر جیسے ادیب ابھی اپنے ادبی سفر کے پہلے پڑاؤ پر تھے''۔(۴۷)

ڈاکٹر برج پریمی نے اپنی کتاب ''جموں وکشمیر میں اُردو ادب کی نشوونما'' میں چراغ حسن حسرت کو ریاست جموں وکشمیر میں افسانہ نویسی کی روایت کا دوسرا اہم نام بتایا ہے اور حقیقت یہ ہے محمد دین فوق کے بعد چراغ حسن حسرت کشمیر میں اُردو افسانوی ادب کو بیسویں صدی میں ترقی دینے والا دوسرا بڑا حوالہ ہے۔ چراغ حسن حسرت کے افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اپنے شگفتہ اسلوب کے باعث بے حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ ''پربت کی بیٹی''، ''مردم دیدہ''، ''عرب اور کرنل لارنس''، ''کشمیر'' اور ''جدید جغرافیہ پنجاب'' کی صورت میں ایسی عمدہ تصانیف اُردو ادب کو دیں کہ جن کے باعث وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ خوش دیو مینی کے مطابق: ''۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء تک کا دور پونچھ میں اُردو ادب کا سنہری دور کہلاتا ہے''۔(۴۸) اور اس سنہری دور کے روح رواں چراغ حسن حسرت تھے۔ چراغ حسن حسرت کے مجموعہ جات ''پربت کی بیٹی'' اور ''کیلے کا چھلکا'' میں شامل چند افسانوں میں اس عہد کی یادیں پونچھ کے ماحول، پس منظر اور کشمیر کے حالات ان کے احساسات کی صورت سامنے آتے ہیں، جو ان کے افسانوں میں آپ بیتی کے عناصر کی حامل ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی ۱۹۰۹ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصلی نام مدھوسودن تھا۔ میٹرک کے بعد نا مساعد گھریلو حالات کی وجہ سے سلسلہ تعلیم ترک کر کے گھرانے کی ذمہ داریاں سنبھالنا پڑیں اور ایک معمولی سرکاری ملازمت اختیار کی۔ شاعری اور ادب کا ذوق فطری پایا تھا، چناں چہ افسانہ نگاری کے میدان میں آپ نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے شروع کیے۔ ممتاز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور دوسرے ہم عصروں نے آپ کی افسانہ نگاری کو شاندار الفاظ میں سراہا۔ ''شام وسحر'' آپ کا پہلا افسانوی مجموعی تھا۔ دوسرا مجموعہ ''دنیا ہماری'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا، جس کے پیش لفظ میں راجندر سنگھ بیدی نے لکھا کہ ''یہ افسانے اپنی سادگی اور معصومیت میں ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں''۔(۴۹) ''بہتے چراغ'' پردیسی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے وابستگی کے دور میں ریڈیائی ڈرامے، فیچر پروگرام تحریر کیے۔ رپورتاژ ''پانچ دن'' اور نامکمل ناول ''پوتی'' بھی ان کی یادگار تصانیف ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کی کہانیوں کا مزاج کشمیری ہے، جس کے مختلف عناصر کو انھوں نے فنی چابک دستی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ کشمیر کی دھرتی کی اصل بوباس، یہاں کے عوام کی سادگی اور سچائی کی اصل تصویر اور حالات کی نقشہ کشی۔ انھوں نے کچھ اس طور کی کہ اُردو کے بڑے بڑے ادیبوں نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے مضمون ''میں اور میرے افسانے''، ''ڈھول''، ''کیچڑ''، ''بہتے چراغ''، ''نئی سڑک'' اور دوسرے افسانوں میں انھوں نے کشمیر کے رنگوں کے ساتھ اپنی زندگی کی جھلک بھی پیش کی ہے۔ چناں چہ کشمیری ادب میں آپ بیتی کے نقوش کے حوالے سے اُن کا افسانوی ادب نہایت اہم ہے۔ ''بہتے چراغ'' سے ایک اقتباس:۔

''جہلم کے دونوں کنارے بے حد حسین نظر آ رہے تھے۔ سیاحوں کی غیر معمولی آمد نے اس سال انھیں رُت سے پہلے ہی شباب اور حسن بخشا ہے۔ ہر ہاؤس بوٹ میں قمقمے ہیں......روشنیاں ہیں......خوشبوئیں ہیں اور نغمے ہیں۔ ان کے ساتھ لگے ہوئے کچن بوٹوں سے دھواں بے ترتیبی سے یوں اٹھ رہا ہے، جیسے کسی رنگیں وادی میں عیش پرستوں کے ساتھ ساتھ کوئلہ نکالنے والے مزدور آوارہ پھر رہے ہوں''۔(۵۰)

اُردو ادب میں اپنی منفرد ناول نگاری اور افسانہ نویسی کے باعث کرشن چندر کا اہم مقام ہے۔ اگر چہ کرشن چندر کشمیری نہیں تھے، مگر انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ پونچھ میں گزارا۔ کرشن چندر ۲۳ رنومبر ۱۹۱۴ءکو وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گوری شنکر ڈاکٹر تھے، جن کی تقرری بحیثیت میڈیکل آفیسر پونچھ شہر میں ہوئی۔ چناں چہ ۱۹۱۸ء سے ملازمت کے اختتام تک وہ پونچھ میں ہی قیام پذیر رہے۔ یوں کرشن چندر نے اپنی ابتدائی تعلیم پونچھ سے حاصل کی۔ میٹرک پونچھ سے ہی کرنے کے بعد لاہور سے ایم اے انگریزی کیا اور پھر پونچھ میں کافی عرصہ مقیم رہے۔ یہیں سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ چناں چہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں پونچھ کی تہذیب وثقافت، رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں، پہاڑی، ڈوگری اور گوجری کے الفاظ، محاورات سمیت پلاٹ اور کردار تک پوری آب وتاب سے چمکتے نظر آتے ہیں۔

کرشن چندر کے مجموعی طور پر بائیس افسانوی مجموعے شائع ہوئے اور تیس ناول لکھے۔ ان کے ناولوں ''برف کے پھول''، ''شکست''، ''مٹی کے صنم''، ''طوفان کی کلیاں''، ''پہلگام کا بدنام''، ''زرگاہوں کی رانی'' خصوصیت سے پونچھ اور کشمیر کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کرشن چندر نے رپورتاژ، انشائیے اور بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں۔ کشمیری پس منظر کی اس بہتات پر بعض نقادوں نے ان پر تنقید بھی کی ہے۔ حامدی کاشمیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''کسی مخصوص علاقے کی زندگی کو ناول کا موضوع بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ ناول نگار اس علاقے کی جغرافیائی، سماجی اور منظری زندگی کے ہو بہو نقشے کھینچے۔ یہ کام دوسرے لوگوں کا ہے، ادیب کا نہیں''۔(۵۱)

بایں ہمہ اپنی اس انفرادیت کی وجہ سے انھیں کشمیری ادب کی روایت کا اہم حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ کشمیری افسانوی ادب میں آپ بیتی کے نقوش کے حوالے سے کرشن چندر کا ناول ''میری یادوں کے چنار'' اہم ہے۔ کشمیر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ اس ناول میں مصنف نے اپنی یادداشتوں کے حوالے سے اپنی آپ بیتی ہی کو بیان کیا ہے۔ وہی صیغہ واحد متکلم، وہی زندگی کی داستان کا انداز اور نام سبھی عناصر آپ بیتی سے جڑے ہوئے ہیں۔

''تاراں مجھے پسند ہے۔ اُس کا چہرہ بالکل گول ہے۔ چاند کی طرح اور جب وہ اپنے

چھوٹے لب کھول کر ہنستی ہے تو مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ
میں بڑا ہوکر تاراں سے شادی کرلوں گا۔ مگر ابھی اس میں بہت عرصہ باقی ہے کیوں کہ
میری عمر آٹھ سال کی ہے''۔(۵۲)

بعض کردار اور واقعات یقیناً ناول کی ضرورت کے تحت لائے گئے ہیں، مگر ریاست پونچھ میں ایک عرصہ تک قیام، کشمیر میں اُن کا ٹھہرنا اور پھر وہاں سے نکل جانا کرشن چندر کی زندگی کی داستان کا حصہ ہے جسے انھوں نے ''چناروں کے سائے'' کے ناول کی صورت پیش کیا ہے۔ ناول کے اختتام میں داستان نگار کے والد کو ایک ریاست کے ریذیڈنٹ سے نکال دیا، دوسرے سے جھگڑا ہوا اور تیسرے سے ناراض ہوکر وہ اگلی کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوجاتے ہیں۔ آخری منظر کچھ طرح ہے:۔

''میرے پتا جی آگے آگے چل رہے تھے اور ان کے پیچھے پتھروں پر لڑکھڑاتی، ڈگمگاتی
ہوئی میری ماں چل رہی تھیں اور ان کے پیچھے میں روتا ہوا آرہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ماں
جی! مجھے گھر لے چلو، مجھے گھر لے چلو کیوں کہ ان دنوں میں بچہ تھا اور مجھے معلوم نہ تھا
کہ جو سچ کے راستے پر چلتے ہیں اُن کے لیے کوئی گھر نہیں ہوتا۔ کوئی جائے پناہ نہیں
ہوتی اور کوئی سایہ شجر اُن کی راہ میں نہیں ہوتا۔ ہم ایک عزم راسخ اپنے سینے میں لیے
اس راستے سے گزرتے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے یادوں کے چنار چھوڑ جاتے ہیں۔
جو آگ کے شعلوں کی طرح دھرتی سے نکلتے ہیں اور آسمان کی طرف سربلند ہوکر اُن کی
شہادت کی گواہی دیتے ہیں''۔ (۵۳)

کشمیر میں افسانوی ادب کا ایک اور اہم حوالہ ٹھاکر پونچھی ہے۔ ٹھاکر پونچھ شہر کے محلّہ جرنیلا میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔ یہ دور پونچھ میں اُردو ادب کا سنہری دور تھا۔ چناں چہ اس ادب دوست ماحول میں ٹھاکر پونچھی پروان چڑھے اور اپنے عمدہ تخلیقات سے اپنا بہترین حصہ ڈالا۔ پروفیسر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اُردو'' میں لکھتے ہیں کہ ''ٹھاکر کا پہلا افسانہ ''راجا'' جمّوں کے رسالہ ''توی'' میں شائع ہوا''۔ پھر آپ ملازمت کے سلسلہ میں دہلی چلے گئے لیکن پونچھ اور کشمیر کے رنگ آپ کی تخلیقات میں موجود رہے۔ آپ کے دس افسانوں کا مجموعہ ''زندگی کی دوڑ'' ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ ان افسانوں میں انھوں نے کشمیر کی خوب صورتی کے سبھی رنگ سمونے کی کوشش کی۔ ''چناروں کے چاند'' بھی ٹھاکر کے افسانوں کا اہم مجموعہ ہے، جس میں بھی کشمیر اور بالخصوص پونچھ پوری طرح موجود ہے۔

''زندگی کے موڑ پر'' کے نام سے ٹھاکر کا ایک اور افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ''موت کے سائے تلے''، ''ڈولک بجتی رہی''، ''اندھے کی بیوی''، ''معاوضی''، ''زعفران'' اور دیگر افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں بھی وہ شہر میں

رہتے ہوئے اپنے من میں بسے پونچھ کے پہاڑوں اور پہاڑوں پر بسنے والے معصوم لوگوں کی دھڑکنیں سناتے ہیں۔

افسانہ نگاری میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے ساتھ ساتھ ٹھاکر پونچھی نے اپنی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ناولوں کے ذریعے کیا۔ ''رات کے گھونگھٹ'' آپ کا پہلا ناول ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ ''وادیاں اور ویرانے'' ٹھاکر پونچھی کا شاہکار ناول ہے۔ اس ناول کے حوالے سے جان محمد آزاد لکھتے ہیں:۔

> ''یہاں پونچھ کے حسین پس منظر میں پہاڑی رومان اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ مدن رائے، رانی، مادھو، کرما، سیٹھ رادھے شام اور سروپ اس ناول کے اہم کردار ہیں۔ یہ سب زندہ و جاوید آہنی کردار ہیں۔ مناظر کے بیان میں بھی ان کی حقیقت پسندی نظر آتی ہے۔ جموں وکشمیر کے لالہ زاروں، پہاڑوں، قصبوں اور دیہات کی ایسی رنگین تصویریں دو ایک لوگوں کے بغیر شاید ہی کسی نے کھینچی ہوں۔ اس بیش بہا ادب کو آنے والی نسلیں سالہا سال تک یاد کرتی رہیں گی''۔ (۵۴)

ٹھاکر کے دوسرے ناولوں میں ''پیاسے بادل''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''، ''ڈیڈی''، ''چاندی کے سائے''، ''زلف کے سر ہونے تک''، ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' اور ''یادوں کے کھنڈر'' وغیرہ شامل ہیں۔

یوں تو ٹھاکر کے اکثر افسانوں اور ناولوں میں ہی اس کی ذات اور پونچھ کی تہذیب، ثقافت اور ماحول نظر آتا ہے مگر ''اب میں وہاں نہیں رہتا''، ''وادیاں اور ویرانے'' اور ''یادوں کے کھنڈر'' کشمیر کی خوب صورت جھلک کے ساتھ ساتھ ٹھاکر کی اپنی زندگی کی جھلک بھی پیش کرتے ہیں۔ اُن کے ان ناولوں میں آپ بیتی کے نقوش واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر اُردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سری نگر میں حاصل کی۔ بی اے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ شعبہ تعلیم سے وابستہ ہونے کے بعد ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ اس عہد کے اہم افسانہ نگاروں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی اور مرزا ادیب کا قرب نصیب ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کشمیر جل رہا ہے'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں کشمیر کی مظلومیت اور مطلق العنان حکومت مخالف خیالات پیش کیے۔ ''اس صدی کا آخری گرہن''، ''دو کنواریاں'' اور ''ایک قیدی'' ذاکر کے بہترین افسانے ہیں۔ ''سندور کی راکھ'' آپ کا پہلا اُردو ناولٹ ہے۔ اس کے بعد ''دھرتی سدا سہاگن''، ''کرماں والی''، ''فرار''، ''لمحوں میں بکھری ہوئی زندگی''، ''ڈوبتے سورج کی کتھا''، ''خون پھر خون ہے''۔ ''سمندر، صلیب اور وہ'' وغیرہ اہم ہیں۔

ذاکر کے اکثر ناولوں اور افسانوں کا پس منظر کشمیر ہی ہے، لیکن ''لمحوں میں بکھری زندگی'' ایک ایسا ناول ہے، جس میں کشمیر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ اُن کی ذاتی زندگی بھی پوری طرح موجود ہے۔ یہ ان کا ایک سوانحی ناول ہے۔ کرشن چندر کے

''میری یادوں کے چنار'' کی طرح اس میں بھی اسلوب بیان، انداز اطوار، پلاٹ، کردار مصنف کی ذات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ ''لمحوں میں بکھری زندگی'' میں مصنف کی زندگی کا ایک عہد سمٹ آیا ہے اور اسی باعث یہ آپ بیتی کے نقوش کا حامل اہم ناول ہے۔ کشمیر لال ذاکر کے ایک ناول سے اقتباس پیش ہے:۔

''جب کبھی مجھے میرے باپ نے پیٹا میں یہاں آیا ہوں چناروں کی چھاؤں میں۔ جب مجھے کسی نے جھڑکا ہے مجھے یہیں آ کر سکوں ملا ہے۔ میں نے کئی برسوں تک سکول سے چھٹی کے بعد اپنا وقت اسی چنار کی چھاؤں میں گزارا ہے۔ جہاں ہم دونوں بیٹھے ہیں۔ یہیں بیٹھ کر میں نے ہوم ورک کیا۔ اقبال کی نظمیں یاد کیں ہیں۔ یہیں میں جی بھر کی ہنسا بھی ہوں اور رویا بھی ہوں''۔(۵۵)

کشمیر ادب کی روایت کا ایک اہم نام پریم ناتھ در، کا ہے۔ پریم ناتھ در ۲۵/جولائی ۱۹۱۴ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے۔ لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز لاہور کے ماہنامہ ''ادبی دنیا'' سے ۱۹۴۵ء میں کیا۔ ۱۹۴۹ء میں پریم ناتھ در کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''کاغذ کا واسدیو'' حلقہ ارباب ذوق دہلی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ ان کے دس افسانوں پر مشتمل دوسرا مجموعہ ''نیلی آنکھیں'' ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔ پریم در نے اپنے افسانوں میں نہ صرف افسانے کی ہیئت میں نئی تبدیلیاں کیں بلکہ بعض افسانوں میں مغربی ادب کی تحریکوں جیسے شعور کی رو اور اس نوع کی دیگر نئی اور انوکھی تکنیک کا استعمال کر کے اُردو افسانے کو ایک نئی جہت دی۔ ممتاز نقاد مولانا صلاح الدین احمد پریم ناتھ در، کی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''کہاں ہیں وہ افسانہ نگار، جو کہتے ہیں کہ انھوں نے عظیم افسانے لکھے ہیں۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ افسانے یہ ہوتے ہیں۔ (چائے کی پیالی) داخلیت اور نفسی تجزیہ کا معیار سمجھنے والے یہ جان لیں کہ اس معیار کے حدود ابھی اور آگے ہیں''۔(۵۶)

پریم ناتھ در، کی افسانہ نگاری میں اعلیٰ معیاری اصولوں اور موضوعات کے انتخاب کی خوبی کے ساتھ، جو چیز انھیں کشمیری ادب کے ساتھ جوڑتی ہے وہ اُن کے کشمیری ہونے کے علاوہ افسانوں میں موجود کشمیریت ہے، جو ان کے فکر وفن کے ہر موڑ پر نظر آتی ہے۔ اُن کے افسانے ''گیت کے چار بول'' سے ایک اقتباس:۔

''کشمیر کی برف تو آسمان سے آتی ہے، جس میں نہ تو شیشے کی وہ کاٹتی ہوئی چمک ہوتی ہے نہ تیزی۔ اس برف میں چاند کی نرم نرم روشنی ہوتی ہے اور جب برف فروش ایک کندآلے سے ایک ٹکڑے کو ڈھیرے سے الگ کرتا ہے تو یہ برف گاہک کے ہاتھوں

میں مصری کے دانوں کی طرح گرتی ہے۔ یہ برف ترازو سے نہیں تلتی کیوں کہ کشمیری اسے بیچتا نہیں تبرک کی طرح بانٹتا پھرتا ہے''۔(۵۷)

حامدی کاشمیری اُردو ادب میں ایک بڑے افسانہ نگار، ناول نویس اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۵۱ء میں ماہنامہ ''شعاعیں'' دہلی سے کیا۔ کشمیر کے پھلوں اور پھولوں کے پس منظر سے لبریز آپ کا افسانہ ''وادی کے پھول'' انفرادیت کا حامل افسانہ ہے۔ اسی نام سے آپ کی سولہ کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۰۷ء میں منظر عام پر آیا۔ ''بہاروں کے شعلے'' آپ کا پہلا ناول ہے۔ ''پگھلتے خواب''، ''اجنبی راستے''، ''بلندیوں کے خواب''، ''پرچھائیوں کا شہر'' وغیرہ ناول اور ناولٹ ہیں۔ جب کہ ''وادی کے پھول کے علاوہ ''سراب'' اور ''برف کی آگ'' افسانوں کے مجموعے اور شاعری کا مجموعہ ''عروس تمنا'' ایک سفر نامہ ''انجمن آرزو'' اور دوسری تخلیقی تصانیف کے بعد حامدی کاشمیری نے شعر و شاعری اور تنقید کو اپنی قلمی سرگرمیوں کا محور بنالیا۔ ان کی تنقیدی کتب میں ''غالب کے تخلیقی سرچشمے''، ''نئی حیثیت اور عصری اُردو شاعری''، ''اقبال اور غالب''، ''کارگہہ شیشہ گری''، ''حرف راز''، ''ناصر کاظمی''، ''امکانات''، ''تفہیم تنقید''، ''معاصر اُردو تنقید نئے تناظر میں'' جیسی معیاری کتب تصنیف کیں اور اُردو کے بڑے نقادوں میں شمار ہونے لگے۔

حامدی کاشمیری کے تخلیقی ادب میں سفر نامہ ''انجمن آرزو'' کے علاوہ بالخصوص ''وادی کے پھول'' کے افسانوں اور ''برف کی آگ'' ایسے ناول ہیں جن میں کشمیر کے ماحول، کردار اور رنگ و روپ کے ساتھ ساتھ ذات کے نقش ملتے ہیں وہ انھیں کشمیر میں اُردو آپ بیتی کی روایت سے بھی جوڑتے ہیں۔

کشمیر کے افسانوی ادب کی روایت میں قدرت اللہ شہاب اور ڈاکٹر رشید امجد ایسے حوالے ہیں، جو بیرون ریاست (پاکستان میں) رہ کر ادب کی ترویج کرتے رہے۔ قدرت اللہ شہاب نے ''شہاب نامہ'' کی صورت اُردو ادب کو ایک عمدہ آپ بیتی دی ہے، جس کا تفصیلی مطالعہ پیش ہو چکا ہے۔ ''شہاب نامہ'' کے علاوہ قدرت اللہ شہاب کے ناولٹ ''یا خدا'' اور ''ماں جی'' میں بھی اُنھوں نے جس کرب اور ذاتی احساسات کو اپنی ان تخلیقات میں شامل کیا ہے وہ انھیں آپ بیتی سے جوڑتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید امجد پاکستان میں ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''کاغذ کی فصیل''، ''بیزار آدم کے بیٹے''، ''ریت پہ گرفت'' کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی کی کہانیاں اس کی ذات سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کا کرب وہ اپنی ذات، اپنے گھر اور بیوی بچوں کے گرد گھومتا ہے۔ اپنی تلاش کا سفر ہے جو مختلف کرب ناک مراحل سے گزرتا ہے، مگر اپنی شناخت کا یہ سفر تکمیل آشنا نہیں ہوتا:۔

''میں، وہ اور دوسرے سب دن کے روشن بازاروں اور رات کی کالی گلیوں میں اُسے تلاش کرتے کرتے اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھے ہیں اور اب ایک دوسرے سے پوچھتے

ہیں۔ میں کون ہوں؟ تم کون ہو؟ وہ کون ہے؟ وہ جو خوشبو کی طرح محسوس ہوتی ہے دکھائی نہیں دیتی (لیکن خوشبو تو صرف ان کے لیے ہے، جو سونگھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں)''۔(۵۸)

ڈاکٹر رشید امجد کی زندگی دکھوں، پریشانیوں، محرومیوں اور ہجرت کے دکھوں سے عبارت ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں:۔

''رشید امجد کے ذاتی تجربات میں محرومیوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس میں جنسی خواہشات بھی ہیں، اقتصادی مشکلات بھی، فطرت کا جبر بھی ہے، تہذیبی عدم تشخص بھی، قومی سطح پر ہونے والے سانحات بھی ہیں اور شہری زندگی کے پیدا کردہ ثقافتی اور اقتصادی خلفشار بھی''۔(۵۹)

چناں چہ ان محرومیوں کا اظہار رشید امجد کے افسانوں میں کئی رنگ اور انداز اپناتا ہے:۔

''اس بے ثباہت دور کی منافقت نے چیزوں کو اس طرح بے توقیر کر دیا ہے کہ تنہائی، جس کی کوکھ سے کشف، گیان اور عظمت کے چشمے پھوٹتے تھے اب ہولناک، کرب ناک، مسخ چہرے والی بے خواب ویرانی نے جنم لیا ہے، جس کا تصور آتے ہی بانجھ پن آنکھوں میں ناچنے لگتا ہے اور اذیت جسموں پر دستک دینے لگتی ہے۔ اب گیان اور کشف کہاں کہ لفظوں کے کشکول مدتوں سے خالی ہیں۔ لفظ دم توڑ رہے ہیں''۔(۶۰)

ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں میں موجود یہ دکھ اور کرب دراصل اس کی آپ بیتی ''تمنا بے تاب'' ہی کے مختلف حوالے ہیں۔ اس لیے رشید امجد کے افسانوں میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔

کشمیر میں اُردو کے افسانوی ادب کے حوالے سے جن دیگر ادیبوں کی تخلیقات (ناول، افسانہ) میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں اُن کے نام بذیل ہیں:۔

اختر محی الدین۔(''پیوند''، ''ظاہر و باطن'' افسانے)

غلام رسول سنتوش۔(''سمندر پیاسا ہے'' ناول)

بنسی نردوش۔(''تارسوت (افسانوی مجموعہ کے بیشتر افسانے)

عبدالغنی شیخ۔(''زوجیلا کے آر پار'' (افسانوی مجموعہ کے اکثر افسانے اور ''وہ زمانہ''، ناولٹ)

کلدیپ رعنا۔(''ادھورے خواب'' افسانوی مجموعہ)

پشکر ناتھ۔(''ڈل کے باسی'' اور ''عشق کا چاند اندھیرا'' افسانوی مجموعے سے بعض افسانے)

شبنم قیوم۔(''زندگی اور موت''،''پرانی ڈگر، نئے قدم''ناول)

عمر مجید۔(''مردہ چنار''،''میرے وطن''افسانے)

جان محمد آزاد۔(''وادیاں بلا رہی ہیں''ناول)

محمد کبیر خان۔(وزیٹنگ فادر''،ناول)

خوش دیو مینی۔(''چادر''افسانوی مجموعہ کے بعض افسانے)

بشیر شاہ۔(''تیز ہوا میں تنہا پھول''ذات نامہ)

نذر بونیاری۔(''یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں''افسانوی مجموعہ کی بیشتر کہانیاں)

امیر مالموہی۔(''احساس کا کرب''افسانہ)

کشمیر کے افسانوی ادب میں ناول اور افسانہ کے ساتھ ساتھ ڈراما نگاری کی صنف میں بھی آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔ڈرامہ کی روایت کشمیر میں ناول و افسانہ سے پرانی ہے۔یہاں کے باسی آغا حشر کاشمیری اُردو ڈراما نگاری کا ایک اہم اور معتبر حوالہ ہے۔آغا حشر کاشمیری اور دوسرے نامور ڈراما نگاروں کی جمّوں آمد سے ہی یہاں باقاعدہ سٹیج ڈرامے شروع ہوئے۔یہ اسی ماحول کا نتیجہ تھا کہ ڈرامے کے موضوع پر برِعظیم میں پہلی تنقیدی کتاب''ناٹک ساگر''جمّوں میں یہاں کے دو باشندوں محمد عمر اور نور الٰہی نے تصنیف کی۔اس حوالے سے ڈاکٹر ظہور الدین لکھتے ہیں:۔

> ''ریاست میں اُردو ڈرامے کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی اس کا آغاز دو بلند قامت شخصیات سے ہوگا جنھیں دنیا محمد عمر اور نور الٰہی کے نام سے جانتی ہے۔آپ نے اُردو ادب کو نہ صرف عالمی ڈرامے کے موضوع پر پہلی تاریخی تنقیدی کتاب''ناٹک ساگر''کے نام سے عطا کی بلکہ خود بھی بہت ڈرامے تخلیق اور ترجمہ کر کے انھیں پیش کیا''۔(۶۱)

محمد عمر اور نور الٰہی کے بعد آزادی سے قبل جن ادیبوں نے اُردو ڈرامہ کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ان میں ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر رحمت، جگدیش کنول، اطہر عسکری، نرسنگداس نرگس، شیخ غلام محمد، ایم اے عزیز اہم ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کے دونوں حصوں میں اُردو ڈرامے کو مختلف ادبی و ثقافتی تنظیموں، ریڈیو سری نگر، جمّوں اور ریڈیو آزاد کشمیر تراڑکھل اور مختلف تعلیمی اداروں نے فروغ دیا۔ضیاالدین باب کے مطابق:۔

> ''اس دور میں ڈراما نویسی سے وابستہ ادیبوں میں محمود ہاشمی، پریم ناتھ پردیسی، راج ہنس کھنہ، دینا ناتھ نادم، علی محمد لون، وجے سمن سوسن، ٹھاکر پونچھی، پشکر ناتھ، بنسی نردوس، ویدراہی لالہ، دیانند کپور، موتی لال کپور، گوپی ناتھ کوشک، رام کمار ابرول، منوہری

رائے زادہ وغیرہ شامل ہیں''۔(۶۲)

نئے ڈرامہ نگاروں میں طاؤس بانہالی، احمد شمیم، غلام احمد پنڈت، سلیم خان گمی، نصراللہ خان ناصر، اشتیاق آتش، ارشد شیری، سحود سیلانی، اسلم بھٹی، کلیم جرال، ریاض صدیقی۔ان ڈرامہ نگاروں میں زیادہ تر تاریخی، کشمیر کی تحریک، لوک کہانیوں وغیرہ پر مبنی ڈرامے لکھے۔ان ادیبوں میں سے جن چند ایک کی تخلیقات میں آپ بیتی کے عناصر موجود ہیں اُن میں علی محمد لون کے ''تر ی آرزو'' جوان کا ناول بھی تھا اور ایک ڈرامہ نگار علی احمد کی کہانی ہے اور دوسرے بعض ڈراموں میں آپ بیتی کے نقوش پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ سجود سیلانی کے ڈراموں اور افسانے ''چنار کے سائے میں'' میں بھی آپ بیتی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔

شاعری میں آپ بیتی کے نقوش

کشمیر میں اُردو شعر و ادب کی ابتدائی کاوشوں کے سراغ میں تحقیقات نے جس اوّلین تخلیق کا پتا دیا ہے وہ مثنوی ''گلزارِ فقر'' ہے۔ شیخ غلام محی الدین کی یہ مثنوی ۱۱۳۳ھ کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی اس وقت تصنیف ہوئی جب حافظ محمود احمد شیرانی کے مطابق: ''دہلی میں ابھی اُردو دبستان قائم نہیں ہوا تھا''۔(۶۳) چناں چہ یہ مثنوی نہ صرف کشمیر میں اُردو شاعری کا ابتدائی حوالہ ہے بلکہ برِعظیم میں اُردو شاعری کی قدیم تخلیقات میں شمار ہوتی ہے۔ ''گلزار فقر'' میں غلام محی الدین نے والدین، اساتذہ، خاندان کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بہت سی معلومات دی ہیں۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:۔

یہ نسخہ بہیا تمام — گلزار فقر ہے اس کا نام
اس شہر میں رہن ہمارا — تولد مسکن اور پیارا
میر پور نام ہے بیچ پنجاب — حق رکھے دائم اس کی آب
قطب عالم میرا باپ — جس نے دیا اپنا آپ
حق کی راہ میں سب کچھ دیا — سب کج دے کر حق کوں لیا
شیخ اجل عارف کامل — قطب دیں مکمل اکمل
شیخ محمد یوسف نام — ہر کامل سے بہے تمام
خاندان بڈا ہے گکھڑ — اصل نجیب و نیکوکار
ایک تیس برس باراں سو — ہجرت سیں ہوئے تھے نو (۶۴)

درج بالا اشعار سے اس مثنوی میں موجود صاحب تصنیف کی آپ بیتی کے حوالے سے موجود عناصر اور نقوش کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ میر پور آزاد کشمیر ہی کے صوفی شاعر میاں محمد بخش کی مثنوی ''سیف الملوک'' بھی معروف ہے۔ یہ مثنوی پنجابی، پہاڑی اور کشمیر و پنجاب کے ان علاقوں میں سب کے ہاں یکساں مقبول ہے۔ اس حوالے سے حبیب کیفوی لکھتے ہیں:۔

> ''میر پور کو اس اعتبار سے بہت اہمیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے اُردو کی ایک آپ بیتی لکھی گئی اور اس علاقے کے رہنے والے ایک بزرگ میاں محمد نے پنجابی میں ''سیف الملوک'' ایسی شہرہ آفاق کتاب لکھی۔ میاں محمد کا کلام عوام و خواص کے دلوں کی دھڑکنیں بن چکا ہے اور ان کے حکیمانہ اور صوفیانہ کلام پر سب سر دھنتے ہیں''۔(۶۵)

''سیف الملوک'' کے اشعار میں بھی آپ بیتی کے واضح عناصر موجود ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز میں ایک اور عوامی شاعر داس علی کا تذکرہ ملتا ہے، جس کی زبان نہ بالکل پنجابی ہے نہ ڈوگری

بلکہ دونوں کے درمیان کی ہے، نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے انسانی اقدار اور معاشرتی غلط رسوم کی خرابیوں کو دور کرنے پر زور دیا ہے۔داس علی کے کلام کا نمونہ کچھ اس طرح ہے:۔

م مرشد نالوں دانا بید چنگے جیڑے دسدے نی راہ رحمتاں دے
مرشد اکھدے بنو لنگوٹ ، لیکن دانا دسدے نیں امتّاں دے
مرشد اکھدے کرو قربان ککڑ دانا دسدے نی دارو رحمتاں دے
داس علی اے پیر فقیر مرشد کاٹھی پان پینڈے اُپر رحمتاں دے (٦٦)

اس عوامی شاعر کے کلام میں بھی جا بجا اس کی زندگی کے نقوش موجود ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری عشروں میں جموں میں ہیڈ ماسٹر اور انسپکٹر مدارس کے عہدوں پر فرائض سرانجام دینے والے پنڈت شیونرائن بھان بہ تخلص عاجز کے کلام میں بھی آپ بیتی کے عناصر ملتے ہیں۔اپنی ایک مثنوی کے آخر میں دعا گو ہیں:۔

مجھ کو بھی اپنی بھکت دیجیے دھرم اور کرم کی شکست دیجیے
بھگوان یہ بنتی تو سن لو نرمل میری بدھی ایسی کردو (٦٧)

بیسوی صدی کے ایک شاعر مولوی میر عالم ہیں۔خطہ پونچھ کے اس شاعر نے بھی اپنی شاعری میں معاشرے میں رائج غلط رسوم اور روایت کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔پنجابی، پہاڑی اور اُردو میں موجود ان کی نظموں اور کلام میں معاشرتی خرابیوں اور خامیوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی حالات اور اپنی ذات کے نقوش موجود ہیں۔نمونہ کلام:۔

صدی سے نہیں پانچ خواندہ و کاتب
نہ اہل ہنر ہیں نہ اہل مکاسب
ہمارا جہالت نے بیڑا ڈبویا
جو فطری ذہانت تھی اس کو بھی کھویا
مناسب ہے اب بھی ہمیں ہوشیاری
کہ بدلائیں کروٹ اتاریں خماری (٦٨)

بیسوی صدی میں کشمیر کی اُردو شاعری نے بھی جدید رجحانات کو اپنا لیا۔چناں چہ غزل نے اپنا تصرف دوسری اصناف شعری پر قدرے زیادہ مضبوطی سے جما لیا، جس کی وجہ سے مثنوی اور دوسری بیانیہ اصناف شاعری پس منظر میں چلی گئیں۔عہد جدید کا شاعر غزل کے رمز ایما اور اخفا سے ہی اپنی دلی کیفیات، احساسات اور جذبات کو بیان کرتا ہے۔وہ مثنوی کی طرح کھول کر اپنی ذات اور جہات کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔بایں ہمہ بیسوی صدی کے آغاز کے بیشتر شعرا کے کلام میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔اس صدی کے آغاز میں جس کشمیری نابغہ نے اپنی شاعری کے ذریعے برعظیم کے مسلمانوں کو بالخصوص اور عالم اسلام کو بالعموم اپنے خیالات اور افکار سے متاثر کیا وہ ڈاکٹر محمد اقبال تھے۔اپنے آفاقی تصورات کے باوجود اقبال کو اپنے آب واجداد، دھرتی کشمیر اور اپنے کشمیری النسل ہونے پر فخر تھا اور اس کا اظہار اپنے کلام میں کرتے ہیں:۔

تنم گلے ز خیاباں جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است ٦٩

اپنے اجداد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد (۷۰)

اقبال نے متعدد اشعار میں کشمیر اور دھرتی کشمیر سے اپنے تعلق، اپنے آبا و اجداد کے حوالے سے معلومات فراہم کی ہیں۔کلام اقبال کے علاوہ خطوط اقبال میں ایسے متعدد حوالے ملتے ہیں۔اقبال کے اجداد میں ایک بزرگ بابا لول حج گزرے ہیں۔ان کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد دین فوق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

''حضرت شیخ العالم، شیخ نورالدین ولی کے ارادت مندوں میں حضرت بابا نصرالدین ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں............ بابا نصرالدین کے مریدوں میں بابا لول حج ایک بزرگ تھے، جنھوں نے کئی حج کیے اور بارہ سال تک کشمیر سے باہر رہے''۔(۷۱)

یوں اقبال کے کلام اور نثر میں اُن کی ذات سے جڑے کئی حوالے موجود ہیں۔اقبال کے علاوہ محمد دین فوق، سالگرام سالک، شہ زور کاشمیری، غلام رسول نازکی، دینا ناتھ مست، حامدی کاشمیری، چراغ حسن حسرت، منشی صادق علی، دینا ناتھ رفیق، ضیاالحسن ضیاؔ، سرون ناتھ آفتاب، آزر عسکری، تحسین جعفری، اثر صہبائی، امیں طارق قاسمی، قمر قمرازی، احمد شمیم، صابر آفاقی، سعید بخاری وغیرہ اہم شعرا ہیں، جن کے کلام میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔چند شاعروں کا نمونہ کلام پیش ہے:۔

منشی صادق علی کی نظم ''سفر زندگی'' سے:

کیا کہوں کیا کٹھن ہے زندگانی کا سفر
ہر قدم پر جاں کا نقصاں تو ایماں کا ضرر
ہے یہی وہ منزل کہ جس کو کہتے ہیں صراط
دھار پر تلوار کی ہے نوع انساں کا گزر (۷۲)

منشی محمد دین فوق:

کشمیر ہے اک شیر مگر سویا ہوا ہے
جاگے گا تو مشکل سے وہ ہو جائے گا سنبھالا (۷۳)

آزر عسکری کی نظم ''فریاد'' سے چند اشعار:

لوگ سمجھتے ہیں میں خوش فکر ہوں دلشاد ہوں
ہر طرح کے رنج و آلام سے آزاد ہوں
یہ نہیں معلوم سر سے پاؤں تک فریاد ہوں
غیرت مجنوں بھی ہوں اور ثانی فرہاد ہوں (۷۴)

اثر صہبائی:

غرق سرور و نور ہوں جام و سبو سے دور ہوں
مرے لیے کھلا ہوا میکدہ شہود ہے
جو میرے شوق کی دنیا میں کیف و مستی ہے
نگاہ ساقی و موجِ مئے کہن میں نہیں (۷۵)

چراغ حسن حسرت کی نظم ''اے وطن'' سے چند اشعار:

جب تری یاد مرے پیارے وطن آتی ہے
دل مجروح میں آہوں کا دھواں ہوتا ہے
اور ان آنکھوں میں ایک سیلِ رواں ہوتا ہے
تری صبحیں تیری شامیں مرے بے بس فردوس
ترے میداں ترا سبزہ ترے کانٹے ترے پھول
ترے ٹیلے ترے نالے ترے پتھر تری دھول
ترا سورج ترا گردوں ترے انجم افسوس
ایک اک کر کے مرے سامنے سب آتے ہیں (۷۶)

ضیاالحسن ضیا کی نظم ''وادی مغموم'' سے:

شفق اداس صبا مضطرب چمن مغموم
نظر نواز بہاروں کا بانکپن مغموم

جمال شاہد فطرت وقار نکہت و نور
دیار لالہ و گل عظمت کہن مغموم
جفائے غیر سے برہم قرار کی محفل
ستم ظریفی دوراں سے انجمن مغموم (۷۷)

امین طارق قاسمی ''عرض حال'' میں دھرتی کشمیر کے ساتھ ساتھ ذاتی احوال بھی بیان کرتے ہیں:

ازل ہی سے ہیں حق و باطل باہم معرکہ آرا
پڑی بنیاد جب قابیل نے ہابیل کو مارا
مرے پیش نظر ہے آج ایک ایسا ہی نظارہ
مری آنکھوں نے دیکھا حق سے باطل معرکہ آرا (۷۸)

ڈاکٹر صابر آفاقی کی ایک نظم کے دو اشعار:

مرے حبیب یہ پت جڑ تو پائیدار نہیں
حیات اُجڑے دیاروں میں مسکرائے گی
شب سیاہ کا جادو ہے ٹوٹنے والا
سحر فسردہ بہاروں میں گنگنائے گی (۷۹)

محمد سعید بخاری کی نظم ''یومِ تاسیس'' کا ایک بند:

یہی تاریخ یہی رت یہی اکتوبر تھا
اک جنگل کی پہاڑی پر میرا دفتر تھا
تھا یہی قصرِ صدارت یہی میرا گھر تھا
راہ حق میں میرا جینا میرا مرنا تھا
یومِ تاسیس مجھے یاد دلا یاد دلا (۸۰)

حوالہ جات:

۱۔ یوسف جمال انصاری: آپ بیتی اوراس کی مختلف صورتیں، مشمولہ نقوش آپ بیتی نمبر۔ لاہور: ۱۹۶۴ء، ص ۶۹

۲۔ سلیم گردیزی، سید: غیر ملکی سیاحوں کی سیاحت کشمیر۔ مظفرآباد: ھمالہ پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۶

۳۔ ضیاالدین، ڈاکٹر: کشمیر میں سفرنامے کی روایت، مشمولہ ماہنامہ شیرازہ، شمارہ ۷۔۸، جلد ۳۸۔ سری نگر: جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۵

۴۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب میں سفرنامہ۔ لاہور: اُردو اکیڈمی، س ن، ص ۴۷

۶۔ اجمل نیازی، ڈاکٹر: فوق الکشمیر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷

۷۔ محمد دین فوق: سفرنامہ کشمیر، مشمولہ کشمیری میگزین۔ لاہور، ۱۹۰۷ء، ص ۲۷

۸۔ طلا خان سدوزئی، میجر: میرا سفرنامہ۔ پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۷۱ء، ص ۴۹

۹۔ ضیاالدین، ڈاکٹر: کشمیر میں سفرنامے کی روایت، ص ۲۱۰

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۱۱۔ ثریا خورشید: بانہال کے اس پار۔ میرپور: ویری ناگ پبلشرز ۱۹۸۸ء، ص ۳۷

۱۲۔ ام لیلیٰ: سفر ہے شرط، مشمولہ ''سفرنامہ از جان کاشمیری۔ لاہور: اکادمی پنجاب، ۱۹۸۳ء، ص ۲۷

۱۳۔ جان کاشمیری: سفرنامہ۔ لاہور: اکادمی پنجاب، ۱۹۸۳ء، ص ۳۱

۱۴۔ سلیم گردیزی، سید: میں نے کشمیر جلتے دیکھا۔ لاہور: مکتبہ جمال، اشاعت دوم، ۲۰۱۲ء، ص ۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۹

۱۶۔ عبدالعزیز ساحرؔ، ڈاکٹر: تقریظ، وادی گل پوش میں۔ لاہور: منشورات، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱

۱۷۔ ظفر حسین ظفر، ڈاکٹر: وادی گل پوش میں۔ لاہور: منشورات، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۴

۱۸۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: فلیپ، وادی گل پوش میں

۱۹۔ ممتاز شیریں: تعارف، مشمولہ، کشمیر اداس ہے۔ لاہور: الفیصل ناشران، تاجران کتب، ۱۹۹۴ء (دوم)، ص ۱۸

۲۰۔ ممتاز شیریں: پیش لفظ، کشمیر اداس ہے۔ ص ۱۸

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۳

۲۲۔ محمود ہاشمی: کشمیر اداس ہے۔ ص ۶۱

۲۳۔ بلراج پوری: پیش لفظ، داستان ہزار دن۔ نئی دلی: روشن پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰

۲۵۔ کرن جیت لعل سہگل: داستان ہزار دن۔ ص ۹۵

۲۶۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: اصناف ادب۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۲

۲۷۔ احمد ندیم قاسمی: فلیپ، ہمہ یاراں دشت۔ لاہور: مطبوعات، ۱۹۸۷ء

۲۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: فلیپ، ہمہ یاراں دشت

۲۹۔ عطاالحق قاسمی: مزاح کی ہزار داستاں، مشمولہ ہمہ یاراں دشت۔ لاہور: گلریز پبلشرز، طبع دوم، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸

۳۰۔ محمد کبیر خان: چاند چہرے۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۶

۳۱۔ امجد اسلام امجد: دیباچہ، چاند چہرے، ص ۹

۳۲۔ محمد کبیر خان: چاند چہرے۔ ص ۱۹

۳۳۔ رفیع الدین ہاشمی: اصناف ادب۔ ص ۱۷۷

۳۴۔ جان محمد آزاد: جمّوں وکشمیر کے اُردو مصنفین۔ سری نگر: جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ اینڈ ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۲

۳۵۔ عبدالصبور شیدائی: سید بشیر حسین جعفری، مشمولہ ارقم، شمارہ ۲۰۱۲ء، ص

۳۶۔ بشیر حسین جعفری، سید: پائندہ باد۔ باغ، کشمیر سٹڈی لیک سوہاوہ شریف، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۶

۳۷۔ غلام احمد پنڈت، خواجہ: کشمیر آزادی کی دہلیز پر۔ لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲

۳۸۔ شاہد مختار: کہنے کی بات۔ مشمولہ آزادی کا خواب پریشاں۔ راولاکوٹ: مسٹر بکس، سنہ ندارد، ص ۱۸

۳۹۔ محمد صغیر خان، ڈاکٹر: آزادی کا خواب پریشاں۔ ص ۱۴

۴۰۔ مختار خان، سردار: آزادی کا خوابِ پریشاں۔ ص ۲۱

۴۱۔ ایضاً، ص ۶۸

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۴۳۔ غازی محمد امیر: تاریخ جمّوں وکشمیر۔ راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، سنہ ندارد، ص ۱۰۴

۴۴۔ عبدالصمد، خواجہ، پاک کشمیر، مظفرآباد، ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۴۵۔ برج پریمی، ڈاکٹر: بحوالہ شیرازہ، شمارہ ۶۔۸، جلد ۳۷۔ سری نگر: جمّوں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۸

۴۶۔ محمد اجمل نیازی، ڈاکٹر: فوق الکشمیر ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص ۲۴

۴۷۔ جان محمد آزاد: جموں و کشمیر کے اُردو مصنفین، ص

۴۸۔ خوش دیو مینی: پونچھ میں اُردو ادب کا ارتقا۔ جمّوں توی: ششماہی تسلسل، جلد ا، شمارہ، ۱۹۸۸ء، ص ۸۱

۴۹۔ جان محمد آزاد: جمّوں و کشمیر کے اُردو مصنفین، ۲۰۰۴ء، ص ۳۷

۵۰۔ ایضاً، ص ۴۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۴۳۳

۵۲۔ کرشن چندر: میری یادوں کے چراغ ۔ لاہور: مکتبہ اُردو ادب، س ن، ص ۶

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۵۴۔ جان محمد آزاد: جمّوں و کشمیر کے اُردو مصنفین ۔ ص ۴۴۱

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۴۹

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۷

۵۷۔ ایضاً، ص ۶۸

۵۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر: خواب آئینے، بحوالہ احمد جاوید، مشمولہ، پاکستان میں اُردو ادب کے پچاس سال ۔ راولپنڈی: گندھارا، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۸

۵۹۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۷۹

۶۱۔ ظہور الدین، ڈاکٹر: جموں میں اُردو ڈرامے کا ارتقا، مشمولہ، پاکستان میں اُردو، پانچویں جلد ۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۲

۶۲۔ ضیاالدین بابا: کشمیر میں اُردو ڈرامے کی روایت، ص ۱۲۳

۶۳۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو ۔ لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۹ء، ص ۱۹

۶۴۔ شفیق انجم: مثنوی گلزار فقر، تدوین متن اور لسانی جائزہ، مشمولہ ''دریافت''، شمارہ ۵ ۔ اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۲

۶۵۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو ۔ ص ۲۱

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۶۷۔ سید محمد یوسف بخاری، ڈاکٹر: اُردو اور کشمیری، مشمولہ، پاکستان میں اُردو، جلد، پنجم، ص۹۵
۶۸۔ میر عالم، مولوی: رسالہ دافع الرسوم۔ راولپنڈی: سٹار پریس، ص۲۶
۶۹۔ محمد اقبال، ڈاکٹر: کلیاتِ اقبال (فارسی)۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ء، ص۳۴۸
۷۰۔ محمد اقبال، ڈاکٹر: کلیاتِ اقبال (اُردو)۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع ہشتم، ۲۰۰۷ء، ص۵۳۰
۷۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر: زندہ رود۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۷ء، ص۳
۷۲۔ پاکستان میں اُردو (پنجم کشمیر)، ص۲۰۳
۷۳۔ ایضاً، ص۳۲۷
۷۴۔ حبیب کیفوی: کشمیر میں اُردو، ص۲۰۹
۷۵۔ ایضاً، ص۲۲۱
۷۶۔ ایضاً، ص۲۹۲
۷۷۔ پاکستان میں اُردو (پنجم کشمیر)، ص۲۰۸
۷۸۔ ایضاً، ص۲۱۵
۷۹۔ ایضاً، ص۲۳۲
۸۰۔ ذاکر حسین بخاری، سید، بلقیس زہرا بخاری، سید (مؤلفین) جانباز کی میراث۔ مظفر آباد: الخضریٰ ۲۰۱۰ء، ص۲۹۰

باب پنجم

مجموعی جائزہ، محاکمہ اور مستقبل

مجموعی جائزہ

انسانی زندگی کی تاریخ میں بیسویں صدی کئی حوالوں سے اہمیت کی حامل ہے۔اس صدی میں دنیا کا سمٹ کر ''گلوبل ویلیج'' کا روپ دھارنا، سائنسی ایجادات کی کرشمہ سازیاں اور سیاسی انقلابات نے اقدار کے پیمانے اور سوچوں کے زاویے بدل دیے ہیں۔ان بین الاقوامی تغیرات کی زد میں برعظیم بھی آیا، تو مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ مملکت انگریزوں کی نوآبادی بن گئی۔ نئے حکمرانوں نے عسکری محاذ پر ہی مسلمانوں کو شکست نہیں دی، بلکہ تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی میدان میں بھی پورے معاشرتی نظام کو تہ و بالا کر دیا۔ادب میں اپنی روایات اور افکار کی پرداخت کے لیے جو سلسلہ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے ذریعے شروع کیا تھا بعد میں وہ مختلف انداز سے جاری رہا۔اس کے ردِّ عمل اور حمایت میں اٹھنے والی لہریں بھی مختلف صورتوں میں جاری رہیں۔لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد سر سید احمد خان نے جس جدیدیت کی بنیاد ڈالی اس کے اثرات اس صدی میں واضح طور پر محسوس ہونے لگے۔یہ جدیدیت ایک زیادہ جامع اور دیرپا اثرات کے ساتھ دراصل مغرب کی عمل داری ہی کی ایک صورت تھی۔ادب میں اس نئے انداز اور رجحان نے فکر و فن، موضوعات اور اصناف پر گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اُردو ادب میں اصناف کی اکثریت اسی ماحول میں وجود پذیر ہوئی۔

کشمیر برعظیم کا دھڑکتا ہوا دل اور اپنی قدرتی خوب صورتی اور جغرافیائی حیثیت کے باعث بڑی اہمیت کا حامل علاقہ ہے۔کشمیر کی اسی اہمیت کے باعث یہاں سیاحوں اور غیر ملکیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تو قبل مسیح سے جاری تھا، جسے چینی سیاح فائیاں نے باقاعدگی دی اور جان فاسٹر (اٹھارہویں صدی کے آخر میں) تک کئی سیاح آئے، مگر انیسویں اور بیسویں صدی میں سیاحت کشمیر میں بہت تیزی آئی۔انیسویں صدی کے آغاز میں تھامس مور اور ولیم مور کرافٹ سے ٹنڈل بسکو اور آئین سٹیفن تک سینکڑوں مبلغین، سیاح اور صحافی کشمیر آئے۔ان انگریزوں کی یہاں آمد اپنے اپنے مقاصد کے تحت تھی اور واپسی پر کئی ایک نے اپنے سفرناموں اور یادداشتوں کی اشاعت سے کشمیر کی تاریخ، جغرافیے اور سیاست کے ایسے ایسے گوشے متعارف کرائے کہ یہی جدید تاریخ کشمیر اور حالات کے حوالے سے اب بنیادی مآخذ ہیں۔اس طرح تقسیم برعظیم سے قبل کشمیر میں اُردو ادب کی بیشتر اصناف کے لیے راہ ہموار ہوئی، جن میں آپ بیتی بھی شامل ہے۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کو بطور الگ صنفِ ادب متعارف کروانے کا آغاز اسی صدی میں ہوا۔اگرچہ کشمیر کے اُردو ادب میں آپ بیتی کے نقوش اٹھارہویں صدی میں تخلیق ہونے والے شعری ادب میں موجود ہیں۔اس ضمن میں ایک اہم حوالہ ''گلزارِ فقر'' ہے جو غلام محی الدین میرپوری نے ۲۲-۱۷۲۱ء میں تخلیق کی۔لیکن یہ نقوش مثنوی کی داستانوی فضا اور جگ بیتی کے ماحول میں بہت زیادہ واضح نہیں ہوئے۔اس دور کی شاعری کے بعد اٹھارہویں صدی ہی کے وسط میں مغربی سیاحوں کے ساتھ اُن کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے والے بعض مقامی افراد نے اپنے مشاہدات تحریر کیے۔رسول گلوان کی آپ بیتی "Servant of

"the Sahibs"اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔ رسول گلوان ریاست کا پہلا باشندہ تھا، جس نے اس عہد میں اپنی آپ بیتی لکھی۔ اگر چہ یہ آپ بیتی گلوان نے انگریز سیاح رابرٹ براٹ کی رہنمائی میں انگریزی زبان میں لکھی، لیکن اسے اُردو آپ بیتی کے لیے راہ ہموار کرنے والی اہم تصنیف کہا جاسکتا ہے۔ اُردو نثر میں آپ بیتی کا آغاز سفرناموں کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں ''سفر نامہ مہتہ شیر سنگھ''، ''سفر نامہ عزت اللہ'' اور ''تحفہ سالک'' وغیرہ اس حوالے سے اہم ہیں۔ یہ سب سوانحی ادب آپ بیتی کے عناصر اور نقوش کا حامل ہونے کے باوجود فنی اور فکری اعتبار سے ایک مکمل آپ بیتی کی صورت میں نمایاں نہیں ہوا۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا آغاز اسی سوانحی اور تاریخی ادب کی کوکھ سے ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور بیسوی صدی کے آغاز میں کشمیر کے اُردو ادب کے حوالے سے اہم نام منشی محمد دین فوق کا ہے۔ محمد دین فوق ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، ناول نگار، صحافی اور کشمیر میں اُردو کے پہلے آپ بیتی نگار کی حیثیت سے انھوں نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ فوق کا عہد برِعظیم میں اُردو آپ بیتی کا ابتدائی دور تھا۔ اُردو آپ بیتی انیسویں صدی کے آخری عشروں میں مذہبی اور تاریخی قسم کی تھی۔ مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' جسے برِعظیم میں اُردو کی پہلی آپ بیتی کہا جاتا ہے۔ بزرگانِ اسلام کے برِعظیم میں کارناموں اور ان کی اسیری کی داستان ہے۔ یوں اس کا بنیادی مقصد آپ بیتی نہیں تھا۔ اسی طرح ''داستانِ غدر'' (ظہیر دہلوی)، ''میرا افسانہ'' (چودھری افضل حق) سے مولانا ابوالکلام آزاد کی ''تذکرہ'' تک یہی مذہبی فضا، تاریخی ماحول اور سیاسی وسماجی حالات آپ بیتیوں کا لوازمہ تھے۔ ان آپ بیتیوں کی فضا واضح طور پر بتاتی ہے ان کے مصنفین آپ بیتی کو اپنی ذات کے تجربات تک محدود کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ ذات کے پس منظر میں خاندان کے صدیوں پرانے تجربات اور روایات کا بیان اور ملک اور قوم کے احوال کا تفصیلی اظہار لازمی امر جانتے تھے:۔

> ''اپنی سرگزشت و روئیدادِ عمر لکھوں تو کیا لکھوں۔ ایک نمودِ غبار و جلوہ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیوں کر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں اور ہوا میں غبار اُڑتا ہے۔ طوفان نے درخت گرادیے، سیلاب نے عمارتیں بہادیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کردی۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چند تنکے جمع کیے۔ خرمن و برق کا معاملہ، آتش وخس کا افسانہ، ان سب کی سرگزشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجیے میری سوانح بھی انھی میں مل جائے گی۔ نصف فسانہ امید اور نصف ماتم ویاس''۔(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد کے اس شعری نثر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے عہد تک آپ بیتی کا مقصد تحریر کسی طرح کی بھول بھلیوں میں کھویا تھا۔

محمد دین فوق اسی فضا میں، لاہور میں قیام پذیر ادب اور صحافت کی خدمت میں مصروف کار تھے۔ تاریخ ان کی دلچسپی کا موضوع تھا اور کشمیر کی تاریخ اور تہذیب کا ہر رنگ و آہنگ آشکار کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ صحافت ان کا ذریعہ اظہار بھی تھا اور یہی اسلوب بیان بھی۔ چناں چہ اس ماحول اور حالات میں کشمیر میں اُردو کی پہلی آپ بیتی ''سرگزشتِ فوق'' منظر عام پر آئی۔ تاریخی، مذہبی حالات اور اہلِ علم و اہلِ قلم کے تذکروں پر مبنی یہ آپ بیتی فوق کی ذات سے زیادہ ان کے عہد کو بیان کرتی ہے۔ فوق ساری زندگی سفر میں رہے۔ وہ برعظیم کی ساری ریاستوں میں پھرتے رہتے تھے۔ چناں چہ ان کی آپ بیتی میں سفرنامے کے عناصر بھی کافی ہیں۔ علاوہ ازیں احباب، سیاسی و سماجی شخصیات اور علمی و ادبی مشاہیر سے ملاقاتوں اور خطوط کی جھلک بھی ان کی آپ بیتی کے اہم موضوعات ہیں۔

آپ بیتی کا اصل موضوع اور محور پہاڑ ہوتے ہیں نہ جنگل، حالات زمانہ اور نہ ہی سیاست حاضرہ بلکہ اپنی ذات ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان ان سب سے الگ تھلگ بھی نہیں ہوتا مگر بنیادی بحث فرد کی ذات، شخصیت، اس کا فکری اور روحانی ارتقا اور اس سے جڑے بیرونی عناصر ہوتے ہیں۔ جب مغرب میں روح کے سوا کوئی چیز حیرت انگیز نہیں۔ جیسے حقائق منکشف ہوئے تو آگسٹن نے ''اعترافات'' کے ذریعے بتایا کہ ''باہر نہ جاؤ، اپنے آپ سے رجوع کرو کہ انسان کا دل ہی سچائی کا مسکن ہے'' (۲) چناں چہ انھوں نے ذات کو مرکز بنایا مگر مشرق اور بالخصوص برعظیم میں صورت حال ابھی اس سے بہت پیچھے تھی۔ یہاں آپ بیتی، سفرنامے، تاریخ اور دیگر اصناف اور موضوعات سے خلط ملط، خارجی حالات کے بیان تک محدود صورت میں تصنیف ہو رہی تھی۔ لہٰذا اسی فضا میں سرگزشت تصنیف ہوئی۔ فوق کی سرگزشت کو اوّلیت کے علاوہ کسی بڑی پیش رفت کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فوق چوں کہ صحافی تھے اور زودنویس بھی لہٰذا ان کی آپ بیتی میں اسلوب بیان کی ندرت بھی نہیں ہے۔

اُردو ادب میں تقسیم برعظیم کے اثرات کئی حوالوں اور انداز میں جلوہ گر ہوئے۔ یہاں خوشیاں اور مسرتیں بھی ہیں اور جدائی، فسادات اور قتل و خوں کے ماتم بھی۔ انفرادی کرب کا اظہار بھی ہے اور اجتماعی دکھ درد بھی موجود ہے۔ تقسیم برعظیم کے بعد تمام اصناف بہت دیر تک اور بہت دور تک اسی فضا میں رنگی ہوئی ملتی ہیں۔ کشمیر کے افق پر یہ تقسیم پریشانیوں، غموں اور دکھوں کے اور زیادہ گہرے بادلوں کے ساتھ طلوع ہوئی۔ یہاں اس کے نتیجے میں نہ آزادی کی مسرت حاصل ہوئی اور نہ خودمختاری کا اعتماد۔ اس خطہ کے وسط میں خونی لکیر کھینچ کر جغرافیے، تہذیب، رشتوں، رنگوں، جذبوں اور خوابوں کو بھی تقسیم کر دیا گیا۔ اس لیے تقسیم اس کے اثرات یہاں کے باسیوں کے ہاں زیادہ شدید تھے۔ قدرت اللہ شہاب کی ''یا خدا''، محمود ہاشمی کی ''کشمیر اداس ہے''، کرن جیت لال سہگل کی ''داستان ہزار دن'' اور اسی طرح کی متعدد تصانیف اسی کرب کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔

تقسیم کے بعد کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے نقوش سفرناموں، رپورتاژ، افسانوی ادب اور دیگر اصناف میں ملتے ہیں۔ سلگتے چناروں اور جلتے بجھتے مناظر سے نظر ہٹتی نہیں تھی کہ انھیں چھوڑ کر کوئی خالصتاً ذات کو موضوع بنائے۔ مگر یہ اظہار جس جس

روپ میں ہواوہ ذاتی احساسات اور جذبات سے بھرپور ہونے کے باعث انھیں آپ بیتی سے جوڑتا ہے۔اس صورت حال میں کشمیری ادیب دوسروں کے کرب ودرد کے اظہار کی صورت میں دراصل اپنا غم بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں غیر شعوری طور پر ہی سہی وہ اپنے اندر جھانکنے پر مجبور ہوئے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جب وہ آپ بیتی لکھنے بیٹھے تو پھر وہی خارجی حالات کا بیان اور سیاسی معاملات کوموضوع بناتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ بیرونی حالات کا دباؤ اور آپ بیتی کی بین الاقوامی صورت سامنے نہ ہونا تھا اور برعظیم میں تو یہی چلن عام تھا۔

چودھری غلام عباس، سردار محمد ابراہیم خان، ڈاکٹر کرن سنگھ، میر قاسم،، شیخ عبداللہ اور اس عہد کے دیگر آپ بیتی نگار انکشاف ذات اور اظہار ذات سے زیادہ جگ بیتی، تاریخ، تہذیب اور حالات وواقعات کے علاوہ موجودہ صورت حال میں اپنے کردا کا جواز پیش کرنے تک محدود ہیں۔ چوں کہ یہ سب آپ بیتی نگار سیاست دان تھے۔ان کے ہاں گہری اور اندر کی بات کہنے کا ڈھنگ تھا نہ اسلوب۔انھیں اپنے رویے اور کردار کا جواز پیش کرنا تھا، جس کے لیے دلائل انھیں خارج سے ہی لینے تھے۔ چناں چہ شیخ عبداللہ، میر قاسم، کرن سنگھ اپنے اپنے انداز میں، کشمیریوں کو منزل آزادی سے دور کرنے کے جرم سے بری الذمہ ہونے اور دوسروں پر الزامات لگانے میں مصروف ہیں جب کہ غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم خان عوام کی اکثریت کا، مخالفین کے فریب کا شکار ہونے والوں کا ساتھ دینے کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔

مشرق ومغرب کے تمام نقاد آپ بیتی میں سچائی کے بیان کو پہلی شرط قرار دیتے ہیں۔ جانسن اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''سب سے زیادہ قابل قدر بیانات وہی ہیں، جس میں مصنف اپنی داستان بیان کرتا ہے''۔(۳) مگر کشمیر میں اس ابتدائی دور کے آپ بیتی نگار چوں کہ سیاست دان تھے اور ان میں سے بعض اصحاب خود پرستی اور انا کے بڑے اونچے مقام پر فائز، چناں چہ اس عہد کی آپ بیتی نگاروں کی اکثریت کے ہاں اس پہلی اور بنیادی شرط کو اپنی آپ بیتیوں میں نظر انداز کیا گیا۔ ایسی صورت حال کا سب سے زیادہ لوازمہ شیخ عبداللہ کی ''آتش چنار'' میں ملتا ہے، جہاں انھوں نے اپنی خودساختہ عظمت اور ساکھ کو اپنے بعد بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، مگر وقت اور حالات اور تحقیق اور تنقید نے حقائق کو منظر عام پر لا کر ''آتش چنار'' اور اس طرح کی دوسری آپ بیتیوں کے لوازمہ پر سوالیہ نشان کھڑے کر دیے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ملازم خاص کے سامنے ہیرو نہیں بن سکتا تو اپنی نظر میں اس کا ہیرو بننا اور بھی مشکل ہے۔ چناں چہ اس دور کی آپ بیتیوں کے تضادات ان کے لکھنے والوں کا منہ بھی چڑھاتے ہیں۔انسان کی زندگی میں اس جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ وقت اور حالات کی مجبوری بھی ہو سکتے ہیں مگر آپ بیتی لکھتے ہوئے اُسے ان مجبوریوں سے اوپر اٹھ کر غیر جانب داری سے اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ آپ بیتی میں انا کے خودساختہ پہاڑوں کو سر کرنا ضروری ہے ورنہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے اور بھونڈی نمائش کے سوا کچھ نہیں رہتا۔اس حوالے سے اس عہد میں کشمیر کی اُردو آپ بیتی کوئی عمدہ مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔''متاعِ زندگی'' (سردار محمد

ابراہیم خان)، ''کشمکش''(چودھری غلام عباس)اور''ولی عہد''(ڈاکٹر کرن سنگھ) کے علاوہ اس عہد کی دیگر آپ بیتیاں اپنی ذات کے اصل رنگ اور اجتماعی صورت حال کی اصل تصویر پیش کرنے کی خوبی سے خالی ہیں۔

ڈاکٹر سید شاہ علی کے مطابق:''انسان کے لیے اپنے فطری حجاب اور خود پسندی کے درمیان توازن برقرار رکھنا ایک مشکل ترین امر ہے''۔(۴)اس حوالے سے کسی قدر توازن برقرار رکھنے والی کشمیری آپ بیتی کی روایت میں جو آپ بیتیاں تصنیف ہوئیں وہ بیسویں صدی کے چھٹے عشرے سے آٹھویں عشرے تک کے دورانیے میں منظر عام پر آئیں۔''بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل''میں شورش کاشمیری نے ذات کے بیان کو محدود رکھا ہے، مگر جس قدر ہے اس میں سچائی کا عنصر نمایاں ہے۔اجتماعی امور کے بیان میں اور حالات و واقعات کی تفصیل میں بھی وہ اپنے طرز بیان سے اصل سے قریب نظر آتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب کی''شہاب نامہ''پر یوں تو بہت سے اعتراضات بھی کیے گئے ہیں۔اپنی ذات کی عظمت، دوسروں کی کردار کشی وغیرہ لیکن شہاب کے خوب صورت اسلوب بیان، صاف گوئی اور انکشاف ذات کی کوشش نے''شہاب نامہ''کو اُردو کی کثیر الاشاعت آپ بیتی بنایا ہے۔حسن اور سچائی کے بغیر ایسا ممکن نہیں ہے۔کسی آپ بیتی کو دوسری تصانیف سے منفرد کرنے کے لیے اس کا طرز بیان اہم ہوتا ہے۔''شہاب نامہ''اپنے اسلوب کے ساتھ ساتھ لوازمے کے اعتبار سے بھی انفرادیت کی حامل آپ بیتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب کا عہد اُردو ادب میں کئی تحریکوں کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے، جن میں ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق، تحریکِ ادب اسلامی اور پاکستانی ادب کی تحریک شامل ہیں۔قدرت اللہ شہاب کے ذہنی ارتقا اور ادب میں ان سب کے اثرات موجود ہیں۔''شہاب نامہ''چوں کہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی کی بھی داستان ہے اور ان کے ادبی سفر کی بھی کہانی۔ لہٰذا اس میں معاشرتی رویوں سے بغاوت سے لے کر روحانیت کے دامن میں پناہ تک کی ساری سرگزشت ایک عمدہ پیرائیہ بیان میں سمٹ آئی ہے۔یوں''شہاب نامہ''میں ادب کے عصری رجحانات، تحریکوں کے اثرات سمیت مذہبی، سیاسی، تاریخی اور علمی و ادبی منظر نامے کی پوری پون صدی کی جھلک موجود ہے۔اپنے ان وسیع مظاہر کی بنیاد پر''شہاب نامہ''کشمیری آپ بیتیوں میں ہی نہیں بلکہ اُردو ادب کی ایک عمدہ آپ بیتی ہے۔''شہاب نامہ''نے آپ بیتی کی روایت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔اس کے بعد اکیسویں صدی کے پہلے عشرے تک شعوری اور لاشعوری طور پر کسی نہ کسی انداز میں اس کی تقلید کی گئی۔

بیسویں صدی کے آخری عشرے عالمی سطح پر کئی حوالوں سے ہنگامہ خیزی کا شکار رہے۔اس دور میں صدیوں سے جبر کا شکار کئی اقوام آزادی کی نعمت سے ہم کنار ہوئیں۔روس کی افغانستان میں شکست نے اس کے حصے بخرے کر دیے۔بین الاقوامی سیاست میں طاقت کا توازن بگڑا۔امریکہ واحد بڑی طاقت کے طور پر سامنے آیا تو اس نے اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے نئے پیمانے بنانے شروع کیے۔اس صورت حال میں کشمیر کے نوجوانوں نے اپنی آزادی کے لیے عملی جدوجہد شروع کی۔ اسّی کی دہائی میں کشمیر کی سرزمین پر شروع ہونے والی جدوجہد آزادی، جس کو پاکستان، عالم اسلام اور دنیا بھر کی آزادی پسند اقوام

کی پشت پناہی حاصل ہوئی کئی حوالوں سے اہم ہے۔اس تحریک کو آغاز میں ہی کامیابیاں نصیب ہوئیں۔اگر چہ وقت اور حالات کے باعث یہ تحریک کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہ ہوسکی،مگر اس کے اثرات دیرپا اور کثیر جہتی ہیں۔بیسویں صدی کے آخری عشروں کے کشمیر میں اُردو ادب میں بھی آزادی کی یہ صدا بھرپور انداز میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتیاں،اس دورانیے میں مختلف اقسام اور صورتوں میں منظر عام پر آئیں۔سید علی گیلانی کی ''رودادِ قفس'' اور امان اللہ خان کی ''جہدِ مسلسل'' آزادی اور حریت کی تحریک کی تاریخ بھی ہیں اور تعبیر بھی۔یوں یہ اور اس طرح کی دوسری آپ بیتیاں کشمیر میں مزاحمتی ادب کا بھی اہم حصہ ہیں۔مزاحمت دنیا کے ہر ادب کی ایک توانا روایت ہے۔کشمیر میں آزادی کی جدوجہد صدیوں پرانی ہے،مگر یہ جدوجہد نئے عہد میں زیادہ شدت کے ساتھ شروع ہوئی۔بیسویں صدی میں دومرتبہ اس کی شدت میں اضافہ ہوا۔تقسیم ہند کے موقع پر کشمیری آزادی کے بہت قریب تھے۔رسم دنیا بھی چل نکلی تھی،موقع بھی تھا اور حالات بھی،مگر وائے ناکامی قسمت کہ اب کی بار اپنوں کا دین وایمان اور فہم وفراست مات کھا گئی۔چناں چہ برعظیم کے اربوں انسانوں کو تو آزادی کی خوشیاں نصیب ہوئیں،مگر کشمیریوں کی لازوال قربانیوں اور کاوشوں کا حاصل منزل مراد تک نہیں پہنچ پایا۔

پھر ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب دنیا میں آزادی کی تحریکوں کو کامیابیاں نصیب ہونے لگیں،تو کشمیریوں نے ایک بار پھر عزم سفر باندھا اور مسلّح جدوجہد کا آغاز کیا۔بیسویں صدی میں کشمیریوں کی آزادی کے لیے ہونے والی دونوں تحریکوں کا عکس یہاں کے ادب میں مزاحمت کی صورت دیکھا جاسکتا ہے۔کشمیری ادیبوں،شاعروں اور دانشوروں نے اپنے قلم کی عصمت کو سر بلند رکھنے کے لیے اپنے حصے کا فرض ادا کیا ہے۔احترام آدمیت،انسانی حقوق،جمہوریت اور کشمیریوں کی حق خودارادیت کے علم کو سر بلند رکھنے کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنایا۔

دوسری اصناف سے قطع نظر آپ بیتی میں علی گیلانی کی ''رودادِ قفس'' اہم تصنیف ہے،جو تحریک آزادی کے اس مرحلے کی تاریخ بھی ہے اور تفسیر بھی اور گیلانی کی زندگی کی داستان بھی۔علی گیلانی کی ساری زندگی جدوجہد آزادی سے عبارت ہے۔اپنی زندگی کے بہترین سال اسی جرم میں جیلوں میں گزار چکے ہیں۔اپنی تقاریر میں وہ یہ اعلان کرتے ہیں:۔

> ''میں بھارت کے ساتھ کشمیر کے نام نہاد الحاق کو نہیں مانتا۔میں بھارتی سامراج کا باغی ہوں اور بغاوت کے جرم میں مجھے پھانسی کا پھندا بھی چومنا پڑے تو اس کو اپنی سعادت سمجھوں گا''۔(۵)

''رودادِ قفس'' کی سطر سطر میں بھی اسی بے باک لہجے اور جرأت رندانہ کا اظہار موجود ہے۔یوں یہ ایک فرد کی آپ بیتی ہی نہیں رہتی بلکہ تحریکِ آزادی کی داستان،اس عظیم جدوجہد کی کہانی اور اس سے بڑھ کر بھارتی استعمار کے خلاف مظلوم کشمیریوں کی غلامی کا مقدمہ بن کر عالمی ضمیر کی عدالت میں سراپا احتجاج ہونے والی تحریر ہے۔بھارت کے ظلم کے خلاف خود اس کے قفس

کے شکنجوں سے بلند ہونے والی یہ گواہی اور داستانِ عزیمت کشمیر کے مزاحمتی ادب کا ایک بڑا حوالہ ہے۔اس عہد کی آپ بیتیوں کی دوسری قسم میں کلیم احمد کی ''ریت پہ قدموں کے نشان''، ثریا خورشید کی ''چناروں کے سائے'' کے انداز کی آپ بیتیاں ہیں، جو نیم تاریخی اور نیم ادبی نوعیت کی ہیں۔ان شخصیات کا ادب سے بھی تعلق تھا اور کشمیر کی تاریخ، تہذیب اور تحریک سے بھی۔ چناں چہ اس قسم کی آپ بیتی کا اسلوب بیان انھیں کسی قدر ادبی انداز اپنانے کے لیے اکساتا ہے۔موضوعات اور مواد میں ذات کے علاوہ کشمیر بھی موجود ہے۔ یہ آپ بیتیاں جدید رجحانات کے مطابق اختصار کی طرف مائل نظر آتی ہیں، مگر کوئی دیرپا نقوش نہیں چھوڑ پاتیں۔ کسی آپ بیتی کی نوعیت واہمیت یا تو اس کے لوازمے کے باعث ہوگی یا اسلوب بیان کی خوب صورتی اور انفرادیت سے، مگر ان آپ بیتیوں میں کوئی ایک بھی پہلو زیادہ بلندی پر فائز نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر ان آپ بیتیوں کی انفرادیت نمایاں ہو سکے۔

تیسری قسم کی آپ بیتیوں کے لکھنے والوں میں سیاسی شخصیات اور سرکاری ملازمین شامل ہیں۔ ''کاروانِ یوسف'' (محمد یوسف چودھری)، ''زندگی ہے یا کوئی طوفان'' (بشیر احمد صدیقی)، ''تنگ آمد'' (سردار محمد ایوب خان) اور اس نوع کی دوسری آپ بیتیوں میں فکر ونظر کی کوئی گہرائی ہے اور نہ ہی اسلوب بیان کی انفرادیت۔انکشاف ذات کا پہلو اور نہ ہی شخصیت کی تعمیر اور تشکیل کے عوامل کی تعبیر وتشریح۔بس ایک سپاٹ انداز بیان میں زندگی کی روداد قلم بند ہوئی ہے، جس کی اہمیت محدود اور انفرادیت مشکل نظر آتی ہے۔ایک ایسا شخص جس کو زمانے اور معاشرے نے مانا ہو، مگر وہ خود اُسے صدمے پہنچانے کا باعث بنا ہو اور اب معذرت خواہ ہو، معافی اور بحالی کا خواستگار ہو، اپنے طرزِ عمل کا جواز پیش کرے اور چاہے کہ اس کے اقدامات کی تلافی ہو۔ایسی آپ بیتیاں لکھنے والوں میں سیاست دان، ملازمت پیشہ افراد اور دوسری معاشرتی مقام رکھنے والی شخصیات شامل ہوتی ہیں۔ان کے اپنے اپنے دائرہ کار اور شعبہ ہائے زندگی ہیں۔جن لوگوں کی آپ بیتیوں میں سماجی حیثیت کا بے جا زعم آشکار ہوتا ہے وہ بھی انھی شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے افراد ہوتے ہیں۔اس عہد میں منظر عام پر آنے والی کشمیری آپ بیتی کی یہ قسم اس طرح کی آپ بیتیوں پر مشتمل ہے۔

بیسویں صدی کے آخری عشروں میں چوتھی قسم کی آپ بیتی اہم اور فنی ابلاغ کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہیں۔اپنے آپ کو دریافت کرنے کی کاوش، ایک اندرونی مسرت کا باعث ہوتی ہے۔یہی عمل پھر انسان کے اندر معاشرے سے فرار یا اپنی ذات کے غرور میں مبتلا کرنے کا باعث بھی بنتا ہے اور انسان کو اپنے اصل مقام سے آشنا کرنے کا بھی۔کیوں کہ ''تمام فنی دریافت دہشت اور مسرت کا درمیانی یا ملا جلا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ جسے گوئٹے نے Shudder کا نام دیا تھا۔ یہ انکشاف یا فخر ایسی ہی پیچیدہ ضرورت کا احساس پیدا کرتا ہے۔جیسا بچوں میں ہوتا ہے''۔(۶)

کشمیری ادب میں اس قسم کی آپ بیتیوں میں اہم ''تمنا بے تاب'' ہے۔رشید امجد نے اپنے عمدہ ادبی اسلوب میں صداقت اور سچائی کے ساتھ اپنے زندگی کے سفر اور مشاہدات کو عہد کے ساتھ گھلا ملا کر اپنی آپ بیتی کا نقشہ مرتب کیا ہے۔اسی وجہ

سے ''تمنا بے تاب'' ایک عہد کا علمی و ادبی تاریخ، رجحانات اور رویّوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جگ بیتی کے اس عنصر کو ڈاکٹر رشید امجد نے آپ بیتی سے الگ نہیں ہونے دیا ہے۔ اسی لیے یہ ادبی منظر نامہ غیر ضروری اور غیر متعلق نہیں ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے جس عہد میں افسانہ نگاری شروع کی وہ اُردو ادب جدید رجحانات اور تحریکات کی دخل اندازی کا وقت تھا۔ حقیقت نگاری کی جگہ شعور کی رو اور دوسری مغربی تحریکات زور پکڑ رہی تھیں۔ حقیقت نگاری خارجی حقائق بیان کرنے کی طرف راغب تحریک تھی، مگر جدید اور نئی تحریکات داخلی کیفیات کو نئے پیراہن میں بیان کرنے پر مصر۔ رشید امجد حقیقت نگاری سے سفر شروع کر کے تجریدیت اور تمثالیت تک پہنچا ہے۔ اس ارتقائی سفر نے رشید امجد کے اسلوب بیان پر بھی اثرات ڈالے ہیں:۔

> ''رشید امجد کا اسلوب لفظیات کا ایک منفرد نظام اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور یہ انفرادیت
> اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ لفظوں کو ان کے اصل معانی کے بجائے ایک اور مختلف
> صورت میں سامنے لاتا ہے، جہاں اشیا اور محسوسات کو تجسم حاصل ہو سکے اور حسی سطح پر
> ادراک کا عمل پیدا ہو''۔(۷)

ڈاکٹر رشید امجد اپنی آپ بیتی میں بھی فکر و فن کے اپنے روایتی انداز کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ ''چوں کہ رشید امجد کے تفکرات میں بنیادی تفکر خود اپنی تلاش ہے'' (۸) اس لیے آپ بیتی ہو یا افسانہ نگاری اس کے ہاں داخل سے خارج اور خارج سے داخل کی طرف سفر کا تیز رفتار عمل جاری رہتا ہے۔ اپنے اسی منفرد اسلوب بیان اور عمدہ علمی و ادبی لوازمے کے باعث ''تمنا بے تاب'' کشمیری آپ بیتی کی روایت کا منفرد حوالہ ہے۔

اکیسویں صدی کا آغاز بڑے ہی ہنگامہ انگیز صورتِ حال میں ہوا۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے اوپر ہونے والے دھماکوں نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ دھماکے دراصل نتیجہ تھے اس بے چینی کا جو بیسویں صدی کے آغاز میں شروع ہوئی اور اس صدی کے اختتام پر اپنے نقطہ عروج کو پہنچی۔ یہ بے چینی مغرب کی بے مہار سائنسی ترقی کے نتیجہ میں اور اس کے مادی نظریات کی روشنی میں پروان چڑھنے والی تہذیبی بدامنی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ مغرب کی موجودہ صورت حال کا آغاز نشاتِ ثانیہ کے ظہور سے ہوا، جب مغرب نے اپنے ماضی کو مسترد کرتے ہوئے مستقبل کے لیے جس شاہراہ کا انتخاب کیا اس کے سنگ ہائے میل میں تحریک احیائے علوم، تحریک اصلاح، انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب تھے۔ ان مراحل سے گزر کر اہلِ مغرب جس منزل پر پہنچے وہ اگر چہ انسانی تاریخ میں پہلی اور نئی منزل تھی، جس نے پوری دنیا کو حیرتوں میں گم کر دیا اور مغرب کو اعتماد اور فخر کے اس مقام پر پہنچا دیا کہ جہاں سے ہو کر اس کی نظر کسی اور پر نہ پڑتی تھی۔ مادیت اور سائنس کی اس معراج نے اسے پوری دنیا کا مطلق العنان بادشاہ بنا دیا، مگر جلد ہی یہ حقیقت سب پہ واضح ہونے لگی کہ مغرب نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے وہ انسانیت کی فلاح اور نجات کا راستہ نہیں ہے۔ انیسویں صدی میں مغرب کے طرزِ عمل کے خلاف بڑے پیمانے پر تنقید ہونے لگی۔ بیسویں

صدی میں ایٹم بموں کے استعمال نے مغرب کی سائنسی ترقیوں کے راز بھی سب پر واضح کر دیئے۔ بیسویں صدی میں سب پر یہ آشکار ہو گیا کہ اپنی تمام ترفتوحات اور ترقی کے باوجود مغرب انسانیت کی بے چین روح کو قرار نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر میں آزادی کی تحریکوں اور مغرب کے خلاف احتجاج نے اُسے دوسری تہذیبوں اور تصورات زندگی کے مطالعہ کی جانب راغب کیا تا کہ اپنی تہذیب کی بقا کا ساماں کر سکے۔ تہذیبوں کے درمیان تصادم کی صورت پیدا کرنے کا مقصد مغرب کے پیش نظر اپنی جوازیت اور لڑاؤ اور خود حکومت کرو کی پرانی حکمت عملی سے جڑا تھا۔ لیکن عہد جدید میں خود اپنے ضمیر اور عوام کے سامنے اب مغرب لا جواب تھا اور ساری دنیا میں بھی اس کی حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ سلیم احمد اپنے ایک مضمون میں محمد حسن عسکری کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> ''مغرب پوری انسانی تاریخ میں ایک ایسا تجربہ تھا، جو اپنے وقت پر ناگزیر ہونے کے باوجود کوئی قائم رہنے والی چیز نہیں تھا۔ مغرب اپنے سارے امکانات ظاہر کرنے کے بعد اپنی اصل شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس نے انسانیت کو جو کچھ دیا وہ اس سے کہیں کم ہے جو اس نے انسانیت سے چھینا ہے اور مغرب کو خود یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ نشاتِ ثانیہ کے بعد ایک غلط راستے پر چل پڑا تھا''۔(۹)

چناں چہ ۱۱رستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات پوری دنیا میں مغرب کے خلاف موجود نفرت، حقارت اور غم و غصے کا عملی اظہار تھے۔ اس نے اگر چہ مغرب کو ایک نئی صف بندی کا موقع فراہم کیا ہے، مگر انسانی ذہن اور شعور کو کسی غیر حقیقی اور غیر فطری اقدام اور دلیل سے مطمئن نہیں کیا جا سکتا۔

اس بین الاقوامی صورت حال میں اُردو ادب اپنے لیے کسی الگ شناخت اور مؤقف کے حوالے سے کوئی فیصلہ نہ کر سکنے کی کیفیت سے دوچار رہے۔ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کا کشمیری ادب اور بالخصوص آپ بیتی عجیب کیفیت کا شکار نظر آتی ہے۔ اس دوران یوں تو متعدد آپ بیتیاں تصنیف ہوئیں مگر ان میں فکر و فن اور اسلوب و انداز میں کسی منفرد آپ بیتی کی مثال نہیں ملتی۔ کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سفر میں اس عہد کے ابتدائی سالوں میں بشیر حسین جعفری کی اڑھائی ہزار صفحات پر محیط تین جلدوں میں ضخیم آپ بیتی ''زندہ باد''، ''پائندہ باد'' اور ''تابندہ باد'' کے ناموں سے منظر عام پر آئی ہے۔ آپ بیتی کے لوازمے اور موضوعات کے بارے میں عملی اور نظریاتی ہر سطح پر اختلاف رائے موجود ہے:۔

> ''اکثر نقادوں نے آپ بیتی کو اپنی ذات تک محدود کرنے پر زور دیا ہے۔ ایک فرد کی زندگی کے واقعات، اس سے جڑے ہوئے معاملات اور روح اور کردار کی تصویر کشی

تک اس کا دائرہ کار ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے کا کام دوسروں کے کردار پیش کرنا اور تاریخ اور سیاست سے لے کر معیشت اور معاشرت پر تبصرہ نگاری کرنا نہیں ہے۔ اُس کا پہلا فرض اپنے دل کو آئینہ دکھانا ہے''۔(۱۰)

بعض حضرات کا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ زندگی ایک سفر ہے اور آپ بیتی نگار کو اس سفر کے مشاہدات، افعال، ماضی کی یادوں، احباب اور مشاہیر سے ملاقاتوں اور ان کے کردار و گفتار سے لے کر زندگی کی رہگزر میں پیش آنے والے جملہ معاملات کو بیان کرنا چاہیے۔ بشیر حسین جعفری دوسرے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ چناں چہ ان کی آپ بیتی اسی فکر کی ایک مثال ہے، مگر آپ بیتی میں واقعات زندگی کا انتخاب اہم چیز ہے۔ اگر انسان فرضی پیرائے اور افسانوی انداز میں چاہے تو ایک دن کی مصروفیات پر سیکڑوں صفحات لکھ سکتا ہے، مگر آپ بیتی سفر زندگی سے نمایاں اور اہم واقعات کے انتخاب کا تقاضا کرتی ہے۔ چوں کہ زندگی میں بہت سے واقعات، افکار اور افعال ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں، جن کا زندگی پر کوئی نتیجہ خیز اثر نہیں پڑتا۔

اس دورانیے میں لکھی جانے والی کشمیری آپ بیتیوں کی اکثریت اسی نوعیت کی ہے۔ ''زندہ باد''، ''پائندہ باد'' کے علاوہ ''نقش بر آب'' از محمد یوسف چودھری، ''زندگی جبرِ مسلسل'' از شریف طارق، ''میری یادیں'' از فضل شوق، ''باغ شیری سے بریڈ فورڈ تک'' از ایم سلیم وغیرہ میں شجرہ نسب سے ابتدا کرتے ہوئے سفر و حضر کے واقعات، علاقے، خاندان، ملک اور معاشرت کے رنگوں کو سمیٹتے ہوئے سیاست اور تاریخ تک سبھی موضوعات اور اصناف کے عناصر سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ آپ بیتی کی ایسی مثالیں ہیں جن کے مصنفین داد کے طالب اور اپنے تخصص سے آگاہ کر کے توجہ اپنی جانب مبذول کروانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ''حاصل عمرِ رائیگاں'' از یعقوب شاہق، ''دعا کر چلے'' از اکرم طاہر، ''یادوں کے شیریں نقوش'' از مسز مقبول حمید ، ''داستانِ حیات'' از محمد حیات خان، اور ''وُلر کنارے'' از سید علی گیلانی کے مصنفین اپنے اپنے دائروں میں پیش کیے جانے والے طرز عمل کی قدرے اچھی مثال اور جواز پیش کرتے ہیں۔ اکثر کے ہاں وقت اور حالات کی مہربانیوں اور کرم فرمائیوں کے باعث زندگی میں کچھ منفرد کرنے یا ہونے کا صدور ہوا ہے۔ چناں چہ اس انفرادیت نے ان کی آپ بیتیوں میں دلکشی اور دلچسپی کا ساماں پیدا کیا ہے۔

اکیسویں صدی کے ہنگامہ خیز دور کا پہلا عشرہ کشمیر میں ابلاغ کی اعلیٰ ضرورتوں کو پورا کرنے والی کسی عمدہ آپ بیتی کا حامل نہ ہے۔ ایسی آپ بیتی جو خود کو دریافت کرنے اور تاریخی شعور سے مالا مال ہونے کے بعد وجود میں آتی ہے۔ اکیسویں صدی ایک نئے دور اور زمانے کی خبر دیتی نظر آتی ہے۔ تمام زبانوں میں آپ بیتی کی تاریخ ہیجانی عہد اور بدلتے زمانے میں عمدہ مثالیں پیش کرتی ہیں۔ اس لیے کہ ایک عہد میں عادات، جذبات ختم ہو کر نئی عادات وجود میں آتی ہیں۔ جب معاشروں میں پرانی روایات دم توڑ رہی ہوں اور نئے حالات اور امکانات پیدا ہو رہے ہوں۔ جب انسانیت کی کشتی گرداب میں پھنسی ہو تو اسے

نکالنے کے لیے افراد پیدا ہوتے ہیں۔تاریکیوں کا دورنئی دنیاؤں کی دریافت پر انسانوں کو اکساتا ہے۔ایسے حالات میں انسان درونِ خانہ جھانکنے اور خود آگہی کی جانب راغب ہوتے ہیں۔ جنگ و جدل کے حالات،عقائد اور نظریات کے مابین تصادم، آمریت، جبر و استبداد اور نظریاتی کشمکش،خود شناسی اور احتساب نفس کی طرف مائل کرتے ہیں، جو کسی عمدہ آپ بیتی کا محرک ثابت ہوتا ہے۔لہٰذا اس صدی کے وسط تک منظر عام پر آنے والی کشمیری ادب کی آپ بیتیوں میں ایسی کسی کاوش کے وجود پذیر ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مستقبل

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سفر کے مجموعی مطالعے کے بعد مستقبل میں آپ بیتی اور آپ بیتی کی صنف پر ہونے والے تحقیقی اور علمی کام کے حوالے سے چند پہلو توجہ طلب ہیں۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کا سفر اگرچہ مختصر ہے، جس میں دیگر اصناف کی نسبت سرمایہ کم ہے، مگر دوسرے علاقوں کی نسبت یہ سرمایہ مقدار کے حوالے سے قابلِ لحاظ اور اہم ہے، جن میں بعض آپ بیتیاں نہایت اہم اور اُردو آپ بیتی کے مجموعی سرمائے میں عمدہ اضافہ ہیں۔کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے سرمائے میں یہاں کی ادبی شخصیات کے بجائے سیاسی رہنما، سرکاری ملازمین کی کاوشیں زیادہ نمایاں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر آپ بیتیوں میں تاریخی اور سیاسی حالات کا بیان زیادہ ہے۔موضوع کے حوالے سے ''تحریکِ آزادی کشمیر'' کشمیر کے آپ بیتی نگاروں کے ہاں مشترکہ موضوع کے طور پر موجود ہے۔یوں ان آپ بیتیوں کے باعث نہ صرف تحریکِ آزادی کشمیر کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں، بلکہ تاریخ کشمیر اور تہذیب و ثقافت کے رنگ بھی نمایاں ہوتے ہیں۔لیکن فنی اعتبار سے یہی پہلو ان آپ بیتیوں کی قدر و منزلت کم کرنے کا باعث ہے۔انکشاف ذات، اظہار ذات، داخلی کیفیات کے بجائے خارجی عناصر کے بیان میں یہی بے اعتدالی انھیں آپ بیتی کی صنف میں کسی بڑے کارنامے سے محروم کرتی ہے۔بہت سے آپ بیتیوں میں سفرنامے، رپورتاژ اور تاریخ وغیرہ کے عناصر کثرت سے موجود ہیں۔

اسلوب بیان کے اعتبار سے کشمیر میں اُردو آپ بیتیوں کی اکثریت انفرادیت کی مثال پیش نہیں کرتیں۔یہ آپ بیتیاں زیادہ تر واقعہ نگاری اور روداد نگاری کی سطح تک محدود ہیں۔البتہ ''شہاب نامہ''، ''وُلر کنارے''، ''بوئے گل نالہ دل دودِ چراغِ محفل''، ''رودادِ قفس'' اور ''تمنّا بے تاب'' اپنے خوب صورت اور منفرد اسلوب کے باعث اہم ہیں۔

کشمیر ایک منقسم ریاست ہے اور مشاہیر کشمیر ریاست سے باہر بھی مختلف ملکوں اور علاقوں میں آباد ہیں۔چناں چہ کشمیری روایت کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے ادب اور تحقیق و تنقید میں مختلف دھارے اور انداز پروان چڑھتے رہے ہیں۔زیرِ تحقیق موضوع صنف آپ بیتی کے ان مختلف رنگوں کو جوڑنے اور یکسانیت پیدا کرنے کے حوالے سے پیش رفت کا باعث ہے۔قومی یک جہتی آر پار کے ادب میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سہ سمتی انداز میں ہی کشمیری روایت

کے مختلف حوالوں پر کام کیا جائے۔

کشمیر میں اُردو آپ بیتی کے حوالے سے یہ امر توجہ طلب ہے کہ یہاں آپ بیتی میں بڑے ادیبوں، شعرا اور شخصیات نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے جس کی وجہ سے کسی بڑے فنی معجزے کی حامل آپ بیتی کا وجود نہ ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کوئی بڑی شخصیت، فکری اور فنی اعتبار سے بڑا لکھنے والا آپ بیتی کی صنف کی طرف توجہ دے گا۔

اکیسویں صدی میں بدلتے ہوئے حالات اور زندگی کی تیز رفتاری کے باعث آپ بیتی کی ضخامت کو بھی محدود رکھنا ضروری ہے۔ زندگی کی داستان میں روزمرہ کے معاملات سے لے کر جملہ واقعات کا بیان آپ بیتی کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ واقعات زندگی میں سے اہم کا انتخاب کرتے ہوئے آپ بیتی کو معتدل ضخامت میں مکمل کرنا بھی مستقبل میں آپ بیتی کی صنف کے فروغ کے لیے اہم ہے۔

کشمیری ادب کی مختلف اصناف میں آپ بیتی کے نقوش موجود ہیں۔ مستقبل کے محققین ان اصناف سے بہت سے مصنفین کی زندگیوں کے حالات وکوائف کو یکجا کر کے عمدہ آپ بیتیاں منظر عام پر لا سکتے ہیں۔ چناں چہ اس پہلو سے تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

آپ بیتیوں کا مطالعہ انسان کی شخصیت کے مختلف رنگ، حوالے اور انداز پیش کرتا ہے، جس میں نفسیات، فلسفہ اور دیگر علوم کے لیے وسیع مواد موجود ہے۔ انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل اس کی عظمتوں اور پستیوں کے احوال اور ان کے پیچھے کارفرما عناصر تحقیق کے حوالے سے اہم ہیں۔ کشمیر مشاہیر کی آپ بیتیوں کا اس حوالے سے مطالعہ اور جائزہ بھی ضروری ہے۔

کشمیر مشاہیر کی آپ بیتیوں کا ایک اہم موضوع تاریخ اور تحریکِ آزادی کشمیر ہے، جو ان آپ بیتیوں کا مشترک موضوع ہے۔ ان آپ بیتیوں میں موجود تاریخی لوازمے کی تحقیق اور تالیف سے کشمیر کی ایک مستند اور مربوط تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ چناں چہ ان آپ بیتیوں کے تاریخی لوازمے کی تہذیب اور ترتیب پر بھی تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

اقبال نے سفر کشمیر کے دوران نشاط باغ (سری نگر) میں ''ساقی نامہ'' کے آخری دس اشعار میں کشمیریوں کی حالتِ زار اور اُن کی خوئے غلامی پر سخت گرفت کی تھی۔

کشیری کہ بابندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگ مزارے
ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی ناشناسے ز خود شرمسارے

اور پھر آرزو کی تھی کہ

ازاں مے فشاں قطرہ مے بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

اس گرفت کے علاوہ اقبال کے کلام اور نثر میں کشمیر کی تہذیب، ثقافت اور تاریخ کے کئی رنگ بھی آشکارا ہوتے ہیں اور اُن کی آپ بیتی سے جڑے موضوعات بھی۔ چناں چہ کلام اور نثر اقبال سے اقبال کی ایک آپ بیتی مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ آپ بیتی نہ صرف اقبالیات کے حوالے سے اہم ہوگی بلکہ کشمیر کی تاریخ وتہذیب پر بھی دیرپا اثرات مرتب کرے گی۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔

تقسیم ہند کے بعد کی آپ بیتیوں کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ اقبال کی آرزو کسی حد تک پوری ہوئی ہے۔ کشمیری اپنے آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اپنی محنت کا صلہ اور آزادی مانگتے ہیں۔ غلامی کا طوق گردن سے اُتارنے کے لیے بے تاب ہیں۔ کشمیری دانش وروں کی آپ بیتیوں میں اپنے آپ کو بدلنے کی آرزو کا عکس نمایاں ہے، شیرازہ بندی ہو رہی ہے، یہ پہلو ہماری تحقیق کے مطابق آپ بیتیوں میں نمایاں ہے۔ مستقبل میں کشمیری آپ بیتی کی صنف نہ صرف بدلے ہوئے کشمیری کی ذات کا انکشاف کرے گی بلکہ ایک بدلی ہوئی ''جگ بیتی'' کا منظر بھی پیش کرے گی۔

حوالہ جات:

۱۔ ابوالکلام آزاد: تذکرہ۔لاہور:اسلامی اکادمی،۱۹۸۰ء،ص۴

۲۔ سیدعلی شاہ،ڈاکٹر: اُردو میں سوانح نگاری۔کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۱ء ص۶۶

۳۔ اُردو میں سوانح نگاری،ص۶۸

۴۔ ایضاً،ص۶۹

۵۔ فلیپ،رودادِقفس،جلداوّل

۶۔ اُردو میں سوانح نگاری،ص۷۹

۷۔ پاکستان میں اُردوادب کے پچاس سال،مرتب ڈاکٹرنوازش علی،راولپنڈی: گندھارا،۲۰۰۲ء ص۲۷۵

۸۔ ایضاً،ص۲۷۵

۹۔ مضامین سلیم احمد،مرتب، جمال پانی پتی،کراچی: اکادمی بازیافت،۲۰۰۹ء،ص۸۷۰

۱۰۔ اُردو میں سوانح نگاری،ص۲۷

کتابیات

بنیادی مآخذ: (آپ بیتیاں)

اکرم طاہر، پروفیسر: دعا کر چلے۔ میر پور، کاشر پبلشرز، ۲۰۰۶ء

امان اللہ خان: جہد مسلسل۔ راولپنڈی، ایس ایم کمبائنڈ، جلد اوّل ۱۹۹۲ء، جلد دوم ۲۰۰۵ء

بشیر احمد صدیقی: زندگی ہے یا کوئی طوفان، سہڑا آزاد کشمیر، مکتبہ شائع ادب، ۱۹۹۰ء

بشیر جعفری، سید: زندہ باد، پائندہ باد۔ باغ آزاد کشمیر: کشمیر سٹڈی لیگ، جلد اوّل ۲۰۰۳ء، جلد دوم ۲۰۰۴ء

ثریا خورشید: چناروں کے سائے۔ لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء

چودھری محمد یوسف: نقش برآب۔ میر پور، طاہر پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

حسن، مرزا، کرنل: شمشیر سے زنجیر تک۔ جلال گرافکس اینڈ کمپیوٹر، بارسوم، ۲۰۱۰ء

رشید امجد: تمنا بے تاب۔ اسلام آباد، پورب اکادمی، طبع دوم، ۲۰۰۷ء

رعنا راجوری: یادوں میں ڈھلتے لمحے۔ غیر مطبوعہ تصنیف، ۲۰۱۰ء

شملہ مفتی: چلمن سے چمن تک۔ خانیار سری نگر: ۱۹۹۸ء

شورش کاشمیری: بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل، لاہور، مطبوعات چٹان لمیٹڈ، ۱۹۷۲ء

صابر آفاقی، ڈاکٹر: نایاب ہیں ہم۔ غیر مطبوعہ، تصنیف، ۲۰۱۰ء

عبدالغفور، جسٹس: سفر مسلسل۔ میر پور آزاد کشمیر، ۲۰۰۹ء

عبدالقیوم، راجا: داستانِ عزم۔ لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۹ء

عبداللطیف انصاری: نقوش حیات۔ میر پور آزاد کشمیر، ۲۰۰۸ء

علی شان، چودھری: نقشِ علی شان۔ میر پور: نکس ایف ۲، ۲۰۱۱ء

علی گیلانی: وُلر کنارے۔ سری نگر: مکتبہ تحریک حریّت حیدر پورہ، ۲۰۱۱ء

علی گیلانی، سید: روداد قفس (دو جلدیں)۔ سری نگر، الہدیٰ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء

غلام عباس، چودھری: کشمکش۔ راولپنڈی، فیروز سنز، ۱۹۵۰ء

قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ۔ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

کرن سنگھ، ڈاکٹر: ولی عہد (ترجمہ غلام نبی شیدا)۔ سری نگر: گلشن پبلشرز گاؤ کدل ۱۹۸۴ء

کلیم اللہ: ریت پہ قدموں کے نشاں۔ لاہور شاہد پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء

لعل خان، چودھری: آواز حق۔ میر پور: انٹلی جنٹس پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

محمد ابراہیم، سردار: متاع زندگی۔ لاہور، کلاسیک، س، ن

محمد ایوب، سردار: تنگ آمد۔ مظفر آباد، ٹرینڈ سیٹ، ۱۹۹۸ء
محمد حیات خان: داستان حیات۔ راولپنڈی، ایف آئی پرنٹرز، ۲۰۰۹ء
محمد دین فوق: سرگزشت فوق۔ غیر مطبوعہ، ۱۹۴۲ء
محمد سعید، بخاری: رودادِ زنداں، ناشر مسعود الحسن بخاری۔ مظفر آباد: خورشید آرٹ پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۵ء
محمد سلیم: باغ شیری سے بریڈ فورڈ تک۔ گجرانوالہ: عمران جمیل پرنٹنگ پریس، سنہ ندارد
محمد شریف طارق: زندگی، جبر مسلسل۔ کاشر ایڈورٹائزر اینڈ پرنٹنگ پریس، اشاعت دوم، ۲۰۰۸ء
محمد صادق، چودھری: یادوں کی سوغات۔ میرپور نکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء
محمد عبداللہ، شیخ: آتش چنار۔ لاہور، چودھری اکیڈمی، ۱۹۸۴ء
محمد غوث چوہان: جموں کی یادیں۔ راولپنڈی: مطبوعاتِ کشمیر، ۲۰۰۴ء
محمد فضل شوق: مری یادیں۔ میرپور آزاد کشمیر، ۲۰۰۸ء
محمد یوسف، چودھری: کاروان یوسف۔ اسلام آباد، العمر پرنٹرز، ۱۹۹۷ء
محمود آزاد، سید: عمر رفتہ۔ غیر مطبوعہ سن تصنیف ۱۹۹۰ء
مقبول حمید، مسز: یادوں کے شیریں نقوش۔ راولاکوٹ، دھرتی پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
میر قاسم، سید: داستانِ حیات، مرتبہ عبدالرحمن کوندو۔ ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۸۵ء
یعقوب شاہق: عزیز عمر رفت۔ راولپنڈی: ارقم فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء
یعقوب ہاشمی: حاصل عمر رائیگاں۔ فیئر فین پرنٹرز، ۲۰۰۹ء

ثانوی مآخذ:

ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، جلد ششم۔ لاہور: ترجمان القرآن، طبع سیزدہم، ۱۹۸۲ء

اجمل نیازی، ڈاکٹر: فوق الکشمیر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء

احسان دانش: جہانِ دانش۔ لاہور: خزینہ علم وادب (دوم) ۲۰۰۲ء

احسان دانش: جہانِ دگر۔ لاہور: خزینہ علم وادب، ۲۰۰۱ء

احمد شجاع پاشا: مسئلہ کشمیر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء

ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر: اُردو فکشن کی تنقید۔ نئی دہلی: شعبہ اُردو دہلی یونی ورسٹی، اشاعت پاکستان ۱۹۹۷ء

ارجن دیو مجبور (مترجم) نیل مت پُران۔ سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۰۷ء

اشفاق احمد ورک: خودستائیاں۔ لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۵ء

افضل حق، چودھری: میرا افسانہ۔ لاہور، الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۳ء

الطاف فاطمہ: اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا۔ کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۰ء

انور سدید، ڈاکٹر: اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۳ء

انور سدید، ڈاکٹر: اُردو ادب میں سفر نامہ۔ لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، س ن

ایم اے خان، پروفیسر: کشمیر تاریخ کے آئینے میں۔ لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۱۱ء

بشیر حسین قریشی: قائد کشمیر۔ راولاکوٹ آزاد کشمیر: ناشر عمر قریشی، (چوتھا ایڈیشن) ۱۹۹۴ء

بیرن چارلز ہیوگل: سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب (ترجمہ محمد حسن صدیقی)۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء

پرویز پروازی، ڈاکٹر، پروفیسر: پس نوشت (اشاعت سوم)۔ لاہور: نیاز زمانہ پبلی کیشنز: ۲۰۱۰ء

پرویز پروازی، ڈاکٹر، پروفیسر: پس نوشت اور پس پس نوشت۔ لاہور: نیاز زمانہ پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ء

پریم ناتھ بزار: تاریخ جدوجہد آزادی کشمیر۔ لاہور، ناشر سیل فاروق، ۱۹۹۲ء

پنڈت کلہن: راج ترنگنی (مترجم ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ)۔ میر پور، ویری ناگ پبلی کیشنز، س، ن

ثریا خورشید: املتاس کے پیڑ۔ میر پور: ویری ناگ پبلشرز، ۱۹۸۶ء

ثریا خورشید: بانہال کے اُس پار۔ میر پور: ویری ناگ پبلشرز ۱۹۹۲

جان کاشمیری: سفر نامہ۔ لاہور: اکادمی پنجاب، ۱۹۸۳ء

جان محمد آزاد: جموں کشمیر کے اُردو مصنفین۔ سری نگر: جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۰۴ء

جمال پانی پتی (مرتب) مضامین سلیم احمد۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۹ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر: ادبی تحقیق۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر: پاکستانی کلچرل۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۸۳ء
جوش ملیح آبادی: یادوں کی برات۔لاہور: مکتبہ شعروادب،۱۹۷۵ء
جی ایم لون: آتش چنار۔میر پور آزاد کشمیر،۱۹۷۲ء
جی ایم میر: جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں (اشاعت پنجم)۔راولپنڈی: رائل پبلشنگ کمپنی،۲۰۱۱ء
جی ایم میر: کشور کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ۔میر پور، رضوان پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء
چراغ حسن حسرت: کشمیر۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،۲۰۰۳ء
چرن جیت لعل سہگل: داستان ہزار دن۔دریا گنج دہلی، روشن پبلی کیشنز، س،ن
حامد بیگ، مرزا: اُردو میں سفرنامے کی مختصر تاریخ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۷۸ء
حبیب کیفوی: کشمیر میں اردو۔لاہور، مرکزی اردو بورڈ،۱۹۷۹ء
حبیب کیفوی: میں اور میرا کشمیر۔لاہور: جنگ پبلشرز،۱۹۹۹ء
دیوان سنگھ مفتون: ناقابلِ فراموش۔لاہور: مکتبہ شعروادب،۱۹۵۷ء
ذکر شہاب: یادنامہ قدرت اللہ شہاب۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء
رشید امجد (مرتب): مزاحمتی ادب اُردو۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات،۱۹۹۵ء
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: اصناف ادب۔لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء
ژان ژاک روسو: اعترافات، مترجم، امجد علی بھٹی۔لاہور: بک ہوم ۲۰۰۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر: ادب اور لاشعور۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء
سلیم گردیزی، سید: غیر ملکی سیاحوں کی سیاحتِ کشمیر۔مظفرآباد: ہمالہ پبلی کیشنز،۲۰۰۷ء
سلیم گردیزی، سید: میں نے کشمیر جلتے دیکھا۔لاہور: مکتبہ جماعت (اشاعت دوم) ۲۰۱۲ء
شاہ علی، سید، ڈاکٹر: اُردو میں اصول سوانح نگاری۔کراچی: گلڈ پبلشنگ ہاؤس،۱۹۶۱ء
شفیق انجم، ڈاکٹر: اُردو افسانہ، بیسویں صدی کی تحریکوں کے تناظر میں۔اسلام آباد: پورب اکیڈمی،۲۰۱۰ء
شفیق انجم: مثنوی گلزار فقر، تدوین، متن اور لسانی جائزہ
شمس کاشمیری: سری نگر ۷۵ میل۔گوجرانوالہ: کاشر پبلی کیشنز،۱۹۸۴ء
صابر آفاقی، ڈاکٹر: سفر محبتوں کا۔لاہور: دسمبر ۲۰۰۸ء
طلاخان، سدوزئی، میجر: میرا سفرنامہ۔پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس،۱۹۷۱ء
طیب منیر، ڈاکٹر: چراغ حسن حسرت، احوال وآثار۔کراچی: ادارہ یادگار غالب،۲۰۰۳ء
ظفر حسین ظفر، ڈاکٹر: وادیٔ گل پوش میں۔لاہور: منشورات،۲۰۱۲ء

عابد علی عابد، سید: اسلوب۔ لاہور، انجمن ترقی اردو، طبع دوم ۱۹۹۶ء
عارف بہار: کشمیر تاریخ کے گرداب میں۔ کراچی: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۲۰۰۸ء
عارف سدوزئی: تاریخ سدھن قبائل۔ کراچی: سی ۳۱ مسرور
عبدالقادر سروری، پروفیسر: کشمیر میں اردو (تین حصے)۔ سری نگر، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۴ء
عبدالقیوم، سردار: کشمیر بنے گا پاکستان۔ لاہور: انفوٹیک پبلشرز، ۱۹۸۵ء
عبدالقیوم، سردار: مقدمہ کشمیر۔ لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۸۷ء
عبداللہ، سید: وجہی سے عبدالحق تک۔ لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
عبدالماجد دریابادی، مولانا: آپ بیتی۔ کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۹۶ء
علی گیلانی، سید: کشمیر نوائے حریت۔ اسلام آباد: انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، ۱۹۹۴ء
غازی محمد امیر: تاریخ جموں و کشمیر۔ راولپنڈی: ایس ٹی پرنٹرز، س ن
غلام احمد پنڈت، خواجہ: کشمیر آزادی کی دہلیز پر۔ لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۱ء
فتح محمد ملک، سردار، احمد پیرزادہ، تجمل شاہ (مرتبین): پاکستان میں اردو (پانچویں جلد، کشمیر)۔ اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء
فرمان فتح پوری: اردو نثر کا فنی ارتقا۔ لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
قراۃ العین حیدر: گلگشت۔ لاہور: مکتبہ اُردو لوہاری گیٹ، سنہ ندارد
کرشن چندر: میری یادوں کے چنار۔ لاہور: مکتبہ اُردو ادب، س ن
گیان چند، ڈاکٹر: تحقیق کا فن۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع سوم، ۲۰۰۷ء
محمد ابراہیم، سردار: کشمیر کی جنگ آزادی۔ راولاکوٹ، دھرتی پبلشرز، س، ن
محمد احمد اندرابی: مشاہیر کشمیر۔ میرپور: ویری ناگ پبلشرز، ۱۹۹۱ء
محمد اسحاق بھٹی: گزر گئی گزران۔ لاہور: نشریات، ۲۰۱۱ء
محمد اقبال، ڈاکٹر: کلیاتِ اقبال (اُردو)۔ لاہور: اقبال اکادمی، اشاعت دہم، ۲۰۱۰ء
محمد اقبال، ڈاکٹر: کلیاتِ اقبال (فارسی)۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، اشاعت ششم، ۱۹۹۴ء
محمد دین فوق: تواریخ اقوام کشمیر، جلد اوّل، دوم۔ میرپور، ویری ناگ پبلشرز، ۱۹۹۱ء
محمد رفیق بھٹی: دوستی کا سفر۔ میرپور: پیر پنجال پبلشرز، ۲۰۰۳ء
محمد رفیق بھٹی، پروفیسر: ایران صغیر سے ایران کبیر تک۔ میرپور: پیر پنجال پبلشرز، ۲۰۰۵ء
محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر، پروفیسر (مدیر): تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند جلد اوّل (۲۰۰۹ء)، دوم (۲۰۰۹ء)، سوم (۲۰۱۰ء)

چہارم (۲۰۱۰ء)۔لاہور: پنجاب یونی ورسٹی
محمد سرور، عباسی، ڈاکٹر: سیاسیاتِ کشمیر: سلیم باغ چمیاٹی آزاد کشمیر، ۲۰۰۶ء
محمد سعید، بخاری: جانباز کی میراث۔ مظفر آباد: الخضریٰ کمپیوٹرز، ۲۰۰۰ء
محمد صادق بریگیڈیئر (ر): یگانہ کشمیر۔ خان محمد خان میموریل ایسوسی ایشن، ۱۹۸۶ء
محمد کبیر خان: چاند چہرے۔ لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء
محمد کبیر خان: ہمہ یاراں دشت۔ لاہور، مطبوعات، ۱۹۸۷ء
محمد کبیر خان: پہاڑ لوگ۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۱۰ء
محمد لقمان چودھری: اور زمین پھٹ گئی۔ راولپنڈی: ایف آئی پرنٹرز، ۲۰۰۶ء
محمود آزاد، سید: تاریخ کشمیر۔ باغ، ادارہ معارف کشمیر، اوّل تا ہشتم، ۱۹۷۰ء۔۱۹۹۲ء
محمود آزاد، سید: تاریخ پونچھ۔ باغ، ادارہ معارف کشمیر، ۱۹۷۵ء
محمود شیرانی، حافظ: پنجاب میں اُردو (حصہ اوّل)۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، ۱۹۹۸ء
محمود ہاشمی: کشمیر اداس ہے۔ لاہور، الفیصل ناشران وتاجران کتب، باردوم، ۱۹۹۴ء
مختار خان: آزادی کا خواب پریشاں۔ راولاکوٹ، مسٹر بکس کچہری روڈ، ۲۰۰۵ء
مختار مسعود: آواز دوست (اٹھارہواں ایڈیشن)۔ لاہور: نقوش پریس، ۱۹۹۷ء
مختار مسعود: لوحِ ایام۔ لاہور: نقوش پریس، ۱۹۹۶ء
مشتاق احمد یوسفی: زرگزشت۔ کراچی: مکتبہ دانیال، اشاعت اوّل، ۱۹۷۶ء
مولانا جعفر تھانیسری: کالا پانی۔ فیصل آباد، طارق اکیڈمی (نقش پنجم)، اکتوبر ۱۹۹۹ء
مولوی میر عالم: تاریخ تحریک آزادی کشمیر۔ لاہور: گیلانی الیکٹرک پریس، ۱۹۴۸ء
موہن داس کرم چند گاندھی: آپ بیتی مہاتما گاندھی۔ لاہور: مکتبہ اُردو ادب، ۲۰۰۷ء
میکسم گورکی: گورکی کی آپ بیتی، ترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ کراچی: انجمن ترقی اُردو ۱۹۸۷ء
نذر بونیاری، راجا: یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں۔ بارہ مولہ کشمیر: ترکا نجن، ۲۰۰۸ء
نظیر صدیقی: شہرت کی خاطر (اشاعت دوم)۔ کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۹ء
نوازش علی، ڈاکٹر (مرتب)، معاونین یوسف حسن، احمد جاوید: پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال۔ راولپنڈی، ۱۳۰ گلنار کالونی، ۱۹۹۷ء
ہمایوں مرزا، سید: اردو میں خودنوشت سوانح حیات۔ لکھنؤ، نامی پریس، ۱۹۶۲ء

رسائل وجرائد:

''ارقم''، راولاکوٹ: دارارقم ماڈل کالج، شمارہ ۱، ۲۰۰۸ء، شمارہ ۲، ۲۰۱۰ء، شمارہ ۳، ۲۰۱۲ء

''الذبیر''، بہاولپور: خصوصی شمارہ، آپ بیتی نمبر، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

''آئینہ کشمیر''، محمد عبداللہ، قریشی (مدیر): لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء

''بازیافت''، سری نگر: جشن زریں نمبر، شعبہ اُردو یونی ورسٹی حضرت بل، ۲۰۰۷ء

''تحقیق''، آٹھواں، نواں شمارہ، شعبہ اُردو سندھ یونی ورسٹی، ۹۵۔۱۹۹۴ء

''تخلیقی ادب''، اسلام آباد: شمارہ چھے، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ۲۰۰۹ء

''تسلسل''، ششماہی مجلّہ توی: جلد اوّل شمارہ شعبہ اُردو جموں یونی ورسٹی، ۱۹۹۸ء

''خیاباں''، راولاکوٹ: گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، ۲۰۰۰ء

''دریافت''، تحقیقی مجلّہ۔ اسلام آباد: نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز

''سروش''، میرپور: گورنمنٹ کالج، شمارہ ۱، جلد ۲۲، ۲۰۰۶ء، شمارہ ۱، جلد ۲۵، ۲۰۱۰ء

''سیارہ ڈائجسٹ''، لاہور: ماہنامہ، کشمیر نمبر، جلد ۲۲، شمارہ ۳۰، ستمبر ۱۹۶۴ء

''شیرازہ'': اُردو ادب کے پچاس سال۔ سری نگر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچرل اینڈ لینگویجز، ۱۹۸۹ء

''شیرازہ''، سری نگر: جموں و کشمیر قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں، جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۰۴ء، جلد ۴۴، شمارہ ۴۔۸، جلد ۴۵، شمارہ ۸ تا ۱۱

''کتاب''، ماہنامہ، کشمیر نمبر: لاہور، منٹگمری روڈ، اکتوبر ۱۹۶۸ء

''ماہل''، باغ آزاد کشمیر: زلزلہ نمبر، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، ۲۰۰۷ء

''ماہنامہ سپوتنک''، لاہور، دسمبر ۲۰۰۸ء

''معیار''، اسلام آباد: بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، شمارہ ۶، ۲۰۱۱ء

''نصرت''، ہفت روزہ، کشمیر نمبر۔ لاہور فتح روڈ، شمارہ ۱۲، ۱۳، ۱۴، فروری ۱۹۶۰ء

''نقوش''، لاہور: آپ بیتی نمبر، ادارہ فروغ اُردو، (دو حصے) جون ۱۹۶۴ء

''نقوش''، لاہور: شخصیات نمبر، نقوش پریس اُردو بازار لاہور، (دو حصے) نومبر، ۱۹۵۷ء

مقالات:

اظہر قسیم، اردو ادب کی آپ بیتیاں: تحقیقی وتنقیدی جائزہ، مقالہ پی ایچ ڈی، اسلام آباد، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز

رانا محمد صفدر ادا، اردو آپ بیتی کی تاریخ (آغاز تا ۱۹۴۷ء): مقالہ ایم فل اردو، شعبہ اردو، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی

سلمان علی، اردو ادب آپ بیتیوں میں خرق عادات وواقعات: مقالہ پی ایچ ڈی، پشاور، پشاور یونی ورسٹی

محمد صغیر خان، کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اُردو ادب، کراچی یونی ورسٹی، کراچی

لغات:

فیروز اللغات، لاہور اُردو بازار

فرہنگِ آصفیہ، سید احمد دہلوی۔ لاہور: مکتبہ حسن

Lixicon Universal Encyclopedia Lexicon Publications, T.C New York

Oxford English Dictionary

Wikipedia Encyclopedia